رشید حسن خاں

کی

غالب شناسی

مرتب

ابراھیم افسر

RASHEED HASAN KHAN KI GHALIB SHANASI

Edited by:
Ibraheem Afsar
Ward No-1, Mehpa Chauraha ,Nagar
Panchayat Siwal khas ,Distt. Meerut (U.P)250501
+ 91 9897012528, 8077319637
Email-ibraheem.siwal@gmail.com

Year of Edition: 2020
ISBN:935406068-4
Price Rs:250/=

نام کتاب	:	رشید حسن خاں کی غالب شناسی
مرتب وناشر	:	ابراہیم افسر
سن اشاعت:	:	2020
قیمت	:	250روپئے
تعداد	:	400
ضخامت	:	336 صفحات

ملنے کے پتے:
1۔ابراہیم افسر، وارڈنمبر 1، مہپا چوراہا نگر پنچایت سِوال خاص، میرٹھ (یوپی)
2۔ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ، (یوپی)
3۔دانش محل، امین آباد، لکھنؤ (یوپی)
4۔کتابی دنیا، ترکمان گیٹ، نئی دہلی

اظہارِ مسرّت

تحقیق وتدوین کے حوالے سے رشید حسن خاں کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔موصوف نے اپنے ابتدائی ایام سے ہی اُردو املا، تحقیق، تدوین اور تنقید کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔اُردو املا، زبان وقواعدان کی ایسی کتابیں ہیں کہ جن کے مطالعے سے ہم بار بار مستفیض ہوتے ہیں۔کلاسیکی ادب کے متون کو نئے سرے سے ایڈٹ کرناان کا پسندیدہ شغل تھا۔خاں صاحب نے قیامِ دہلی کے دوران بہت سے کلاسیکی متون کو مرتب کیا۔ان کی تدوین کردہ کتابیں ہمارے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔ہندو پاک کی مختلف یونی ورسٹیوں کے نصاب میں ان کی تدوین شدہ کتابیں، باغ و بہار، فسانۂ عجائب، گلزارِ نسیم، مثنویاتِ شوق، زٹل نامہ، گذشتہ لکھنؤ وغیرہ کو شامل کیا گیا ہے۔ راقم الحروف نے 2019 میں چودھری چرن سنگھ یونی ورسٹی میرٹھ (یو۔پی) انڈیا سے ''رشید حسن خاں کی ادبی جہات'' عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھا۔دورانِ تحقیق احقر، خاں صاحب کی علمی، ادبی اور ذاتی شخصیت کو قریب سے سمجھنے کے لیے ان کے اہلِ خانہ سے ملاقات کے لیے کئی بار شاہ جہاں پور گیا۔

اپنی تحقیقی وتدوینی فتوحات کے سبب رشید حسن خاں جتنے ہندوستان میں مقبول تھے اس سے کہیں زیادہ وہ پاکستان میں مشہور تھے۔ان کی زیادہ تر کتابیں ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے توسط سے شائع ہوئیں۔پاکستان کے معروف ومشہور پبلیشر مقصود احمد کامران نے میری مرتب کردہ کتاب ''رشید حسن خاں کی غالب شناسی'' کو اپنے ادارہ ورلڈ ویو پبلشر سے شائع کرنے میں دل چسپی ظاہر کی ہے۔ مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ میری اس کتاب کی رسائی اب پاکستانی قارئین تک بہ آسانی ہو سکے گی۔ میں اپنی کتاب کی پاکستانی اشاعت کے لیے ورلڈ ویو پبلشرز کے ڈائریکٹر مقصود احمد کامران صاحب کا شکر گزار ہوں اور انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ابراهیم افسر

نگر پنچایت سِوال خاص ضلع میرٹھ (اترپردیش) انڈیا

بتاریخ:16 جون 2021

انتساب

مشفق خواجہ (مرحوم)
کے نام

''ایک تجویز ذہن میں آئی ہے۔ خدا کرے آپ اتفاق کریں۔ غالب پر آپ نے جتنے مقالے لکھے ہیں، کیوں نہ انھیں ایک مجموعے کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ اسی مجموعے میں دستنبو کا ترجمہ بھی شامل کر دیا جائے۔''

آپ کا
مشفق خواجہ

27/06/2001

فہرست

OO

مقدمہ

نابغۂ روزگار شخصیت رشید حسن خاں (25دسمبر 1925-26فروری 2006) کی شناخت اُردو ادب میں بہ حیثیت محقق، مدوّن، نقّاد، ماہرِ املا، زبان وقواعد کے رمز شناس، مترجم اور مبصر مسلّم ہے۔ان تمام خوبیوں کے باوصف تصویر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ شاعر تو نہ تھے لیکن شعروشاعری سے اُتنا ہی شغف رکھتے تھے جتنا تحقیق، تدوین اور تنقید کے پیچ وخم سے۔اپنے ابتدائی زمانے (آرڈیننس کلودینگ فیکٹری، شاہ جہاں پور اور رسالہ ندرت، بریلی میں کام کرتے ہوئے) بالخصوص ایامِ عنفوانِ شباب میں خاں صاحب شاعری سے خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔شاہ جہاں پور اوراس کے اطراف میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں موصوف کی شرکت ان کے شعری ذوق کے تئیں والہانہ شغف اور شاعری کی افہام وتفہیم سے واقفیت کے واضح اشارات ہیں۔شعروشاعری کی افادیت واہمیت ان کے نزدیک اعلا مقام ومرتبہ رکھتی تھی۔

رشید حسن خاں نے 1950 کے بعد اُردو کے مشہور ومعروف شاعروں کا کلام ڈائری میں لکھنا شروع کیا تھا۔یہ ڈائری ان کے دیرینہ دوست ربابؔ رشیدی کے پاس محفوظ تھی جسے انھوں نے ڈاکٹر ٹی.آر.رینا کو دے دیا۔اُمید ہے کہ یہ بیاض ان کے شعری ذوق کو سمجھنے میں ہماری مدد کرے گی۔

اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول، شاہ جہاں پور میں ملازمت کے دوران بھی موصوف شعروشاعری میں دل چسپی رکھتے تھے۔اسکول سے واپسی کے دوران خاں صاحب شوقین بک ڈپو، شاہ جہاں پور سے کتابیں مطالعے کے لیے لے جاتے اور اگلے دن اسکول جاتے ہوئے واپس کرتے تھے۔اس طرح ان کا ادبی شوق نہ صرف پروان چڑھا بل کہ ان کے ذوقِ مطالعہ میں وسعت پیدا ہوئی۔ان کے ادبی ذوق وشوق کو مزید تقویت بخشنے میں اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول، شاہ جہاں پور کی لائبریری بہت

معاون و مددگار ثابت ہوئی۔ان کے شاعری کی جانب متوجہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے وطن شاہ جہاں پور میں اُس زمانے میں شاعری کا غلغلہ تھا۔شاعری کے حوالے سے اس علاقے کی اپنی منفرد ادبی شناخت اور پہچان تھی،جس کا وقار وافتخار آج بھی قائم ہے۔اس خطۂ ارض پر باکمال ادیبوں اور شاعروں نے اپنے فن کے جوہر دکھائے،جس کا اعتراف ادبی دُنیا نے بھی کیا۔شاہ جہاں پور کی ادبی روایت کو یاد کرتے ہوئے رشید حسن خاں نے ایک خط اختؔر شاہ جہاں پوری کے نام 23 مئی 1983 کو تحریر کیا۔اس خط میں یادِ ماضی کے سنہرے اوراق کو پلٹتے ہوئے رشید حسن خاں نے لکھا:

''مجھے یہ معلوم کر کے واقعتاً بہت مسرّت ہوئی کہ آرمی کلودنگ فیکٹری شاہ جہاں پور سے ایک ادبی رسالے کا اجرا ہوگا،جس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوگی کہ اُس میں ہندی اور اُردو دونوں زبانوں کی ادبی تخلیقات کو شامل کیا جائے گا۔

ماضی میں یہ شہر علاقۂ روہیل کھنڈ میں اعلا ادبی،علمی اور شعری روایتوں کا مرکز رہا ہے۔عربی کے عالمِ متبحّر مولانا بحرالعلوم فرنگی محلی جب لکھنؤ سے ترکِ وطن پر مجبور ہوئے تھے،تو اسی شہر میں تقریباً اٹھارہ سال تک اُن کا قیام رہا تھا اور اُن کے یمنِ قدم سے عربی کی تعلیم کو یہاں بے مثال فروغ ملا تھا۔ہندوستان میں دورِ آخر کے جلیل القدر اساتذہ جلاؔل لکھنوی،امیؔر مینائی اور داؔغ دہلوی تھے اور اِن اساتذہ کے ایسے باکمال شاگرد یہاں موجود تھے جو خود درجۂ اُستادی پر فائز تھے اور جن کے دم سے شعری محفلوں کے ہنگامے فروغ پاتے تھے۔یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس شہر میں دہلی اور لکھنؤ کی ادبی روایتوں نے ایک ایسا قالب اختیار کر لیا تھا جس میں ایک خاص طرح کا توازن تھا۔یہاں لکھنؤ کی زبان کا لطف تھا،اُس کی شعری روایت کا ابتذال نہیں تھا۔اور دہلی کی جذبات سے معمور داخلیت کا اثر تھا،لیکن اُس حُسنِ بیان کے ساتھ جس کو دبستانِ لکھنؤ کا امتیازی نشان بنایا جاتا ہے۔نوّاب ناظم علی خاں ہجؔر،محمد علی میاں خیاؔل،حسین احمد میاں بیباکؔ،حجاؔب صاحبہ،اعتبارالملک حکیم فخر حسن خاں عادؔل اور اُن کے تلمیذِ خاص عابد حسین عابؔد (مرحوم)،اسعؔد صاحب،کوکبؔ اور پیارے میاں رشید جیسے شعرا

کے دم سے یہاں کی غزل گوئی کو امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ جناب جگدیش سہائے سکسینہ اِس پایے کے نظم نگار تھے کہ اب اس پورے علاقے میں اُن جیسا قادرالکلام اور باکمال نظر نہیں آتا۔

یہ تو ہمارے زمانے کی اور ماضی قریب کی بات تھی، اِن لوگوں سے پہلے نواب غلام حسین خاں حسیںؔ اور لالہ عوض رائے مُسرّتؔ پایے کے شاعر تھے کہ اُن کے نہایت باکمال معاصرینِ ہندوستان اُن کے کمال کو تسلیم کرتے تھے۔ مُسرّت کا یہ شعر تو ادبی حلقوں میں ضربُ المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے:

بوقتِ لقمہ خوردن اے مسرتؔ گفت لبہایم
کہ روزی می کند از ہم جدا یارانِ ہمدم را

آج بھی نوجوانوں کا ایک قابلِ ذکر حلقہ اُس شعری اور ادبی روایت کو زندہ رکھّے ہوئے ہے اور خاص بات یہ ہے کہ نثر کی طرف بھی توجہ کی جا رہی ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ اس ادبی رسالے کی مدد سے یہاں کی شعری اور ادبی روایتوں کو مزید فروغ حاصل ہوگا اور اس رسالے کو ہر مکتبۂ خیال سے تعلق رکھنے والوں کا تعاون حاصل رہے گا۔ عزیزی آثر شاہ جہاں پوری سنجیدہ اور ہونہار نوجوان ہیں، اور مجھے توقع ہے کہ وہ اِس بارِ امانت کا حق ادا کر سکیں گے۔ ہاں، ماضیِ قریب میں اِس فیکٹری سے میرا قریب کا تعلق رہا ہے اور اِس نسبت سے مجھے اِس رسالے کے اجرا کی اور زیادہ مسرّت ہے۔''

(رشید حسن خاں کے خطوط، مرتب ڈاکٹر ٹی. آر. رینا، جلد دوم، نومبر 2015، ص 66 تا 67)

رشید حسن خاں نے اپنے ادبی دوستوں کے نام جتنے بھی خطوط ارسال کیے اُن میں زیادہ تر ادبی گفت وشنید ہے۔ اگر خط کسی شاعر کے نام رقم کیا گیا تو اُس میں لازمی طور پر شاعرانہ اسلوب، بحر و وزن کی باتوں کے علاوہ ادبی مباحثے ہوتے تھے۔ رشید حسن خاں، خطوط میں اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے مختلف اشعار کی مثال دے کر وزن دار بناتے تھے۔ اُردو زبان وادب پر کس شعر کا اثر زیادہ پڑا اور اس کی ادبی حیثیت کیا ہے؟ پر بھی گفتگو ہوتی تھی۔ رشید حسن خاں کو بہت سے شعرا کا کلام زبانی یاد

تھا۔ جب کبھی دوستوں کے ساتھ ادبی محفل جمتی تو خاں صاحب اشعار سنا کر سبھی کو محظوظ کرتے۔ ان کے خطوط کا گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے سے مذکورہ باتوں کی تصدیق ہو جائے گی۔ موصوف کے کتنے ہی خطوط کی سطور میں شاعری کے رموز و اسرار پر سیر حاصل گفتگو موجود ہے۔ اب تک رشید حسن خاں کے 1764 خطوط سے زائد منظرِ عام پر آ چکے ہیں اور باقی خطوط کو بھی منظرِ عام پر لانے کا کام جاری و ساری ہے۔

رشید حسن خاں دہلی یونی ورسٹی کے گائر ہال، ٹیچر کورٹ 9 میں فرصت کے لمحات میں ریڈیو پر غزلوں کا پروگرام ضرور سنتے تھے۔ شاعری سننے سے انھیں ذہنی سکون ملتا تھا۔ یہی معمول ان کا دہلی سے جانے کے بعد شاہ جہاں پور میں بھی یہ دستور جاری رہا۔ مرحوم رشید حسن خاں کے ٹیبل پر (شاہ جہاں پور) آج بھی MURFYCOMPANY کا ریڈیو رکھا ہوا ہے۔ رات کو سونے سے قبل بی. بی سی لندن، اُردو سروس پر خبریں سننے کے علاوہ موسیقی اور شاعری سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ان کے مراسم اپنے معاصر شعرا سے تھے۔ ان سے اکثر تحقیقی، تدوینی اور تنقیدی باتوں کے علاوہ شاعری کے فن، عروض اور سمت و رفتار پر باتیں ہوتی تھیں۔ ان کے بیش تر ابتدائی تنقیدی مضامین اُردو شعرا کے کلام کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے علاوہ رشید حسن خاں شاعری بالخصوص غزل کے مستقبل کو لے کر خاصے فکر مند رہتے تھے۔ ان کی نظر میں غزل اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں جذبات کے اظہار کا سب سے کامیاب وسیلہ رہی ہے۔ غزل کی اشاریت کی بدولت نفسِ واقعہ کی تلخی خوش گوار ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اور یہ وصف کسی دوسری صنفِ سخن میں مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ رشید حسن خاں شاعری اور غزل کے کتنے بڑے دلدادہ اور مداح تھے، اس کا ثبوت ہمیں رسالہ ''تحریک''، نئی دہلی، فروری 1964 کے شمارے سے ملتا ہے۔ جس میں ''غزل کا مستقبل، ایک بحث'' کے تحت گوپی ناتھ امن، علی جواد زیدی، نکہت فرید احمد، رشید حسن خاں، گوپال متّل، حسن نعم، محسن زیدی، بلراج کومل، کمار پاشی اور مخمور سعیدی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان تمام ادبی شخصیتوں نے ایک آواز میں شاعری اور اُردو کی بقا کے لیے غزل کی پُر زور حمایت کی۔ رشید حسن خاں نے اس تحریری غزلیہ مباحثے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

''یہ سوال کہ کیا غزل میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ مستقبل میں بھی ماضی کی طرح

جذبات واحساسات کے اظہار کا ایک مقبول ذریعہ بنی رہے، انسانی مزاج کی بعض بنیادی خصوصیتوں کی طرف توجہ مبذول کر دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک انسانی مزاج کی یہ خصوصیات باقی ہیں، غزل بھی باقی رہے گی۔ یہ خیال بالکل درست ہے کہ غزل پوری شاعری نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سے کسی دور میں بھی انکار نہیں کیا گیا۔ ماضی کے شعری سرمائے میں غزل کے ساتھ ساتھ بے شمار قصیدے، قطعات اور رباعیاں بھی شامل ہیں۔ یہ اصناف ان تمام شاعروں کے کلیات میں موجود ہیں جو غزل کے مسلم الثبوت اُستاد سمجھے گئے ہیں۔ گویا غزل دوسری اصنافِ سخن کی طرف متوجہ ہونے میں کبھی حائل نہیں ہوئی۔ غزل کی ایک اور قابل قدر خصوصیت جس میں اور کوئی صنف اس کی شریک نہیں یہ بھی ہے کہ اس کی علاقائی زبان، بدلے ہوئے احساسات کے ساتھ ساتھ اپنا مفہوم بھی تبدیل کر لیتی ہے۔ بعض لوگ غزل پر پریشان نگاری کا الزام لگا کر اسے ہدف ملامت بناتے ہیں اور اس کی صحت و اصلاح کے لیے مسلسل نسخہ تجویز کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسی بات وہی لوگ کہ سکتے ہیں جن کی نظر سطحی اور ذہن کوتاہ ہو۔ مختلف لمحوں کے مختلف احساسات کی ترجمانی اس مفرد خیال نگاری کے ذریعے ہی ممکن ہے جو غزل کا خاصہ ہے۔''

(رسالہ تحریک، نئی دہلی، فروری 1964، جلد 11، نمبر 11، ص 29)

رشید حسن خاں اپنی زندگی میں کلامِ اقبال کی تدوین کے ساتھ ساتھ انیسؔ، نظیرؔ اور غالبؔ کے کلام کے معنی، مطالب اور فرہنگ پر بھی کام کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے غالبؔ کے کلام کی شرح اور فرہنگ سے متعلق ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' نامی کتاب کو منظرِ عام پر لانے کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا۔ انھوں نے گنجینۂ معنی کا طلسم کے نوٹس 1960 کے بعد تیار کرنا شروع کر دیے تھے۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی نے اسے شائع کرنے کا منصوبہ بھی بنا رکھا تھا لیکن رشید حسن خاں کلام غالبؔ کی فرہنگ کی اشاعت کا ارادہ لیے اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ انھوں نے اس ادبی کارکردگی اور کاوش کے لیے اپنے رفیقوں سے مراسلت کر کے مشورے بھی طلب کیے تھے۔ غالب اَنسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

نے انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی کے اشتراک سے 'گنجینۂ معنی کا طلسم' کی تین جلدیں 2017، 2018 اور 2019 میں شائع کی ہیں۔ڈاکٹر اطہر فاروقی (جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی) کی اجازت سے پاکستان میں مجلس ترقی اُردو، لاہور نے، ڈاکٹر تحسین فراقی کے 'حرفے چند' کے ساتھ ان تینوں جلدوں کو یک جا کر 2019 میں شائع کیا ہے۔

غالبؔ سے متعلق رشید حسن خاں نے جن کتابوں پر مقدمہ، پیش لفظ اور ابتدائیہ کے طور پر اپنی آرا کا اظہار کیا ان میں غالبؔ اور انقلاب ستاون (پیش لفظ 4 صفحات) انشاے غالبؔ (عرض مرتب 21 صفحات) اِملاے غالبؔ (ابتدائیہ 20 صفحات) گنجینۂ معنی کا طلسم (مقدمہ 23 صفحات) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔انشاے غالبؔ میں، غالبؔ کی خوش خطی، املا اور املا کے طریقۂ کار پر تنقیدی بحث کی ہے۔کتاب کے آخر میں غالبؔ کی تحریر کے عکس، نمونے کے طور پر دیے گیے ہیں۔اِملاے غالبؔ دو حصوں میں تقسیم ہے۔پہلے حصے میں الفاظ سے متعلق بہت سی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔یعنی غالبؔ نے کن لفظوں کو ترک کیا اور کن لفظوں کو اپنی تحریر میں استعمال کیا، کا مکمل گوشوارہ شاعری اور خطوط کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔دوسرے حصے میں قاعدے کی بحث ہے۔اس کے بعد غالبؔ کے املاے فارسی پر بھی رشید حسن خاں نے قاری کے سامنے دل چسپ باتیں رکھی ہیں۔اس کے علاوہ موصوف نے غالبؔ کی فارسی کتاب ''دستنبو'' کا اُردو میں ترجمہ کیا۔اس ترجمہ کو ناقدین اور ماہرِ غالبیات نے غالبؔ کی اصل کتاب کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔کئی ناقدین نے تو اس ترجمہ کو دستنبو کے دوسرے اُردو تراجم کے مقابل اعلا درجے کا ترجمہ تسلیم کیا ہے۔یہ ترجمہ رسالہ ''اُردوے معلّیٰ دہلی، جلد 2، شمارہ 3-2 فروری 1961 میں صفحہ 177 تا 232 تک شائع ہوا تھا''۔پاکستان میں یہ ترجمہ رسالہ ''افکار'' کراچی کے غالبؔ نمبر میں بھی شائع ہوا۔رشید حسن خاں کی اس گراں بہا ادبی خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر شریف حسین قاسمی (شعبۂ فارسی دہلی یونی ورسٹی، دہلی) نے ''دستنبو'' کے اپنے اُردو ترجمے کے مقدمے میں لکھا:

> ''ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن صاحب پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج لاہور نے ''غالبؔ اور انقلاب ستاون'' پاکستان سے پہلی بار 1974 میں شائع کی۔یہ بعض ضروری ترمیموں اور اضافوں کے ساتھ 1976 میں لاہور سے دوبارہ

شائع ہوئی۔ان دونوں اشاعتوں میں دستنبو کا رشید حسن خاں صاحب کا اُردو ترجمہ شامل ہے۔1988 میں غالبؔ انسٹی ٹیوٹ نے ''غالبؔ اور انقلاب ستاون'' کی دوسری اشاعت کو اس اضافے کے ساتھ شائع کیا کہ اس میں دستنبو کے اس مطبوعہ متن کا عکس بھی شامل کر دیا جو سب سے پہلے غالبؔ کی اپنی کڑی نگرانی میں آگرہ سے 1858 میں شائع ہوا تھا۔''

(دستنبو، ترجمہ، پروفیسر شریف حسین قاسمی، غالبؔ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2007، ص د ذ)

پروفیسر شریف حسین قاسمی نے اپنے مقدمے کے آخر میں رشید حسن خاں کے اُردو ترجمے کے اہمیت، افادیت اور معنویت کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے تحریر کیا:

''دستنبو کا اُردو میں کئی بار ترجمہ ہوا ہے۔ان میں سے دو تراجم راقم کے پیشِ نظر رہے۔رشید حسن خاں صاحب کا ترجمہ زیادہ مکمل اور اصل سے قریب تر ہے۔اس میں دستنبو کے مطالب کی بہتر افہام وتفہیم کے لیے اُردو الفاظ و عبارت میں ردوبدل کی گنجایش تھی۔''

(دستنبو، مقدمہ، پروفیسر شریف حسین قاسمی، غالبؔ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2007، ص ک ذ)

57 صفحات پر مشتمل ''دستنبو'' کا اُردو ترجمہ رشید حسن خاں نے 'رستخیز بے جا' 1274ھ-1857 کے عنوان سے کیا ہے۔موصوف نے ''غالبؔ اور انقلابِ ستاون'' کے پیش لفظ میں اس کتاب یعنی 'دستنبو' کی اہمیت، افادیت، علمیت اور قطعیت بالخصوص انقلاب 1857 کو سمجھنے کے بارے میں تحریر کیا:

''پاکستان کے اہلِ قلم میں ڈاکٹر معین الرحمٰن متعارف شخصیت کے مالک ہیں۔ اُن کی کتاب غالبؔ اور انقلابِ ستاون دو بار شائع ہو کر اہلِ نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔اس کتاب میں معین صاحب نے یہ بڑا کام کیا ہے کہ 1857 سے متعلق غالبؔ کی تحریروں کے ضروری اجزا کو یک جا کر دیا ہے اور اس طرح اس واقعے سے متعلق غالبؔ کے طرزِ عمل اور اندازِ فکر کے مختلف گوشے نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ بلا تکلف یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اپنے انداز کی یہ منفرد کتاب ہے۔اس کتاب میں مرزا صاحب کی معروف فارسی تصنیف

دستنبو کا اُردو ترجمہ بھی شامل کیا گیا تھا بل کہ صحیح طور پر یوں کہیے کے دستنبو کے
مطالب و مقاصد کو واضح کرنے کے لیے ہی معین صاحب نے اس کتاب کو
مرتب کیا تھا۔(دستنبو کا فارسی متن اس کتاب میں شامل نہیں کیا گیا تھا)اس
کتاب کے مشتملات کی افادیت کے پیشِ نظر غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کی پبلی کیشن
کمیٹی نے یہ طے کیا تھا کہ اس کتاب کو انسٹی ٹیوٹ کے سلسلۂ مطبوعات کے
تحت شائع کیا جائے۔ مجھے مسرّت ہے کہ میری درخواست پر مصنف نے بہ خوشی
اس کی اجازت دے دی اور اور کتاب میں بعض ضروری ترمیمیں بھی کر دیں۔‘‘
(غالبؔ اور انقلابِ ستاون، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، غالبؔ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2007، ص3)
’’غالبؔ اور انقلابِ ستاون‘‘ کتاب کے مصنف ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے رشید حسن خاں کی علم
دوستی کا اعتراف اور غالبؔ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ’حرفِ چند‘ کے تحت اپنے
خیالات کا اظہار ان لفاظ میں کیا:

’’یہ کتاب پہلی پہلی بار 1974 میں چھپی تھی۔اس کا دوسرا اڈیشن نئے ماٰخذ کی
روشنی میں ترمیم اور اضافے کے بعد 1976 میں لاہور سے شائع ہوا۔اب
اشاعتِ ثانی پر مبنی، دس برس بعد یہ کتاب غالبؔ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے زیرِ
اہتمام شائع ہو رہی ہے، اس قیمتی اور بنیادی اضافے کے ساتھ کہ ’’دستنبو‘‘ کا
فارسی متن بھی (عکسی صورت میں) اس کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔یقین
ہے کہ کتاب بصورت موجودہ زیادہ نافع ہوگی اور پڑھنے والوں کے ایک نئے
اور بڑے حلقے تک پہنچے گی۔غالب انسٹی ٹیوٹ نے کتاب کو اپنے اشاعتی
منصوبے کے لیے منتخب کیا اس عزّت افزائی کے لیے میں غالب انسٹی ٹیوٹ
کے ارکان کا بہ دل ممنون ہوں۔طباعت کے مختلف مراحل کی نگرانی مجھ دور اُفتادہ
کے لیے ممکن نہ تھی، اس کارِ دُشوار کو از رہِ لطف رشید حسن خاں صاحب نے
میرے لیے آسان بنایا۔کیوں کر شکر ادا کیجیے اس لطفِ خاص کا!‘‘ (ایضاً، ص9)

رشید حسن خاں نے ’’دیوانِ غالبؔ، غالبؔ صدی اڈیشن 1969، مرتب مالک رام، پر بھی ایک پُر مغز

مقالہ اپنی تحقیقی کتاب ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' میں شامل کیا۔ یہ مضمون ''اُردو تحقیق اور مالک رام'' از شاہد اعظمی 1975 اور رسالہ ''تحریک کے غالبؔ نمبر، اپریل 1976 میں بھی شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد مالک رام اور خاں صاحب کے تعلقات کافی حد تک متاثر رہے۔ رشید حسن خاں نے مالک رام کی اُس بات کی گرفت کی جس میں اُنھوں نے یہ دعوا کیا تھا کہ'' غالبؔ صدی اڈیشن '' کی بنیاد حیدرآباد کی آصفیہ لائبریری میں موجود مرزا غالبؔ کے ہاتھ سے تصحیح کردہ نسخے پر رکھی گئی ہے۔ رشید حسن خاں کی تحقیق کے مطابق حیدرآباد کی آصفیہ لائبریری میں ایسا کوئی نسخہ موجود نہیں تھا جس کا دعوا مالک رام نے غالب صدی اڈیشن کے مقدمے میں کیا ہے۔ اپنے مقالے میں رشید حسن خاں نے غالبؔ صدی اڈیشن اور کلامِ غالبؔ کا موازنہ کرتے ہوئے کتنے ہی اشعار میں تحریفات اور ترمیمات کی نشان دہی کی۔ موصوف نے ان ترمیم شدہ اشعار کو غالبؔ کے اصل اشعار اور متن سے چھیڑ چھاڑ قرار دیا۔ خاں صاحب دیوانِ غالبؔ صدی اڈیشن کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اس زمانے میں، قابلِ ذکر حضرات میں سے مخدومی عرشی صاحب اور محترمی مالک رام صاحب نے غالبؔ کے اُردو دیوان کو مرتب کیا ہے۔ مالک رام صاحب نے نسخۂ نظامی کو متن کی بنیاد بنایا ہے اس لیے کہ ان کی راے میں مطبع نظامی کان پور کا چھپا ہوا دیوان، غالبؔ کے اُردو کلام کا آخری مستند اڈیشن ہے، اور اب اسے متن کی بنیاد بنایا جانا چاہیے۔ کیوں کہ جب غالبؔ نے مطبع احمدی کا متن دیکھ کر اور اسے درست کر کے، دیوان مطبع نظامی میں چھپوایا، تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ انھوں نے متن ہمیشہ کے لیے خود طے کر دیا۔ اب اس سے پہلے کے اڈیشنوں کو، ہم نہ صرف متن میں استعمال نہیں کر سکتے بل کہ وہ شاید اختلافِ نسخ کے تحت بھی نہیں آئیں گے۔ (مقدمہ، دیوانِ غالبؔ، آزاد کتاب گھر، دہلی، ص31)

اس کے برخلاف، عرشؔی صاحب نے مطبع نظامی والے اڈیشن کو آخری مستند اڈیشن کا درجہ نہیں دیا۔ اس کے بجائے انھوں نے متعدد خطی اور مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھا ہے۔ گویا صرف مالک رام صاحب، مطبع نظامی کے نسخے کو درست

ترین اور مستند ترین مانتے ہیں اور اس اعتبار کی وجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ مطبع نظامی کا چھاپا، اس نسخے پر مبنی ہے جس کی تصحیح غالبؔ نے ''دورات دن کی محنت میں'' کی تھی، جس کے آخری صفحے کے حاشیے پر اپنے ہاتھ سے خط لکھا تھا، اور جو اتفاق سے حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ مگر یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اس اہمیت کے باوجود، اس نسخے کا مفصل تعارف نہیں کرایا گیا۔ مالک رام صاحب کی تحریر سے قطعیت کے ساتھ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ موصوف نے اس نسخے کو بہ چشم خود دیکھا ہے یا کسی روایت پر بھروسا کیا ہے۔''

(رسالہ تحریک، دہلی، غالبؔ نمبر، اپریل 1976، ص25 تا26)

رشید حسن خاں، ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتب کردہ ''غالب کے خطوط'' کی اشاعت سے بہت خوش تھے۔ ان کی نظر میں یہ عظیم ادبی کارنامہ تھا جسے دیکھ کر بقول خاں صاحب ''جی خوش ہو جاتا ہے اور آنکھوں کی روشنی بڑھ جاتی ہے''۔ انھوں نے غالب کے خطوط مرتب خلیق انجم کے بارے میں مزید لکھا کہ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات لکھ رہا ہوں کہ خلیق انجم صاحب نے بہت ہی دل لگا کر اور نظر جما کر اس کام کو انجام دیا ہے۔ انھوں نے بہت صبر و تحمل کے ساتھ کئی سال صرف کیے متن کی تصحیح پر اور بہت سا وقت خرچ کیا متن سے متعلق حواشی لکھنے پر، انھوں نے ضروری مصادر اور ماخذ کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

رشید حسن خاں نے اپنے مضمون ''غالب کے سلسلے میں تحقیق کے نئے امکانات'' (اشاعت ششماہی، غالب نامہ، جنوری 1981) میں غالب اور ان کی نثر نگاری کے تحفظ کی جانب اُردو ادیبوں کی توجہ مبذول کرائی۔ اس مضمون میں انھوں نے اس بات پر افسوس اور حیرت کا اظہار کیا کہ سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ غالبؔ کے مکمل کلام کو تدوین کے اصولوں کی مکمل پابندی اور مفصل حواشی اور ضمیموں کے ساتھ ایک سلسلے میں شائع کیا جائے۔ رشید حسن خاں کے نزدیک غالب کی زندگی کے حالات، اُن کی شخصیت، اُن کا عہد اور اُن کا اسلوب یہ چار اہم باب ہیں جن کے لیے ابھی اُردو تحقیق کو بہت سے کارہائے نمایاں انجام دینے ہیں۔ ان تمام پہلوؤں کے مدِّ نظر رشید حسن خاں اس بارے میں بھی فکر مند تھے کہ غالبؔ جیسے عظیم شاعر کی سو سالہ تقریبات منانے کے بعد بھی اصولِ تدوین کے مطابق ایک عدد تنقیدی نسخہ منظرِ عام پر نہ آ سکا۔ اس بارے میں خود ان کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے اور اندازہ لگائیے کہ ان

کے دل میں کلامِ غالبؔ کے اعلا تنقیدی اڈیشن کے لیے کتنا درد پنہاں تھا:

''یہ عجیب بات ہے کہ ہم جشنِ یادگار تو اس دھوم دھام سے مناتے ہیں کہ عاشق کے جنازے کا سماں سامنے آجاتا ہے، لیکن اُس شخص کی تحریروں کو، جن پر شہرت اور عظمت کا مدار ہے، سلیقے کے ساتھ اور خالص علمی ڈھنگ سے ایک سلسلے میں شائع کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ غالبؔ کی سو سالہ یادگار منائی گئی اور خوب منائی گئی لیکن غالبؔ کی سب کتابوں کو ایک سلسلے میں اصولِ تدوین کی پابندی کے ساتھ چھاپنے کی توفیق نہیں ہوئی، یعنی جو کام سب سے پہلے کرنے کا تھا اُسی کو نظر انداز کر دیا۔ غالبؔ کی تخصیص نہیں یہ ہمارا عام انداز ہے۔ امیر خسروؔ کی یادگار منائی لیکن امیر خسروؔ کی کتابیں نہیں چھاپیں۔ محمد علی جوہرؔ کی یادگار منائی لیکن اُن کا اُردو دیوان تک نہیں چھاپا۔ یا تو وہ نسخہ ہے جو کبھی دہلی سے چھپا تھا اور کسی نے اب اُس کو پھر چھاپ دیا اور اِس بُری طرح کہ اُس کو دیکھ کر خوش مذاق دردِ سر میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ یا پھر ایک پرانا پاکستانی اڈیشن ہے اور وہ جس کے ہاتھ آگیا ہے اُس نے سرمایۂ بے بہا سمجھ کر محفوظ کر لیا ہے۔''

ششماہی رسالہ غالب نامہ جولائی 1996 کے شمارے میں رشید حسن خاں کا ایک مضمون ''غالبؔ سے متعلق کچھ مطبوعات'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مضمون میں رشید حسن خاں نے غالبؔ صدی سے متعلق شائع شدہ کتابوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ مضمون میں انھوں نے اپنی بات کو مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے 1958 میں مرتب کردہ ''دیوانِ غالبؔ'' سے شروع کیا۔ اس کے بعد انھوں نے مالک رام کے مرتب کردہ ''غالب صدی اڈیشن'' کی املائی غلطیوں کا جائزہ پیش کیا۔ صد سالہ یادگار غالب کمیٹی کی جانب سے شائع ہوئے ''دستنبو'' کے ترجمے کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ حد یہ ہے کہ آدھے صفحے کا پیش لفظ بھی نہیں، جس سے یہ تو معلوم ہو جائے کہ یہ کس نسخے پر مبنی ہے۔ قاضی عبدالودود نے معرکۂ برہانِ قاطع کے سلسلے کے رسائل غالبؔ کو مرتب کیا۔ اس پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے رشید حسن خاں نے لکھا کہ اس مجموعے میں قاطعِ برہان، سوالاتِ عبدالکریم، لطائفِ غیبی، نامۂ غالب اور تیغِ تیز شامل ہیں۔ یہ جلد اول ہے مفصل مقدمہ و حواشی دوسری جلد میں ہوں گے۔ رشید حسن خاں نے ڈاکٹر یوسف حسین خاں

کی کتاب ''غالب اور آہنگ غالب'' کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔انھوں نے غالب شناسی کے حوالے سے اس کتاب کو صف اول کی کتاب قرار دیا۔ بقول رشید حسن خاں کتاب پڑھ کر محسوس کرتا ہوں کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جو اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کر سکتے ہیں۔عتیق صدیقی کی کتاب ''غالب اور ابوالکلام'' کی بھی خاں صاحب نے ستائش کی۔اس کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد کی اُن تحریروں کو یکجا کیا گیا جن کا تعلق غالب شناسی سے ہے۔پریم پال اشکؔ کی مرتب کردہ کتاب ''محاورہ روز مرۂ غالب'' میں اُن محاورات کو یک جا کیا گیا ہے جو کلامِ غالب میں موجود ہیں۔اس کتاب کے تعلق سے رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ غالبؔ محاورہ بند شاعر نہیں تھے اور نہ اصطلاحاً زبان کے شعر کہتے تھے، ہاں اُن کے کلام میں اُردو کے محاورے ہیں۔اسی مضمون میں انھوں نے دو کتابوں ''غالب اور حیدر آباد'' اور ''بھوپال اور غالب'' پر اظہارِ خیال پیش کرتے ہوئے لکھا:

''دوسری کتاب بھوپال اور غالب جناب عبدالقوی دسنوی کی تصنیف ہے۔ اول الذکر کتاب جس قدر احتیاط اور سلیقے کے ساتھ لکھی گئی ہے، اس کتاب میں اُسی قدر بے احتیاطی کے ساتھ واقعات کو جمع کر دیا گیا ہے۔حشو و زائد کی بھی بہتات ہے۔دراصل ایک مختصر سے مضمون کا مسالا تھا، جس سے ایک کتاب بنا لی گئی ہے۔بے احتیاطی کا یہ عالم ہے کہ شوکتؔ بھوپالی کے نام سے ذوقؔ کی ایک معروف غزل درج ہوئی ہے، معمولی سے تغیرات کے ساتھ مطلع یہ ہے:

ہوش و خرد گئے نگہ سحر فن کے ساتھ
اب جو ہے بات اپنی سو دیوانہ پن کے ساتھ

مرکزی حکومت کے شعبہ نشر و اشاعت کی شائع کردہ کتاب ''گنجینۂ غالب'' پر بھی رشید حسن خاں نے اظہار خیال پیش کیا۔اس کتاب میں رسالہ آجکل، نئی دہلی میں غالب سے متعلق شائع شدہ مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔عطا کاکوی کے مجموعۂ کلام ''نذرِ غالب'' کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ عطؔا صاحب نے غالبؔ کی زمینوں میں جس قدر غزلیں کہی ہیں، جو تضمینیں لکھی ہیں اور غالبؔ سے متعلق جو نظمیں اور رباعیاں کہی ہیں اُن سب کو یک جا کر دیا گیا ہے۔شاعری کے نقطۂ نظر سے، حسنِ عقیدت کے سوا اُن میں اور کوئی خوبی نہیں۔غزل، پھر غالبؔ کی زمین میں، یہ بہت بڑی بات ہے۔یہ لازم نہیں کہ ہر پڑھا

لکھا آدمی شاعری بھی کرے۔ لیکن اس زمانے میں یہ وبا چلی ہے کہ ہر محقق اور نقاد، شاعری کرنا ضروری سمجھتا ہے۔'' تجس اعجازی کی تالیف ''تصویر کا دوسرا رُخ'' میں اُن مضامین کو یک جا کیا گیا ہے جن میں غالبؔ پر کسی نہ کسی گوشے سے اعتراضات کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں رشید حسن خاں نے لکھا کہ یہ بھی ایک انداز ہے کام کرنے کا اس کی افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ مرتب نے سرسری انداز سے اس کام کو کیا ہے اگر وہ ذرا محنت، توجہ اور زیادہ سنجیدگی سے کام لیتے تو اس انداز کا، اس سے اچھا مجموعہ تیار ہو سکتا تھا۔ موصوف نے ہند و پاک میں غالب صدی سے متعلق شائع ہوئے رسائل و جرائد کا بھی محاکمہ پیش کیا ہے۔ ہندوستانی رسائل میں رسالہ ''شاعر'' نے بڑے ہی تزک و احتشام کے ساتھ غالب کی شایان شان ضخیم ''غالب نمبر'' شائع کیا۔ فروغِ اُردو کا ''غالب نمبر'' بھی حجم کے اعتبار سے ضخیم تھا۔ لیکن اس کی مشمولات میں وہ بات نہیں تھی جو ''شاعر'' کے نمبر میں تھیں۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی جانب سے 'علی گڑھ میگزین' نے بھی غالب نمبر شائع کیا۔ اس رسالے کی خاص بات یہ رہی کہ اس میں شعبۂ اُردو کے اساتذہ کے علاوہ دیگر شعبوں کے اساتذہ نے بھی مضمون سپردِ قلم کیے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے بھی اس موقع پر رسالہ جامعہ کا ''غالب نمبر'' شائع کیا۔ رسالہ ''جامعہ'' کا غالب نمبر حجم کے اعتبار سے ضخیم نہیں تھا۔ رسالہ ''تحریک'' نئی دہلی نے بھی غالب نمبر شائع کیا۔ اس رسالے میں مخمور سعیدی کا غالب کے فارسی روزنامچے ''دستنبو'' کا اُردو ترجمہ شامل تھا۔ ''نیا دور'' لکھنؤ نے بھی غالب نمبر شائع کیا۔ اس رسالے میں قاضی عبدالودود، مولانا عرشی، گیان چند جین، نثار احمد فاروقی، ابو محمد سحر اور نیّر مسعود وغیرہ مایہ ناز اصحاب قلم کے مضامین شامل تھے۔ ''دلی کالج میگزین'' نے بھی غالب نمبر شائع کیا۔ اس میگزین کے لیے دہلی یونی ورسٹی اور ذاکر حسین کالج سے وابستہ افراد نے مضمون تحریر کیے۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی کے سہ ماہی مجلّہ 'اُردو ادب' کا غالب نمبر رشید حسن خاں کے نزدیک کم رتبہ اور کم معیاری تھا۔ زندہ دِلان حیدر آباد کے مزاحیہ رسالے 'شگوفہ' نے اپنے خاص انداز میں 'حیوانِ ظریف نمبر' شائع کر غالب کی شاعری میں مزاحیہ عنصر کی نشان دہی کی۔ ''علم و فن'' اور ''شبستاں''، جو کہ ڈائجسٹ کی شکل میں دستیاب ہیں، نے بھی دیوان غالب کو خوب صورت اور دل کش انداز میں شائع کیا۔ رسالہ ''نقوش'' لاہور نے 840 صفحات پر مشتمل ضخیم غالب نمبر شائع کیا۔ رسالہ ''نقوش'' نے اس خاص نمبر کے ساتھ یہ بھی اعلان کیا کہ یہ حصہ اول ہے اس کا دوسرا حصہ بعد

میں شائع کیا جائے گا۔رسالہ ''افکار'' نے بھی غالب نمبر شائع کیا۔ضخامت اور مضامین کے اعتبار سے یہ نمبر کم رتبہ تھا۔انجمن ترقی اُردو پاکستان کے مجلّہ 'اُردو' کا غالب نمبر بہترین نمبروں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔مدیر رسالہ مشفق خواجہ نے بڑی ہی عرق ریزی اور جاں فشانی سے اس رسالے کو شائع کیا۔ رسالہ 'اوراق' نے اپنے سال نامے کا ایک حصہ غالب کے لیے مخصوص کیا۔ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں لاہور سے نکلنے والے رسالہ 'صحیفہ' نے بھی غالب نمبر شائع کیا۔

رشید حسن خاں نے اپنے مضمون ''بہ سلسلہ تدوینِ کلام غالب'' میں اُن مباحث کو منظر عام پر لانے کی سعی کی جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غالب کے قلم سے لکھی ہوئی بہت سی تحریریں موجود ہیں اور ان تحریروں اور بعد میں شائع شدہ تحریروں میں نمایاں فرق موجود ہے۔خاں صاحب نے اپنے مضمون میں یائے مجہول اور یائے معروف کی بحث کو نمایاں کرتے ہوئے لکھا کہ غالب کے خطوط میں یائے معروف اور یائے مجہول کی بحثیں موجود ہیں۔ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ ،نئی دہلی کو چاہیے کہ وہ اپنی نگرانی میں تین چار افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دے جو تحقیق و تدوین کے اصولوں کے تحت سائنٹفک انداز میں کلامِ غالب اور غالب کی تحریروں میں مماثلت کو قارئین کے سامنے پیش کرے۔اس بارے میں رشید حان خاں کا موقف کو جاننے کے لیے یہ درج ذیل اقتباس کا مطالعہ ناگزیر ہے:

> ''ہندستان میں غالب انسٹی ٹیوٹ ،مرزا غالبؔ سے متعلّق سب سے وقیع اور سب سے بڑا ادارہ ہے۔میری تجویز یہ ہے کہ ایسے تین، یا چار، یا پانچ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل کی جائے جو افراد اِن مسائل سے بہ خوبی واقف ہوں اور وہ کمیٹی جس طریقِ کار کا تعیّن کرے، اس ادارے کی مطبوعات میں اِس کی پابندی کی جائے اِس طرح سب کاموں میں یکسانی بھی رہے گی اور تحقیق و تدوین کے اصولوں کی روشنی میں طریقۂ کار کا تعیّن بھی کیا جا سکے گا۔ اِس کی ضرورت کئی وجہوں سے ہے۔سب سے بڑی وجہ تو یہی ہے کہ اِس ادارے کے مقاصد میں یہ شامل ہے کہ کلامِ غالبؔ کے معتبر اڈیشن شائع کیے جائیں۔ اِس کے لیے یہ لازم ٹھہرے گا کہ انفرادی طریقِ کار پر انحصار نہ کرتے ہوئے

صحتِ متن کے سلسلے میں مختلف فیہ یا غیر مختلف فیہ اہم مسائل کا گوشوارہ بنالیا جائے
اور اِس ادارے کی طرف سے مرتّب کرائے جانے والے مجموعہ ہائے نظم و نثرِ
غالبؔ میں اِس مسلّمہ اور متّفقہ طریقِ کار کی پابندی کو لازم قرار دیا جائے۔''

رشید حسن خاں نے اپنے مضمون ''غالب کے خطوں میں قواعدِ زبان، تلفظ اور املا کے مسائل'' میں غالب کے خطوط میں املا، زبان اور قواعد کے متعلق اہم مسائل و نکات پر گفتگو کی ہے۔ اس ضمن میں ان کا ماننا تھا کہ غالب کے خطوط کا جائزہ اُردو ادب میں لسانیاتی پہلوؤں کے مدنظر نہیں لیا گیا ہے۔ اگر اُردو ادب میں ان خطوط کا جائزہ املا، تلفظ اور قواعد کے اعتبار سے لیا جائے تو بہت سے ایسے گوشے ہمارے سامنے وا ہوں گے جن سے ابھی تک ہم نابلد ہیں۔ غالب نے اپنے شاگردوں کو جتنے بھی خطوط ارسال کیے ان میں کہیں نہ کہیں املا اور قواعد کی بحثیں موجود ہیں۔ اپنے مضمون میں ان تمام باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے رشید حسن خاں رقم طراز ہیں:

''مرزا غالبؔ کے خطوں میں قواعد کی مختلف جہتوں سے متعلّق بہت کچھ ملتا ہے۔ حُسنِ اتّفاق سے اُن کے خطوں کا خاصا بڑا ذخیرہ محفوظ ہے اور عام دست رس میں بھی ہے۔ مرزا صاحب کا شمار امیرؔ مینائی، داغؔ یا جلالؔ جیسے اساتذہ کے زمرے میں تو نہیں کیا جاسکتا۔ وہ شاعر تو اِن سب سے بڑے تھے اور بہت بڑے، مگر زبان اور بیان کے استناد کے معاملے میں اِن اساتذہ کے برابر نہیں تھے۔ اِس بنا پر مرزا صاحب کے ایسے فرمودات کی وہ عمومی استنادی حیثیت تو نہیں، جیسی اُن اساتذہ کی نوشتوں کی ہے، مگر اِس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اِن سے مرزا صاحب کے خیالات اور مختارات کا علم ہوتا ہے اور اِس علم کی تدوین کے نقطۂ نظر سے بہت اہمیت ہے۔ اہمیّت یہ ہے کہ جن امور کے متعلّق اُنھوں نے واضح طور پر اپنی رائے ظاہر کی ہے، اُن کے اُردو اور فارسی کلام کو مرتّب کرتے وقت اُن کی رائے کو لازمی طور پر سامنے رکھا جائے گا اور اُن کے جملہ کلامِ نظم و نثر کی تدوین میں التزام کے ساتھ اُس کی پابندی کی جائے گی۔ اِس طریقِ کار کو ملحوظ رکھے بغیر اُن کے کلام کی تدوین کو ناقص قرار دیا جائے گا۔ سیمنار

> کی نسبت سے اِس تحریر میں تفصیل کی گنجایش نہیں، اِس لیے چند حوالوں پر اکتفا کرنا ایک طرح کی مجبوری ہے، لیکن اِنھیں چند حوالوں سے صورتِ حال کی ضروری وضاحت ہو جائے گی۔''

رشید حسن خاں نے مضمون ''یادگارِ غالب'' میں مولانا الطاف حسین حالی کی تخلیق ''یادگارِ غالب'' کو مقدمہ شعر و شاعری کے بعد اُردو ادب کی اہم تصنیف تسلیم کیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے لکھا کہ حالیؔ کا ذہن تنقیدی مباحث سے جیسی قریب کی نسبت رکھتا تھا، تحقیقی مباحث سے اُن کے مزاج کو ویسا علاقہ نہیں تھا۔ رشید حسن خاں نے انہی وجوہات کی بنا پر'یادگارِ غالبؔ' کے تحقیقی پہلوؤں کو کمزور پہلو تسلیم کیا ہے۔ موصوف نے مرزا غالبؔ کی شخصیت اور فن پر جو کتابیں وقت وقت پر منظرِ عام پر آئیں اُن پر بے لوث اور بے لاگ تبصرے کیے۔ ماہرِ غالبیات کالی داس گپتا رضاؔ، جو خاں صاحب کے مداح اور دوست تھے، کی مختصر کتاب ''غالبؔ (مختصر حالات اور انتخابِ کلام مع شرح) منظرِ عام پر آئی تو انھوں نے اس کتاب پر اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

> ''غالب'' کالی داس گپتا رضاؔ صاحب کی مختصر سی کتاب ہے جو 82 صفحات پر مشتمل ہے۔ میں نے پہلی بار جب اِس مختصر کتاب کو دیکھا تو تعجب ہوا، یوں کہ رضاؔ صاحب نے غالبیات سے متعلّق اہم کتابیں لکھی ہیں جن کی اہمیّت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اُن کتابوں کے سامنے یہ کتاب بہت ہلکی پھلکی معلوم ہوتی ہے، لیکن جب اِس کا مختصر سا دیباچہ ''حرفِ چند'' پڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ کیوں لکھّی گئی ہے اور اِس کا انداز دوسری کتابوں سے مختلف کیوں ہے''

پاکستان کے مشہور و معروف محقق و مدون، مشفق خواجہ کی کتاب ''غالب اور صفیرؔ بلگرامی'' پر بھی رشید حسن خاں نے ایک طویل اور عالمانہ تبصرہ رسالہ غالب نامہ بابت جنوری 1988 کے شمارے کے لیے تحریر کیا۔ اس کتاب میں مشفق خواجہ نے صفیرؔ بلگرامی اور مرزا غالبؔ کے تعلقات کے حوالے سے جو باتیں تحریر کیں ان سے کم لوگ ہی واقفیت رکھتے تھے۔ صفیرؔ بلگرامی فارسیؔ میں غالبؔ کو اپنا اُستاد تسلیم کرتے تھے۔ رشید حسن خاں نے ایک جانب جہاں مشفق خواجہ کے اس کام کی خوب تعریف کی وہیں دوسری جانب انھوں نے یہ بھی لکھا کہ مشفق خواجہ نے اپنی روش کے برخلاف تنقیح اور تنقید سے کام لیا ہے۔ خاں

صاحب کی نظر میں صفیرؔ ایک معتبر راوی نہیں تھے۔اس لیے صفیرؔ کے بیانات پر اعتبار کرنا تھوڑا مشکل ہے۔غیر معتبر بیانات کی ایک جھلک بہ قول رشید حسن خاں صفیرؔ نے اپنے تذکرے ''جلوۂ خضر''میں دکھائی ہے۔ان تمام باتوں کے مدنظر انھوں نے لکھا کہ اختصار اور جامعیت اس کتاب کا خاص وصف ہے۔فضولیات اور زوائد سے قطعِ نظر کرنا اور ضروری اجزا کو احتیاط اور سلیقے کے ساتھ ترتیب دینا آسان کام نہیں۔

اُردو اکیڈمی سندھ،کراچی کی جانب سے 1981 میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے دس مضامین (خطوطِ غالب کے ادوار،غالب کا شعری رویہ 1857 کے پس منظر میں،گُل رعنا نسخہ غالبؔ بہ خطوط غالب،گُل رعنا مطبوعہ لاہور کی حقیقت،گُل رعنا مالک رام کا زمانہ کتابت،غالب کے بعد اُن پر پہلا مضمون،غالبؔ اور مجروحؔ کی مکاتبت،قطعۂ غالب بہ سلسلۂ قضیۂ برہان،عودِ ہندی غالب کے خطوط کا پہلا مجموعہ اور غالبؔ کی معدوم تصانیف) پر مشتمل کتاب ''تحقیقِ غالبؔ''منظر عام پر آئی۔رشید حسن خاں نے اس کتاب پر رسالہ'' غالب نامہ'' جنوری 1988 کے لیے تبصرہ تحریر کیا۔اپنے تبصرے میں موصوف نے اس کتاب کی اہمیت اور افادیت پر بحث کرتے ہوئے لکھا کہ غور و فکر کے ساتھ لکھے گئے یہ مضامین صحیح معنی میں اس بات کے مستحق ہیں کہ علمی سنجیدگی کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا جائے۔اس مجموعے کے کئی مضامین غالب سے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ کرتے ہیں اور یہ مضامین علمی بحث کا موضوع بن سکتے ہیں۔

پاکستان کے ہی ایک اور اہلِ قلم ڈاکٹر حسن اختر کی کتاب ''حیاتِ غالبؔ کا ایک باب'' مکتبہ عالیہ،ایبک روڈ،لاہور سے شائع ہوئی۔اس پر رشید حسن خاں نے رسالہ غالب نامہ جنوری 1988 کے شمارے میں تبصرہ تحریر کیا۔اس کتاب کے بارے میں انھوں نے لکھا کہ اس مختصر سی کتاب میں غالبؔ کے مقدمۂ پنشن کلکتہ سے متعلق بعض اہم چیزوں کو پیش کیا ہے۔انھوں نے مزید لکھا کہ غالبؔ کی پنشن کے سلسلے میں جو بحثیں ہیں،اُن میں اس کتاب کے مندرجات سے کچھ نہ کچھ مدد ضرور ملے گی۔ڈاکٹر حسن اختر نے اس کتاب میں اُن دستاویزوں کے عکس کو شامل کیا جن کا تعلق مقدمۂ پنشن کلکتہ سے تھا۔

رشید حسن خاں نے جولائی 1991 میں رسالہ غالب نامہ میں مولانا نظم طباطبائی کی شرح ''شرح طباطبائی'' پر بھی اپنے خیالات کا اظہار تحریری طور پر کیا۔اس شرح کے بارے میں موصوف کا خیال ہے کہ مولانا نظم طباطبائی کی شرح،اپنے انداز کی منفرد کتاب ہے،خاص کر اس اعتبار سے کہ شرحِ کلامِ غالبؔ کے سلسلے کی بہت سی بحثوں کا نقطۂ آغاز ہے۔حالاں کہ کلامِ غالبؔ کے دوسرے شارحین

نے شرح طباطبائی پر اعتراضات بھی کیے ہیں۔اس کے برخلاف اس شرح کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔احقر کی نظر میں بھی جب طلبہ کے سامنے کلامِ غالبؔ کی شرح کی بات آتی ہے تو سب سے پہلے ان کا ذہن شرح طباطبائی اور شرح دیوانِ غالب از پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ان شرحوں میں دہلی اور لکھنؤ کے ادبی معرکوں کے علاوہ زبان، بیان، قواعد، عروض اور فلسفے کے بہت سے مسائل کا تصفیہ کیا گیا ہے۔شرح طباطبائی کے متعلق رشید حسن خاں کا یہ تبصرہ نما مضمون بہت ہی عالمانہ، معلومات سے لبریز اور شرح طباطبائی کی معنویت اور افادیت کی کہانی بیان کرتا ہے۔اس مضمون کا مطالعہ قارئین اس کتاب میں کر سکتے ہیں لیکن میں یہاں اس مضمون کا ایک اقتباس نقل کر رہا ہوں تا کہ شرح طباطبائی کی علمی و ادبی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکے:

> ’’مولانا نظم طباطبائی کی شرح، اپنے انداز کی منفرد کتاب ہے، خاص کر اِس اعتبار سے کہ شرحِ کلامِ غالبؔ کے سلسلے کی بہت سی بحثوں کا نقطۂ آغاز بنی ہے۔نظمؔ سے دوسرے شارحین نے بہت سے مقامات پر اختلاف کیا ہے لیکن اِس سے اِس کی اہمیّت ذرا بھی کم نہیں ہوتی۔آج بھی کلامِ غالبؔ کے اچّھے طالبِ علموں کے لیے اِس شرح کا مطالعہ ناگزیر ہے۔اشعار کی شرح کے ذیل میں زبان، بیان، قواعدِ شاعری، بلاغت، عروض اور فلسفے کے بہت سے مسائل اِس کتاب میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اِسی کے ساتھ دہلیؔ و لکھنؔو کے دبستانی اختلافات کی جھلک بھی کئی جگہ نظر آجاتی ہے۔ پڑھنے والا ان مباحث سے اگر واقف نہیں، تو وہ اِس شرح کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔مقصد یہ ہے کہ اِس کتاب کو صرف غالبؔ کے اشعار کی شرح سمجھ کر نہیں پڑھنا چاہیے۔فارسی میں شرح نویسی کی جو طاقتور روایت کارفرما رہ چکی تھی، وہ کثیر الجہات تھی، یعنی شرح لکھنے والا، جملے یا شعر کا مفہوم لکھنے کے ساتھ ساتھ اِس عبارت یا اِس مفہوم سے متعلّق اور ضروری باتیں بھی لکھتا جاتا تھا، یہی انداز اِس شرح کا ہے۔کسی ایک تحریر میں ایسی کسی بھی کتاب کے جملہ مباحث کا بیان مشکل ہے، خاص کر ایسی تحریر میں جو کسی سمینار میں پڑھنے کے لیے لکھی گئی ہو کہ وہ تو مختصر تر ہوتی ہے،

اِس لیے چند ضروری اشارات پر اکتفا کرنا ایک طرح کی مجبوری ہے۔ اِس مختصر سی تحریر میں اِس شرح کی بس دو تین خصوصیات کا تعارف کرایا گیا ہے۔''

غالب انسٹی ٹیوٹ نے جب رسالہ غالب نامہ کا توضیحی اشاریہ، جے این یو کے ریسرچ اسکالر فاروق انصاری کی زیرِنگرانی (ابتدا سے جولائی 1993 تک) تیار کیا تو اس اشاریے پر رشید حسن خاں نے ''پیش لفظ'' تحریر کیا۔ اس مختصر سے پیش لفظ میں انھوں نے اُردو رسائل کی اشاریہ سازی کی روایت اور اہمیت پر مدلل اور کارآمد باتیں تحریر کیں۔ اشاریہ سازی کی بحث پڑھ کر قاری ششدر رہ جاتا ہے کہ تحقیق اور تدوین میں رات دن ڈوبے رہنے والے انسان کی معلومات کتنی وسیع ہے۔ قرۃ العین حیدر کے شاہ کار ناول آخرِ شب کے ہم سفر پر اس پیش لفظ کے ابتدا میں جو باتیں تحریر کی گئی ہیں وہ ان کے وسیع مطالعے کی روشن براہین ہیں۔ خاں صاحب نے اپنے پیش لفظ میں فاروق انصاری کے کام کی خوب ستائش کی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اُردو ادب میں اشاریہ سازی کی روایت زیدہ مستحکم نہیں رہی۔ 1980 کے بعد اشاریہ سازی کی جانب زیادہ توجہ مبذول کی گئی۔ لیکن اکیسویں صدی کے آغاز کے بعد بہت سے اہم رسائل و جرائد کے اشاریے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ جب ہم کسی رسالے کی پرانی فائلیں تلاش کرتے ہیں تو یہ اشاریے ہی ماخذ کی تلاش میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ رشید حسن خاں نے رسالہ ''غالب نامہ'' کے اس اشاریے پر اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

> ''فاروق انصاری جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں۔ اِس یونی ورسٹی میں تعلیم کا جو نظام اور انداز ہے، یہ اُس کی خوبی ہے کہ اور مضامین کی تو خیر بات ہی اور ہے، اُردو میں بھی اچھے طلبہ کے ذہن نئے خیالات کی روشنی سے محروم نہیں رہتے اور وہ زندگی اور ادب کے نئے مطالبات کی اہمیت سے بے خبر نہیں رہتے۔ ہاں بے قدرِ توفیق اور بہ قدرِ ظرف کا اصول یہاں بھی کارفرما رہتا ہے۔ فاروق صاحب نے اب سے پہلے دہلی اُردو اکیڈمی کے رسالے ایوانِ اُردو کا اشاریہ بنایا تھا، جو کتابی صورت میں چھپ چکا ہے۔ وہ نقشِ اوّل تھا، مگر اُسی سے اُن کی صلاحیتِ اشاریہ سازی کا اندازہ ہوتا تھا۔ اب انھوں نے غالب انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کے علمی مجلّے غالب نامہ کا اشاریہ مرتب کیا

ہے۔اس رسالے میں غالبؔ اورعہدِ غالبؔ پر اہم مقالات شائع ہوئے ہیں۔اِسی کے ساتھ اصولِ تحقیق،اصولِ تدوین اور اُردو اور فارسی زبان وادب سے متعلق بھی قابلِ ذکر مضامین چھپتے رہے ہیں۔اِن موضوعات پر کام کرنے والوں کے لیے یہ سارا سرمایہ بہت کام کا ہے۔یہ رسالہ عام پسند نہیں،اِس لیے ہر جگہ نہیں پہنچ پاتا اور اِس کے مندرجات سے بہت سے کام کرنے والے بے خبر رہتے ہیں۔اِس لحاظ سے غالب نامے کے اشاریے کی خاص اہمیت ہے۔''

رشید حسن خاں نے''انشاے غالب کا خطی نسخہ''،مضمون میں اُن خطی نسخوں پر تفصیلی بحث کی جو مولانا ضیاء الدین خاں دہلوی کی تحویل میں تھے۔بعد میں مالک رام نے ان خطی نسخوں کے بارے میں کچھ باتیں انشاے غالب میں تحریر کی تھیں۔خاں صاحب نے اپنے مفصل مضمون میں چھ خطوط بھی شامل کیے ہیں تا کہ غالب کے خطی نسخوں سے متعلق باتیں قارئین تک بہ آسانی پہنچ جائیں۔رشید حسن خاں نے اس باب کو مزید وسعت دیتے ہوئے اپنی کتاب انشاے غالب میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کے اس ضمن میں لکھے گئے مقالات کی روشنی میں پرکھا۔

اب میں رشید حسن خاں کے اُن خطوط کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جن میں انھوں کلامِ غالبؔ سے متعلق علمی باتیں تحریر کی ہیں۔رشید حسن خاں نے کلام غالبؔ کی لفظیات پر اپنے جن ادب نواز ہم نواؤں سے بہ ذریعہ خطوط مشورہ کیا اُن میں عبدالرزاق قریشی،پروفیسر رفیع الدین ہاشمی،پروفیسر حنیف نقوی،پروفیسر ظفر احمد صدیقی،اسلم محمود،ڈاکٹر خلیق انجم،شاہد ماہلی،،پروفیسر سید عقیل احمد رضوی،مختار الدین احمد،پروفیسر اصغر عباس،ڈاکٹر ممتاز احمد خاں،یعقوب میرا مجتہدی،عبدالوہاب خاں سلیم،پروفیسر علی احمد فاطمی،ڈاکٹر صابر سنبھلی،ڈاکٹر ٹی.آر.رینا وغیرہ کے نام سرِ فہرست ہیں۔ان مایہ ناز ادبی شخصیات سے بہ ذریعہ قلم گفت وشنید سے ادب کے طالب علموں بالخصوص جہانِ غالبؔ میں غوطہ زنی کرنے والوں کو بہت سی کارآمد باتیں معلوم ہوئیں۔رشید حسن خاں کلامِ غالبؔ کی فرہنگ پر دہلی یونی ورسٹی میں ملازمت کے زمانے سے ہی کام کر رہے تھے۔خاں صاحب غالبؔ انسٹی ٹیوٹ دہلی سے بھی وابستہ تھے بالخصوص انھوں نے ایک مدّت تک غالب نامہ کے مدیر اور مبصر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔اس اعتبار سے غالبؔ پر ہونے والی ہر چھوٹی بڑی ادبی سرگرمی کے وہ گواہ تھے۔غالبؔ نامہ کی طباعت اور اس میں

شامل مضامین پر ان کی گہری نظر تھی۔اپنے دوستوں کو وہ کلامِ غالبؔ کی تدوین کے لیے آمادہ کرتے تھے۔تا کہ غالبؔ شناسی میں مزید اضافہ ہو۔پروفیسر حنیف نقوی کے نام 17 اگست 1984 کو لکھے خط میں کلامِ غالبؔ کی تدوین سے متعلق ضروری باتیں تحریر کی گئی ہیں۔لکھتے ہیں:

''غالبؔ کے کلامِ فارسی کی تدوین کو آپ اپنے ذمّے لے لیجیے۔یہ کام عمر بھر کی کمائی ثابت ہوگا اور مزید شہرت و ناموری کا سبب بھی بنے گا اور ایک اچھا کام بھی ہو جائے گا۔ظاہر ہے کہ ضروری مآخذ کے عکس آپ کو ملنا چاہیے۔آپ براہِ کرم یہ کیجیے کہ ایک فہرست اُن مآخذ کی بنا دیجیے جن کی ضرورت ہوگی۔''

(رشید حسن خاں کے خطوط، جلد دوم، نومبر 2015، ص 120)

رشید حسن خاں نے پروفیسر حنیف نقوی کے نام 22 ستمبر 1993 کو ایک طویل خط تحریر کیا۔اس خط میں املا کی بحث کے ساتھ ساتھ لفظوں، جملوں، فقروں اور شاعری کے اوزان، تقطیع اور بحر پر مفصل قلمی گفتگو ہے۔اس خط میں قاضی عبدالودود کی کتاب 'مآثرِ غالبؔ' اور 'غالب بہ حیثیت محقق' میں زیبائش و پیدائش کی بحث کو موضوع بنایا گیا ہے۔قابلِ غور بات یہ ہے کہ تمام مثالیں غالبؔ کے کلام سے دی گئی ہیں کہ غالبؔ نے کون سا لفظ کس معنی میں استعمال کیا اور اس لفظ سے کیا کیا مفاہیم و مطالب برآمد ہوئے۔اس بارے میں رشید حسن خاں نے لکھا:

''ہاں پہلے یہ کہہ دوں کہ قاضی صاحب نے اپنی زندگی میں مآثرِ غالبؔ کو نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا تھا، اُسے دیکھیے، اس میں وہ جملہ صاف طور پر مل جائے گا۔میرے پاس وہ نہیں۔مختارالدین آرزو صاحب سے کل ملاقات ہوئی تھی غالبؔ انسٹی ٹیوٹ میں، وہ کہہ رہے تھے کہ عابد رضا بیدؔار صاحب نے اُن سے فرمایش کی ہے کہ مآثرِ غالبؔ کو مرتب کرنے کی۔آزیدن، آژیدن، آزدن، اَزدن، آژدن فارسی کا مصدر ہے جو برہانِ قاطع میں موجود ہے، اِس کے معنی ہیں: خلانیدنِ سوزن و امثالِ آن ست و استرہ زدن،رنگ کردن کے معنی میں بھی آتا ہے۔پہلے مصرعے کے معنی صاف ہیں: مخالفوں کی آنکھوں کو تیرے چھیدے۔دوسرا مصرع مبہم سا ہے۔اگر ''کفِ'' کے بجائے ''کف'' پڑھا

جائے تو تاویل کے ساتھ معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ (دوستوں) کے ہاتھ سونے سے رنگ دے (یعنی بھر دے) نذیر صاحب سے بھی مشورہ کیا، وہ بھی اِس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکے۔

پیدایش اور زیبایش سے متعلق یاد پڑتا ہے کہ قاضی صاحب نے ''غالبؔ بہ حیثیت محقق'' میں گفتگو کی ہے۔ کتاب میرے پاس ہوتی تو دیکھ لیتا۔ آپ ذرا نظر ڈال لیجیے۔ شادی مکتب نشینی کسی ایرانی کے کلام میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ تو محض ہندوستانی طرزِ کلام ہے۔

''خوشتر'' کی جگہ ''خوبتر'' لانے کی ضرورت نہیں۔ خوش تر سے بھی مصرع باوزن رہے گا۔ یہاں تسکینِ اوسط کا زحاف آیا ہے۔ مفعول فاعلاتن مفعول فاعلن۔ اصل وزن: مفعول فاعلاتُ مفاعیلُ فاعلن۔ فاعلات زحاف کے اثر سے فاعلان بن جائے گا اور مفاعیل مفعول بن جائے گا۔ میرا بھی خیال یہ ہے کہ یہ مصرعہ ہے اور ''روز سیاہ'' ہوگا یا یہ کہ ہونا چاہیے۔ قاضی صاحب نے ''غالبؔ بہ حیثیت محقق'' میں لکھا ہے کہ قطران کا لغت عہدِ جہاں گیر تک موجود تھا، یوں کہ فرہنگِ جہاں گیری کے مولف [نے] اپنے مآخذ میں اس کا کام لیا ہے، مگر میرا خیال یہی ہے کہ اُسے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ جب عہدِ جہاں گیر تک موجود تھی تو اس کے علاوہ کوئی اور بھی تو اس سے واقف ہوتا، مگر کوئی واقف نہیں ملتا۔ ہاں بھائی! نقدِ غالبؔ ابھی مل گئی۔ اس میں صفحہ 412 پر زیبایش و پیدایش کی بحث موجود ہے۔ آپ اُسے دیکھ لیجیے۔ آپ کے پاس تو ہوگی۔ لیجیے نیت صادق تھی تو وہ بھی مل گئی۔ اس میں جملہ یوں ہے: ''دیوان مجیک ودقیق... پیش من بخواندو ہر معنی کہ اور مشکل بود از من پرسید''۔ یہ جملہ تو صاف چھپا ہوا ہے۔ معلوم نہیں آپ کے پیشِ نظر نسخے میں کس طرح مغشوش ہو گیا۔ میرے سامنے غالبؔ نمبر 49-1948 ہے۔ یعنی علی گڑھ میگزین کا غالبؔ نمبر، جو بعد کو 'نقدِ غالبؔ' کی شکل میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ مآثر غالبؔ پہلی بار اس میں شائع ہوئی

تھی۔امثال وحکم (علی اکبر وہخد) میں اِسے اس طرح لکھا گیا ہے:''صلاح ماہمہ آنست کوتر است صلاح اگر بمذہب تو خونِ عاشق است مباح''۔یعنی پورا شعر مندرج ہے۔''(ایضاً،ص160 تا161)

رشید حسن خاں نے پروفیسر حنیف نقوی کے نام 8دسمبر 1996 کو لکھے خط میں اس بات کی وضاحت کی کہ اب ان کا تعلق غالبؔ انسٹی ٹیوٹ سے نہیں رہا ہے۔وہ انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیوں سے بھی زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔البتہ رشید حسن خاں،انجمن ترقی اُردو (ہند)،نئی دہلی کی جانب سے غالبؔ کے دوسو سالہ جشن منانے کی تقریب سے واقفیت اور گہری دل چسپی رکھے ہوئے تھے۔ان تمام باتوں کوانھوں نے اپنے مکتوب میں تحریر کیا۔لکھتے ہیں:

''غالبؔ انسٹی ٹیوٹ سے میرا اب کچھ واسطہ نہیں،اِس لیے مجموعہ مضامین کے لیے کچھ نہیں کہہ سکتا۔وہاں کا احوال اب دوسرے انداز پر ہے۔البتہ میں نے خلیق انجم صاحب کو خط لکھا ہے آج ہی،اِس کے لیے۔انجمن غالبؔ کے دوسو سالہ جشنِ یادگار کے سلسلے میں کچھ کتابیں غالبؔ کے متعلق چھاپے گی،اُس سلسلے میں اِس کی گنجایش نکل سکتی ہے۔اِس لیے میں نے لکھا ہے،جواب آتے ہی آپ کومطلع کروں گا۔''(ایضاً،ص173)

رشید حسن خاں نے 5جولائی 1997 میں پروفیسر حنیف نقوی کے نام خط تحریر کیا،اس میں غالبؔ کے وھاں اور یھاں کے مخفف پر تبادلۂ خیال پیش کیا گیا۔ساتھ ہی اس بحث میں رشید حسن خاں نے امتیاز علی عرشی کے انتخابِ غالبؔ میں موجود باتوں کو مسترد کیا۔اس کے بعد یھاں اور وھاں پر مفصل بحث کی گئی ہے اور غالبؔ سمینار دسمبر میں ہونے کی اطلاع بھی دی گئی ہے۔لکھتے ہیں:

''(2)میرا خیال یہ ہے کہ غالبؔ وہاں اور یہاں کے مخفف کووھاں اور یھاں آخر تک مانتے رہے۔عرشی صاحب نے اِنتخاب غالبؔ کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے،وہ میرے نزدیک قابل قبول نہیں۔دووجہوں سے:ایک تو یہ کہ اس انتخاب کے 20مصروں میں یہ لفظ نہیں آئے ہیں،مرزا صاحب نے بس ایک جگہ وھاں کو واں بنایا؛یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔مکاتیبِ غالبؔ میں ہی بیتابؔ کے کلام پر اصلاح

لازماً اُس تاریخ کے بعد کی ہے جس تاریخ میں انتخاب رام پور بھیجا گیا تھا۔ یوں
زمانے کے لحاظ سے بھی وھاں اور یھاں صحیح ٹھہرتے ہیں۔ میں نے اس متعلق ایک
تحریر لکھی ہے جو عن قریب چھپے گی، آپ کی رائے معلوم ہو جائے تو اطمینان
ہو۔ (3) غالبؔ سمینار (دسمبر) میں آپ جائیں گے؟ (ایضاً، ص176)

رشید حسن خاں خطوط میں پروفیسر حنیف نقوی سے غالبؔ کے متعلق کسی نہ کسی موضوع پر باتیں یا مشورہ کرتے تھے۔ اگر خاں صاحب کے پاس کوئی نئی جان کاری ہوتی تو اس کی اطلاع وہ نقوی صاحب کو دیتے۔ 23 جولائی 1999 کو غالب کے خطی نسخے سے متعلق ایک اہم معلومات خاں صاحب نے پروفیسر حنیف نقوی کو دی۔ اس خط میں انھوں نے دیوانِ غالبؔ کے نسخۂ لاہور کو ڈاکٹر معین الرحمٰن کے ذریعے عکسی صورت میں چھاپنے کی اطلاع پہنچائی۔ لکھتے ہیں:

''ہاں ڈاکٹر معین الرحمٰن (لاہور) نے دیوانِ غالبؔ نسخۂ خواجہ کے نام سے ایک خطی نسخے کو عکسی صورت میں چھاپا ہے۔ میرا خیال، بل کہ یقین ہے کہ یہ وہی نسخہ لاہور ہے جو پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں تھا اور جس کا تعارف قاضی صاحب اور عرشی صاحب اور سید عبداللہ نے کرایا تھا۔ یہ اب وہاں سے غائب ہو چکا ہے۔ میرے پاس اس کی دو کاپیاں ہیں، معین صاحب نے بھیجی ہیں۔ مضمون کی فرمایش ہے سخت۔ میرے لیے اُس کی مندرجات میں تامّل کے مقامات بہت ہیں۔ خیر، ایک صفحہ لکھ کر بھیج دوں گا، تبصرہ پھر کبھی۔'' (ایضاً، ص200)

رشید حسن خاں نے پروفیسر حنیف نقوی کے نام 22 اگست 1999 کو خط تحریر کیا۔ جس میں مرقع غالبؔ کے ملنے اور گنجینۂ معنی کا طلسم کے لیے گوشوارۂ غالبؔ بنانے کی اطلاع دی گئی۔ اس بابت انھوں نے لکھا:

''نقوی صاحب! مرقع غالبؔ مل گئی۔ فون کیا تھا، آپ تھے نہیں شکر گزار ہوں۔ گوشوارۂ غالبؔ کا کام شروع کر دیا ہے، چاہتا ہوں کہ یہ اب مکمل ہو ہی جائے۔ چند صفحے بھیج رہا ہوں، طریقۂ کار کے متعلق آپ کی رائے مطلوب ہے۔ شروع کے صفحے چھوٹ گئے ہیں اور عکس نہیں بن پایا، دوبارہ اُنھیں بھیج نہیں پایا، آخر میں ''بادشاہ'' کی بحث ناتمام ہے، اگلے صفحے پر بھی آئے گی۔ کل

سے سارا دن اِسی کام کی نذر کر رہا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ چھے مہینے میں یہ مکمل ہو جائے۔''(ایضاً،ص201)

مرقعِ غالبؔ اور اس کے عکس کے بارے میں رشید حسن خاں خاصے فکر مند تھے۔اس کے عکس نقوی صاحب کے پاس نہ بھیجنے کا انھوں عزم کیا۔تا کہ ان کے پاس محفوظ رہے۔13 ستمبر 1999 کو لکھے خط میں ان باتوں کا احاطہ کیا گیا۔ساتھ ہی املا، غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کے انعام نامے اور غالبؔ کے خطوط پر طویل باتیں ہیں۔لکھتے ہیں:

''مرقعِ غالبؔ کو کھولتے اب ڈرتا ہوں،عکس جن صفحات پر ہے۔اُن کا کاغذ (جو خاصا موٹا ہے) درکنے لگا ہے۔اُسے میں نے اب بند کر کے رکھ دیا ہے۔ویسے ہی کام چلاؤں گا۔مگر اُسے ابھی بھیجوں گا نہیں،معلوم نہیں کسی وقت ضرورت پڑ جائے۔کام کے مکمل ہونے پر ہی بھیجوں گا ضرور۔بوڑھا اور بوڈھا کی تفریق میں آپ کی نکتہ آفرینی خوب ہے،مگر مجھے اُس سے اتّفاق نہیں۔مرزا صاحب نے کئی جگہ اِس قیاس کی دورنگی سے کام لیا ہے۔

ابھی غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کا انعام نامہ ملا،جس کی خانہ پوری کرنا ہے۔آسانی کے ساتھ تو بس ایک ہی نام ذہن میں آیا،تحقیق کا،باقی سب میں نے دوسروں کے لیے چھوڑ دیے،کیا کرتا۔وہ ایک نام کس کا ہے،یہ آپ خود ہی سمجھ گئے ہوں گے۔خدا کرے دوسرے بھی سمجھیں۔

ہاں مجھے ایک خط کا علم ہے کہ وہ بہ خطّ غالبؔ نہیں۔مکتوب بہ نام کلب علی خاں۔جو خلیق انجم صاحب کی کتاب میں ص1305 پر ہے۔اگر اس کے سوا کوئی اور خط بھی آپ کی نظر میں ہوں،تو ضرور مطلع کیجیے۔ان راجا بیکانیر کے نام جو خط ہے، اس پر ذرا سا شک ہے مجھے،مگر یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔اُس کا آخری حصہ تو یقیناً کسی اور کا لکھا ہوا ہے۔آپ ذرا اُسے دیکھ لیجیے۔کتاب تو آپ کے پاس ہوگی۔آپ کی رائے کیا ہے۔یہ دوسری جلد میں ص750 ہے۔

نامہ ہائے غالبؔ کے جن دو لفظوں کا آپ نے حوالہ دیا ہے،وہ یوں شامل نہیں ہو

سکتے اس گوشوارے میں کہ وہ تحریریں بہ خطِ غالبؔ نہیں۔ میں نے ''بہ خطِ غالبؔ'' کا التزام کیا ہے، دوسری مطبوعہ تحریروں کو شامل نہیں کیا اِس گوشوارے میں۔'' (ایضاً، ص 201 تا 202)

29 ستمبر 1999 کو رشید حسن خاں نے پروفیسر حنیف نقوی کے نام خط تحریر کرتے ہوئے املاے غالبؔ اور خطوط غالبؔ پر تبادلۂ خیال کیا۔ ساتھ ہی لفظیاتِ غالبؔ کے گوشوارے کی پیش رفت پر بھی مزید اطلاع دی کہ کتنے صفحات مکمل ہوگئے ہیں۔ اس بارے میں انھوں نے لکھا:

''غالبؔ نے کئی جگہ الٰلہ، الٰہی، الٰہ لکھا ہے۔ میں نے مولانا کو خط لکھا، وہ شاید علی گڑھ میں نہیں، جواب نہیں آیا۔ عربی گرامر کے لحاظ سے الٰہی اور اللہ پر مد کیا آ سکتا ہے، اُسی طرح جس طرح حروفِ مقطّعات پر آتا ہے۔؟ مرزا صاحب نے ایک خط میں لکھا ہے؛'' جس طرح اللہ میں مسدّ دلام کو دو لام کے قائم قرار دیا ہے، الٰہ اور الٰہی میں الفِ ممدودہ کو دوسرا الف کیوں کر سمجھیں، قیاس کام نہیں کرتا، اتّفاق سلف شرط ہے۔'' (بنام تفتہ، غالبؔ کے خطوط، ص 358) دو لام کے قائم مقام قرار دینے سے مد کا جواز کیسے نکلے گا، یہی صورت الٰہ اور الٰہی کی ہے۔ لام کے بعد حرفِ مد کس طرح آئے گا، اِس سلسلے میں آپ کی راے کیا ہے۔ میں نے حصّۂ اوّل کے اُن صفحات کو کالعدم قرار دے دیا جو پہلے لکھے تھے، دوبارہ اُسے شروع کیا اور حصّۂ اوّل مکمل ہوگیا، جس میں مفرد الفاظ کا گوشوارہ ہے۔ 94 صفحات میں آیا ہے یہ حصّہ۔ اب پرسوں سے دوسرا حصّہ شروع کیا ہے ''اصول اور طریقِ کار والا۔'' (ایضاً، ص 203)

14 اکتوبر 1999 کو رشید حسن خاں نے پروفیسر حنیف نقوی کے نام ایک مکتوب اور لکھا۔ جس میں اُن چار لفظوں کو نقوی صاحب کی وساطت سے اپنے گوشوارے میں شامل کرنے کی اطلاع دی۔ ساتھ ہی اپنے پاس نامہ ہاے فارسی غالبؔ کے نا ہونے کے بارے میں بھی لکھا۔ اس بارے میں رشید حسن خاں یوں رقم طراز ہیں:

''نامہ ہاے فارسی غالبؔ میرے پاس ہے نہیں، بہت دن ہوئے سرسری طور پر

دہلی میں دیکھی تھی، ذہن میں یہ تھا کہ اُس میں کوئی دستی تحریر نہیں، یا دداشت نے دھکا دیا (حسبِ معمول)۔ آپ کا شکر گزار ہوں۔ اِن چاروں لفظوں کو گوشوارے میں آپ کے حوالے سے درج کیا گیا ہے۔'' (ایضاً،ص 206)

رشید حسن خاں نے پروفیسر حنیف نقوی کو 20 اکتوبر 1999 میں ایک مکتوب رقم کیا۔جس میں قاطع برہان کے علاوہ غالبؔ کے املا پر گفتگو کی گئی ہے۔ساتھ میں خاں صاحب نے نقوی صاحب کا شکریہ (مدد کے لیے) بھی ادا کیا اور گزارش کی کہ اگر آپ کو غالبؔ سے متعلق کوئی کتاب ملے تو فوراً اطلاع دیں۔ لکھتے ہیں:

''آپ نے میرے لیے حسبِ معمول بہت زحمت گوارا کی، مگر اُس عکس سے میرا زیادہ فائدہ ہوا، کئی اور لفظ میرے کام کے مل گئے۔سب سے بڑھ کر یہ کہ تاریخ معلوم ہوئی، اس سے یہ پتا چلا کہ شروع ہی مرزا صاحب اضافی صورت میں ے پر ہمزہ نہیں لکھتے تھے، اِس کی کئی مثالیں ہیں۔جین صاحب کا خط آج ہی ملا۔ ہماری زبان بھی آج ہی آیا، آپ نے دیکھا، ایک صاحب نے اپنے مضمون میں فرمایا ہے کہ ''مرزا محمد حسن قتیل'' وہی ہیں ''جنھوں نے برہانِ قاطع نام کی کتاب لکھی تھی... اور غالبؔ نے ...اِس کا جواب قاطع برہان کے نام سے لکھا تھا۔ نہ مضمون نگار کو ہوش اور شعور اور نہ چھاپنے والوں کو فکر۔ کیا ہوگا معلوم نہیں۔ غالبؔ کی کوئی اور دستی تحریر آپ کی نظر میں ہے؟ جاگیر غالبؔ والی کتاب آپ نے دیکھی ہے؟ اُس میں کوئی دستی تحریر ہے؟ نامہ ہاے فارسی میں کوئی اور تحریر عکسی صورت میں ہے۔'' (ایضاً،ص 207 تا 208)

رشید حسن خاں نے 17 جنوری 2000 میں نقوی صاحب کے نام خط تحریر کرتے ہوئے لکھا کہ اُنھیں نامہ ہاے فارسی غالبؔ کو اُردو میں ترجمہ اسلام آباد سے دستیاب ہوگیا ہے۔لیکن اس کتاب میں مرزا صاحب کا وہ خط شامل نہیں، جو خاں صاحب کے پاس عکسی شکل میں موجود ہے۔اس بات پر حیرانی اور افسوس ظاہر کرتے ہوئے انھوں نے نقوی صاحب سے اصل معاملے کی صورتِ حال جاننے کی کوشش کی۔ لکھتے ہیں:

''ڈاک سے پرسوں ایک کتاب ملی پرتو روہیلا (اسلام آباد) کی، اُنھوں نے ترمذی صاحب کی کتاب نامہ ہای وفا فارسی غالبؔ کا اُردو میں ترجمہ کیا

ہے۔(یعنی فضول کام کیا ہے)۔خیر! میں نے سب سے پہلے یہ دیکھا کہ اُس میں مرزا صاحب کا وہ خطّی دستاویزی خط ہے کہ نہیں جس کا عکس آپ نے بھیجا تھا اور جس سے میں نے کئی لفظ املاے غالبؔ میں درج کیے ہیں۔ایسا کوئی عکسی خط اِس میں شامل نہیں۔اصل کتاب کے متعلق میں نے آپ کو لکھا تھا کہ وہ میرے پاس نہیں۔میں نے املاے غالبؔ میں آپ ہی کے حوالے سے اُس خط کا حوالہ دیا ہے۔ترمذی صاحب کا جو مقدّمہ اس کتاب میں ہے، اُس میں بھی ایسی کسی تحریر کا ذکر نہیں۔اب مجھے ذرا سی تشویش ہوئی۔تو بھائی! فوری طور پر یہ بتائیے کہ صحیح صورتِ حال کیا ہے۔اصل کتاب میں مرزا صاحب کے اُس خط کا عکس شامل ہے؟ ترمذی صاحب نے اپنے مقدّمے میں، یا کہیں اور اُس کا حوالہ دیا ہے؟ چشم براہ ہوں۔'' (ایضاً،ص208)

رشید حسن خاں نے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی سے بھی کلیاتِ اقبال کی تدوین کے ساتھ ساتھ کلامِ غالبؔ کے بارے میں مراسلت کی تھی۔غالبؔ کے حوالے سے ان کا ایک خط 7 جولائی 1997 کو تحریر کیا ہوا ہے۔اس خط میں خاں صاحب نے ہاشمی صاحب کو''املاے غالبؔ پر ایک مضمون لکھنے کی اطلاع دی۔ساتھ میں اس کے کہیں شائع ہونے کے بعد اس کی ایک کاپی ہاشمی صاحب کو ارسال کرنے کی بات کہی گئی ہے۔بعد میں رشید حسن خاں کی ''املاے غالبؔ'' پر باقاعدہ ایک کتاب غالب انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی 2000 اور ادارۂ یادگارِ غالب،کراچی سے 2000 شائع ہوئی۔جب رشید حسن خاں نے اس کتاب کو مرتب کر لیا تو باقاعدہ اس کی اطلاع پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کو 25 دسمبر 1999 میں خط کے ذریعے دی۔موصوف نے مرزا غالب کی دستی تحریروں، غالبؔ کی لفظیات و توضیحات پر بات کرتے ہوئے لکھا:

''املاے غالبؔ کے نام سے ایک کتاب مرتب کر لی۔اِس میں مرزا صاحب کی دستی تحریروں سے الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے کہ وہ کس لفظ کو کیسے لکھتے تھے اور پھر ضروری توضیحات لکھی گئی ہیں۔مجھے یقین ہے کہ آپ اسے ضرور پسند کریں گے۔یہ کتاب چھپنے چلی گئی ہے۔چار چھے ماہ میں آجائے گی۔''

(مکاتیب رشید حسن خاں، بنام رفیع الدین ہاشمی، جون 2009،ص114)

رشید حسن خاں نے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کو 24 اگست 2000 میں مطلع کیا کہ ''املاے غالب بس چھپنے ہی والی ہے۔آپ کے پاس ضرور پہنچے گی۔'' (ایضاً، ص 121) رشید حسن خاں نے 31 اگست 2000 میں ہاشمی صاحب کو پھر اطلاع دی کہ ''املاے غالب جیسے ہی وہاں چھپے گی آپ کے پاس پہنچے گی۔ مشفق خواجہ نے لکھا ہے کہ بس چھپنے ہی والی ہے۔ایک جلد فراقی صاحب کے لیے بھی ضرور آئے گی، میں نے لکھ دیا ہے۔اب تو غالب سے متعلق ہر کتاب اُن کو ضرور ملنا چاہیے۔'' (ایضاً، ص 124) 9 اگست 2004 میں رشید حسن خاں نے ہاشمی صاحب کو اس بات کی اطلاع دی کہ غالب والا کام آخری مرحلے میں ہے۔خاں صاحب نے ہاشمی صاحب کو 30 اگست 2004 میں لفظیاتِ غالب سے متعلق ایک خط تحریر کیا، جس میں غالب والے کام کی نوعیت اور صورتِ حال پر تذکرہ کیا گیا ہے۔اس بارے میں رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

> ''لفظیاتِ غالب کا بنیادی کام قریب الختم ہے، مگر اُس کے بعد نظرِ ثانی کا کام شروع ہوگا اور اُس میں بھی کچھ وقت لگے گا۔ بڑا کام ہے یہ اور میں تنِ تنہا۔ایسا بھی تو کوئی نہیں جس سے دو سطریں پڑھوالوں یا نقل کرالوں۔ یہ کام کمپیوٹر کی مدد کا متقاضی تھا، مگر سخت جانی اُس کا بدل بن گئی۔آپ یہ دیکھیے کہ 25,26 ہزار کارڈ بنانا کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے (لائبریری کارڈ تو بہت مہنگے ہوتے ہیں) پھر اُن کو ترتیب سے لگانا، نمبر شمار ڈالنا، نقل کرنا اور ہر بار اصل سے مقابلہ کرنا اور صحت کا یہ احوال کہ: دم لینے سے گھبرا جائے۔ بہ ہر طور احباب کی ہمت افزائی اور محبت شریکِ خیالات رہی اور یوں تقویت کا آبِ حیات ملتا رہا اور ان سب پر مستزاد آپ کی پُر خلوص دُعائیں اور گہرا تعلقِ خاطر۔ ہندستان کی کسی بھی زبان میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا کام ہوگا۔'' (ایضاً، ص 145)

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے نام 31 اکتوبر 2004 کو خط تحریر کرتے ہوئے رشید حسن خاں نے گنجینۂ معنی کا طلسم کے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ انھوں نے الفاظ کو مرکب اور مفرد طریقے سے سامنے رکھا ہے۔بار بار آنے والے الفاظ کی نشان دہی کی گئی ہے۔اور حاشیے میں ہر لفظ کی تعداد کو لکھا گیا ہے۔اس بارے میں رشید حسن خاں رقم طراز ہیں:

> ''میں نے ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' کی رعایت سے الفاظ کو مفرد اور مرکب کی

مناسبت سے سامنے رکھا تھا، تاکہ بہ یک نظر لفظ کے طریق استعمال اور اُس کی معنویت کی آئینہ داری ہو جائے۔ اصل دیوان کی ورق گردانی نہ کرنا پڑے اور یہ بھی سامنے آ جائے کہ وہ کون سے الفاظ ہیں جو بار بار آئے ہیں اور کن کن معنوی رعایتوں کے ساتھ آئے ہیں۔ حاشیے میں ہر لفظ کی تعداد اور مرکب و مفرد کی وضاحت بھی کی تھی، کہ فلاں لفظ اِتنی بار آیا ہے؛ مگر د اِتنی بار اور مرکّب اِتنی بار۔''

(ایضاً، ص 147 تا 148)

رشید حسن خاں نے 8 جون 2005 کو ہاشمی صاحب کو خط تحریر کرتے ہوئے گنجینۂ معنی کا طلسم کو اپنی زندگی میں ہی مکمل ہونے کی بات سوالیہ نشان کے ساتھ لکھی۔ یہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ خاں صاحب اپنی زندگی کے ایام کو بھانپ گئے تھے کہ اب اُن کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:

''الفاظ، غالبؔ سے متعلق کتاب (گنجینۂ معنی کا طلسم) کی کمپوزنگ ایک صاحب دہلی میں کر رہے ہیں۔ اب تک صرف 109 صفحے ہو پائے ہیں، معلوم نہیں میری زندگی میں مکمل ہو گی بھی؟'' (ایضاً، ص 157)

اگر رشید حسن خاں کو کوئی ادبی شخص اُن کی تحریری غلطی کی جانب راغب کرتا تو موصوف بلا تامّل تحریر میں اصلاح اور اس کا شکریہ بھی ادا کرتے۔ ڈاکٹر صابر سنبھلی کے نام (یکم نومبر 1996 اور 7 نومبر 1996) ایسے دو خط رشید حسن خاں نے تحریر کیے جس میں انھوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا۔ لکھتے ہیں:

''غالبؔ کے جس شعر کا حوالہ آپ نے اُردو املاص 297 کے واسطے سے دیا ہے، وہ مولّفِ نور اللغات کا تسامح ہے۔ شعر دراصل حالؔی کا ہے۔ اگر میں اس کی نشان دہی حاشیے میں کر دیتا تو شاید بہتر ہوتا۔ یہ شعر دیوانِ حالؔی میں موجود ہے۔''

دوسرے خط میں لکھا:

''متعلقہ شعر غالبؔ کا نہیں، حالؔی کا ہے اور دیوانِ حالؔی میں موجود ہے۔ مجھے حاشیے میں اِس کی وضاحت کر دینا چاہیے تھی، جو رہ گئی۔''

(رشید حسن خاں کے خطوط جلد دوم، 2015، ص 364)

رشید حسن خاں نے اسلم محمود کے نام 8 دسمبر 2001 کو لکھے خط میں مرزا غالبؔ کے مذہب پر

روشنی ڈالی ہے۔اسلم محمود کو خاں صاحب نے حوالوں کے ساتھ بتایا کہ مرزا غالبؔ کا مذہب شیعہ تھا اور شیعوں کو اثنا عشری بھی کہا جاتا ہے۔کیوں کہ اثنا عشری،عربی میں بارہ کو کہتے ہیں۔مرزا غالبؔ کے خطوط کے حوالوں سے ان کے مذہب اور اثنا عشری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''آپ کے خط کا جواب کل بھیج چکا ہوں۔بعد کو خیال آیا کہ دو باتیں تو رہ گئیں۔1۔12 کا ہندسہ پُرانی خطّی اور بعض مطبوعہ تحریروں میں انگریزی علامتِ ختم جملہ ڈیش (۔) کے طور پر مستعمل رہا ہے۔یہ عددی علامت ہے لفظ''حد'' کی۔''حد'' کے عدد 12 ہیں (ح:8۔د4) ۔مرزا غالبؔ نے ایک خط میں اِس کی تفریحاً ایک بات پیدا کی ہے۔مرزا صاحب شیعہ تھے،شیعوں کو اثنا عشری بھی کہا جاتا ہے،یوں کہ یہ بارہ اماموں کو مانتے ہیں۔اثنا عشری عربی میں بارہ کے لیے آتا ہے۔(اثنا:دو۔عشر:دس)مرزا صاحب نے لکھا ہے:بندہ اثنا عشری ہوں،ہر مطلب کے خاتمے پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہوں''(مکاتیبِ غالبؔ،مرتبہ عرشی صاحب،ص223)۔''

(رشید حسن خاں کے خطوط، 2011،ص 224 تا 225)

رشید حسن خاں نے پروفیسر اصغر عباس کے نام ایک طویل خط بغیر تاریخ کے تحریر کیا۔اس خط میں غالبؔ والے کام کو جلد مکمل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے۔دراصل خاں صاحب گنجینۂ معنی کا طلسم کے بارے میں تفصیلات بیان کر رہے ہیں۔لکھتے ہیں:

''میں آج کل غالبؔ کے مکمل کلامِ نظم اُردو کے الفاظ کا توضیحی اشاریہ مرتب کر رہا ہوں۔آدھے سے زیادہ کام مکمل ہو چکا ہے۔دعا کیجیے کہ یہ طول طویل اور اُلجھا ہوا کام مکمل کر سکوں۔یہ ہندوستان کی کسی بھی زبان میں کسی بڑے شاعر کے مکمل کلام کا پہلا توضیحی اشاریہ ہوگا۔''(ایضاً،ص 257)

رشید حسن خاں 10 اپریل 2001 میں ڈاکٹر ٹی.آر.رینا کے نام ڈھائی صفحات کا ایک خط املا سے متعلق تحریر کیا۔اس خط میں انھوں نے رینا صاحب کو املا کی درستگی کے لیے مرزا غالبؔ کے املا اور جدید املا کے مابین فرق کو واضح کیا۔خط میں،رشید حسن خاں نے واضح کیا کہ فارسی اور اُردو میں لفظوں کی ہیئت کیسے تبدیل ہو جاتی ہے اور پھر ان کے معنی و مطالب بھی کیوں کر بدل جاتے ہیں،ان تمام امور پر رشید حسن

خاں ایک مشفق اُستاد کی مانند رہنمائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں اس خط کے چند اقتباسات پیش کر رہا ہوں:

''مرزا صاحب جن باتوں کو مانتے تھے، اُنھیں درست سمجھ کر مانتے تھے، یوں اپنی راے پر اصرار کرتے تھے۔ اس کا تعلق ''زور دے کر منوانے'' سے نہیں۔ مرزا صاحب یہ مانتے تھے کہ فارسی میں ہم آواز حروف نہیں، اِس بنا پر وہ یہ کہتے تھے کہ ذ اور زے ہم آواز حروف ہیں، وہ بھی نہیں ہو سکتے۔ ہم آواز عربی زبان کی خصوصیت ہے۔ یہ ان کی راے تھی، وہ زندگی بھر اسی کو مانتے رہے۔ یہ علمی بحث ہے، مرزا صاحب کی اس راے سے اختلاف کیا گیا ہے، لیکن مرزا صاحب کے کلام میں الفاظ مرزا صاحب کے طریقِ نگارش کے مطابق لکھا جائے گا۔ مرزا صاحب کے کلام میں آگ کے معنی ''آدر'' ہی لکھا جائے گا، ''آذر'' نہیں۔ جب کہ دوسرے لوگوں کے کلام میں آذر اِس معنی میں آ سکتا ہے۔ یا جیسے گذشتن، گزاشتن سے بننے والے فعل سب اصلاً ذال سے ہیں، مگر مرزا صاحب یہ مانتے تھے کہ ان میں زے ہے۔ اُن کے کلام میں گزشتہ ہی لکھا جائے گا، ویسے گذشتہ لکھا جاتا ہے۔ گذاردن میں ذال اور زے سے جو فرق معنی پیدا ہوگا، اُس کا تعلق عام لکھاوٹ سے ہے، مرزا صاحب کے کلام میں طریقِ نگارش سے نہیں اِسی فرق کو لازماً ذہن میں رکھا جائے گا۔

ذرا، ذرّہ ہی کی دوسری صورت ہے۔ ذرّہ سی بات بہ معنی چھوٹی سی بات پرانے شعرا کے یہاں بہت ملتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ استعمال بدل گیا اور اب عموماً ذرا لکھا جاتا ہے، معنی وہی ہیں۔ اصل لفظ تو ذرّۃ ہے، اُس سے فارسی میں ذرّہ بنا اور اسی سے اُردو میں ذرا بن گیا۔ معنی ہر جگہ ایک ہی رہے۔ چوں کہ ذرا اُردو میں بنا ہے، یوں مولوی نذیر احمد، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، بعض اور لوگ بھی اور مرزا صاحب بھی اِسے زرا لکھتے تھے۔ یہ اختلاف ہے، اُن لوگوں کی تحریروں میں اِسی کا پابندی کی جائے گی۔ عام تحریر میں ذرا ہی لکھا جائے گا۔

تم نے ذرّہ اور زِرہ میں گڑبڑ کی ہے۔ زرہ دوسرا لفظ ہے، اس کا ذرّہ سے دور کا

بھی تعلق نہیں۔ تاریخ گوئی میں بھی مرزا صاحب عربی لفظوں میں ذال لکھنے کے قائل تھے، عام تحریر کی طرح ؛ فارسی لفظوں میں نہیں لکھتے تھے، اِس لیے اعدادِ تاریخ کا جھگڑا پیدا ہی نہیں ہوتا۔

دال کی جگہ ذال یا زے لکھنے سے عروض میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ یہ تم نے عجیب سوال کیا ہے۔ ارے بھائی! آدر اور آذر کا وزن ایک ہے، پھر عروضی فرق کیوں پیدا ہونے لگا۔ فارسی میں ذال موجود تھا، اس پر بہت بحث ہو چکی ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مرزا صاحب اسے نہیں مانتے تھے اس اصول کی بنا پر کہ کوئی اور ہم آواز حروف فارسی میں نہیں تو ذ اور زے بھی نہیں ہو سکتے۔ یہاں صحیح غلط کی بحث نہیں۔ بحث یہ ہے کہ مرزا صاحب اِس بات کو مانتے تھے اور اُن کے زمانے میں بعض اور اہلِ علم بھی اِس کو مانتے تھے جن میں بعض لُغت نویس بھی تھے۔ اِس مسئلے کو اسی روشنی دیکھنا چاہیے۔ ''مرزا صاحب اڑے ہوئے تھے'' یہ غیر علمی اندازِ گفتگو ہے۔ مرزا صاحب اس بات کو مانتے تھے اور اِس کا اُن کو حق حاصل تھا۔ ہم نہیں مانتے اور اِس اختلاف کا حق ہم کو حاصل ہے۔ علمی مسائل میں ہمیشہ اختلاف رہے ہیں اور رہیں گے۔ یہ تمھاری نِری غلط فہمی ہے کہ مرزا صاحب کسی احساسِ کم تری کا شکار تھے۔ وہ جینیس تھے اور اُن کی ذہنی رفعت اِن عام اور عامیانہ باتوں سے بلند تر تھی۔

مرزا صاحب ہندستانی فرہنگ نگاروں کو مستند نہیں مانتے تھے، یوں وہ انشا کو کیا مانتے۔ کاغذ کو یوں مان لیا کہ اُن کی رائے میں یہ مفرّس ہو چکا تھا۔ اِس پر اُنھوں نے بحث بھی کی ہے۔ اس کی عربی جمع کواغذ بھی رائج ہو چکی تھی۔ دوسرے لفظوں کی یہ صورت نہیں تھی۔

بعض دفعہ تم بڑی اوٹ پٹانگ بات لکھتے ہو۔ ارے بھائی! مرزا صاحب کے زمانے میں انگریزی لفظوں نے زیادہ رواج نہیں پایا تھا۔ میر امّن نے ہر جگہ ''لارڈ'' لکھا ہے۔ اُن کی زبان پر جو لفظ جس طرح تھا، اُنھوں نے اُسی طرح لکھا۔ اس میں دیسی

اور بدیسی زبان کی بحث تم خواہ مخواہ لے آئے۔ مرزا غالبؔ ہی نہیں، اُس زمانے کے بعض اور لوگ بھی انگریزی لفظوں کو اُس طرح نہیں لکھتے تھے جس طرح ہم آج لکھتے ہیں۔ یہ چلن کا مسئلہ ہے، جب چلن بڑھا تو لفظوں کی شکلیں درست ہونے لگیں۔'' (ایضاً ص300 تا302)

رشید حسن خاں کے ڈاکٹر خلیق انجم سے دوستانہ مراسم تھے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ان کی زیادہ تر کتابوں کو انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، سے شائع کرایا تھا۔ اس نسبت اور ذاتی تعلقات کی بنا پر خاں صاحب نے ان سے دیوانِ غالبؔ کے تصحیح اڈیشن کے بارے میں رائے مانگی تھی۔ دیوانِ غالبؔ کے اس نسخے کی تدوین و تصحیح کے لیے خاں صاحب عرشی صاحب کے نسخے کو بنیاد بنانا چاہتے تھے۔ لیکن اُس زمانے کی کتابت ان کے سامنے ایک بڑا مسئلہ تھا۔ رشید حسن خاں نے 24 جولائی 1986 کو ڈاکٹر خلیق انجم کے نام لکھے خط میں ان تمام مسائل پر تفصیلی گفتگو کی۔ لکھتے ہیں:

''میں نے آپ کو دو خط لکھے تھے، ایک دیوانِ غالبؔ کے بارے میں اور ایک آپ کی تجویز کی ہوئی دوا کی بے اثری کے بارے میں؛ جواب صرف ایک خط کا ملا ہے۔
دیوانِ غالبؔ کے ذیل میں غالباً میں اپنی بات صحیح طور پر پیش نہیں کر سکا۔ مقصد اُس کی تدوین نہیں، اُس کی صحیح معنی میں تصحیح سے تھا۔ یہ بات قدرتی ہے کہ اگر میرا نام تصحیح کے ساتھ کسی طرح بھی شامل ہے، یعنی کہنے کو یہ بات ہے کہ میں نے اصل نسخے کی تصحیح کی ہے تو اُس صورت میں میری یہ خواہش ہوگی کہ تصحیح مکمل ہو، ادھوری نہ ہو۔ آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اُس کا مقصد تو میں یہ سمجھا ہوں کہ نگیٹو جو موجود ہیں، اُن پر تصحیح کرائی جائے گی۔ جب کہ میرا خیال یہ تھا کہ تصحیح اُن مطبوعہ اوراق پر ہوگی اور جب کاتب صاحب چیپیاں لگا چکے ہوں گے، تب میں اپنی نظر سے اُن کاپیوں کو ایک بار پھر دیکھوں گا کہ جس قدر تصحیح بنائی گئی تھی مطبوعہ صفحات پر، وہ سب بن گئی ہیں کہ نہیں۔ اور یوں جب مجھے اطمینان ہو جائے گا، تب میں اُن اوراق کو پریس بھیجنے پر صاد کروں گا۔ تصحیح کا احوال یہ ہے کہ وہ اُس طرح نہیں بن سکتی جس طرح آپ نے لکھا ہے۔ چوں کہ خط باریک ہے، اس لیے بیسیوں مصرعے پورے کے

پورے ازسرِ نو لکھنا ہوں گے۔ میں نے پنکچو یشن کے لیے نسخۂ عرشی (طبع اوّل) کو معیار اور مثال بنایا ہے، اس میں سب سے بڑا مسئلہ کا ما کا ہے اور اُن مطبوعہ اوراق میں کتابت اس قدر گھنی ہے کہ بہت سے مقامات پر کا ما لگ ہی نہیں سکتا جب تک پورے ٹکڑے کو ازسرِ نو نہ لکھا جائے۔ ظاہر ہے کہ میں نا تمام تصحیح میں حصہ نہیں لے سکتا۔ اب فیصلہ آپ کر لیجیے۔ آپ کا جی چاہے تو نگیٹو سے اُسی طرح چھاپ لیجیے جس طرح وہ چھپا ہے، اور جی چاہے تو باضابطہ تصحیح کرایے۔ رائے میری یہی ہے کہ آپ ایک کاتب کو بٹھا کر مطبوعہ اوراق پر تصحیح بنوایئے، مکمل طور پر، اور جب یہ تصحیح بن جائے، تب ازسرِ نو اس کے نگیٹو تیار کرایے اور تب اسے چھپوایئے۔ اگر صحیح متن مطلوب ہو تب یہی کرنا ہوگا۔ ادبی کمیٹی کو اس پر اعتراض بھی نہیں ہوگا۔ اب آپ کی جیسی رائے ہو، مطلع کیجیے۔'' (ایضاً، ص366 تا 367)

رشید حسن خاں گنجینۂ معنی کا طلسم (فرہنگ دیوانِ غالبؔ) کو ہر حال میں مکمل کرنا چاہتے تھے۔ اس کی تیاری میں وہ ہر وقت ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، کے کاتب عبدالرشید اس کی کتابت کر رہے تھے۔ لیکن کاتب کے کمپیوٹر کی خرابی نے رشید حسن خاں کے اس عظیم الشان کارنامے کو شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیا۔ خاں صاحب اس کام کو اپنی زندگی میں مکمل کرنا چاہتے تھے۔ بعض دوسری ادبی سرگرمیوں کے سبب اس میں تاخیر ہوتی گئی۔ اس طرح یہ کام ادھورا ہی رہ گیا۔ رشید حسن خاں نے اپنی وفات سے 4 مہینے قبل یعنی 28 اکتوبر 2005 کو ڈاکٹر خلیق انجم کے نام دیوانِ غالبؔ کے متعلق ایک خط تحریر کیا، جس میں کاتب کے کمپیوٹر کی خرابی اور غالب والے کام کو ملتوی کرنے کے اپنے ارادے سے مطلع کرتے ہوئے لکھا:

''کل عبدالرشید صاحب کا مفصّل خط کو ریر سے ملا، اُسی کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ بات یہ کہ انجمن میں صرف وہی ایک شخص ہیں جو کمپوزنگ کا کام کر سکتے ہیں اور انھوں نے اطّلاع دی ہے کہ اُن کے گھر کا کمپیوٹر بگڑ گیا ہے جو دو ڈھائی مہینے سے پہلے سنبھل نہیں پائے گا۔ اُن کا سارا دن ہماری زبان اور اُردو ادب میں صرف ہو جاتا ہے۔ اِسی لیے اُنھوں نے غالبؔ والے کام کو روک دیا ہے، کمپیوٹر ہی نہیں تو کام کیسے ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جب کمپیوٹر ٹھیک ہوگا تبھی کام

شروع ہوگا اور جب وہ مطلع کریں گے اور غالبؔ والے صفحات بھیجنا شروع کریں گے، تبھی اگلا پروگرام بنایا جائے گا۔ اِس میں 6-7 مہینے ضرور لگیں گے یہ میرا خیال ہے۔ غالبؔ والے کام کو سال ڈیڑھ سال ہو گیا ہے یوں پہلے اُسی کا مکمل ہونا ضروری ہے۔'' (ایضاً،ص 394 تا 395)

رشید حسن خاں دیوانِ غالبؔ کی طباعت کے لیے بہت فکر مند تھے۔ اس کے معیار سے انھیں سمجھوتہ بالکل پسند نہیں تھا۔ غالبؔ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے ڈائریکٹر شاہد ماہلی کے نام 21 مئی 1986 کو لکھے خط سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ ساتھ میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خاں صاحب نے غالبؔ نمبر کے لیے ایک مضمون بھی تحریر کیا تھا، لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ یہ مضمون ادبی لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہے۔ جب میں نے ڈاکٹر ٹی. آر. رینا سے اس بابت معلوم کیا تو انھوں نے صرف غالبؔ صدی اڈیشن پر خاں صاحب کے لکھے مضمون کی بات کہی۔ بہر کیف! اس مضمون کی تلاش جاری ہے۔ رشید حسن خاں نے اس خط میں لکھا:

''(1) آپ نے کہا تھا کہ دیوانِ غالبؔ کا کاغذ پریس پہنچ گیا ہے۔ توقع کرتا ہوں کہ طے شدہ طریقِ کار کے متعلق آپ نے دو طرح کا کاغذ خریدا ہوگا۔ ایک ہزار نسخوں کے لیے دبیز سفید کاغذ، جو امیر خسرو والی انگریزی کتاب میں لگا ہے اور باقی چار ہزار کے لیے وہ کاغذ جو عموماً انسٹی ٹیوٹ کی کتابوں میں لگا ہے۔

(2) دیوان کی قیمت -/20 مناسب نہیں، 15/ روپے ہونا چاہیے۔

(3) یادگارِ غالبؔ کی قیمت بھی -/60 بے جا ہے۔ اس کی تو کتابت ہوئی نہیں، اس لیے اس کی قیمت 40 یا 45 سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ ساٹھ روپے زیادہ ہیں اور بہت زیادہ۔

(4) غالبؔ نمبر کے لیے چوں کہ باقی مضامین کی کتابت تو ہوگی، اِس لیے مناسب یہی ہوگا کہ میرے مضمون کی بھی کتابت کرا لیجیے، جوڑ پیوند کیوں لگائے جائیں۔'' (ایضاً، ص 649)

رشید حسن خاں نے لفظیاتِ غالبؔ کے سلسلے میں اپنے ادبی دوستوں سے خوب مشورے کیے۔ تاکہ ایک

ایک لفظ پر مفصل بحث ہو جائے اور کسی بھی طرح کا شائبہ نہ رہے۔وہ چاہتے تھے کہ جب غالبؔ کے کلام کی فرہنگ منظرِ عام پر آئے تو اس میں اغلاط کی گنجایش باقی نہ رہے۔اسی مقصد کے تحت رشید حسن خاں نے یک شنبہ 22اگست 1999 کو پروفیسر ظفر احمد صدیقی کے نام چھے صفحات پر مشتمل ایک طویل خط تحریر کیا۔اس خط میں کلامِ غالبؔ کے املا اور غالبؔ نے جن فارسی لفظوں کو اپنے خطوط میں استعمال کیا، پر مفصل بحث ہے۔اس خط کو پڑھ کر رشید حسن خاں کی غالبؔ شناسی کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔کہ کیسے انھوں نے ایک ایک لفظ کو مع حوالوں کے پیش کیا ہے۔میں اس طویل خط میں سے جگہ جگہ سے صرف خاص اقتباسات ہی نوٹ کر رہا ہوں:

''بنا بر انسب یہ ہوگا کہ جب دونوں اجزا کو منفصل لکھا جائے ،تو الف لکھا جائے (قوافی کی مجبوریوں سے قطع نظر،ایسے قوافی جن کا حوالہ مرزا صاحب نے دیا ہے تفتہؔ کی غزل کے واسطے سے)جیسے :وعظ است،گفتار است ،کردار است۔جب ایسے اجزا کو متصل لکھا جائے گا ،جیسے دلست،خوبست ،نہا نست (وغیرہ)تو ظاہر ہے کہ الف شاملِ کتابت نہیں ہوگا۔

اصطبل:مرزا صاحب نے اس لفظ کو مع س لکھا ہے:''خود جہاں اسطبل تھا،وہاں بیٹھے ہیں''(عکس مکتوب بہ نام حسین مرزا۔غالبؔ کے خطوط،ص 676)

اسٹیشن:مکتوبِ غالبؔ بہ نام نوّاب کلب علی خاں،مرقومہ18دسمبر 1866میں یہ لفظ تین بار آیا ہے اور مرزا صاحب نے اسے بالالتزام سین کے ساتھ لکھا ہے(عکسِ مکتوب ہٰذا،غالبؔ کے خطوط،ص 1215)پنسن (پنشن)اور اسٹیسن (اسٹیشن)ان دونوں لفظوں کو اُنھوں نے بالالتزام اسی طرح (مع سینِ مہملہ)لکھا ہے،اس بنا پر کلام غالبؔ میں التزام کے ساتھ ان لفظوں کے اِسی املا کو اختیار کیا جائے گا۔

اسی طرح پورے خط میں مرزا غالبؔ کے فارسی اور اُردو لفظوں پر مع مثالوں کے علمی گفتگو ہے۔اب میں صرف خط کے آخری صفحے کا ایک مختصر سا پیرا گراف نقل کر رہا ہوں۔میری کتاب میں املاے غالبؔ پر ایک تحریر ہے، یہ اُسی سلسلے کا ہے، کہ غالبؔ کی خطّی تحریروں سے اہم الفاظ منتخب کیے جائیں اور اُن کا گوشوارہ

بنایا جائے؛تا کہ کلامِ غالبؔ کی تدوین میں یکسائی املا رہے۔یہ جائزہ صرف مرزا صاحب کی خطّی تحریروں سے مرتّب کیا جائے گا،مطبوعہ سے بحث نہیں کی کہ اُن میں تو کاتب کا املا ملتا ہے۔''(رشید حسن خاں کے خطوط،2011،ص 706تا710)

رشید حسن خاں نے کلامِ غالبؔ اور مضامینِ غالبؔ کے لیے رات دن ایک کیا ہوا تھا۔ایک زمانے میں انھیں اس کام کے علاوہ کسی اور کام کی جانب توجہ نہیں تھی۔کیوں کہ انھوں نے اس کام کو دل و جان اور خونِ جگر سے سینچا تھا۔ان باتوں کی وضاحت عبدالرزاق قریشی کے نام 7دسمبر 1968 کو لکھے خط سے ہوتی ہے۔اس خط میں انھوں نے اس بات کا اشارہ کیا تھا کہ دیوانِ غالبؔ کی تکمیل ان کی سب سے بڑی تمنّا ہے۔لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔اس بارے میں رشید حسن خاں نے لکھا:

''یہ مرزا غالبؔ تو واقعی مصیبت بن گئے ہیں۔بقول شخصے:شامت اعمال صورت غالبؔ گرفت۔بھائی مضامین کا یہ سلسلہ میں نے دل لگا کر شروع کیا تھا اوراس کی تکمیل میری سب سے بڑی تمنا ہے۔بہت کچھ کہنے کے لیے ابھی باقی ہے لیکن آج کل یہاں غالبؔ پرستی کے طوفان میں گھرا ہوا ہوں کہ فرصت کے لمحات عنقا ہے۔صبح سے شام بل کہ رات گئے تک یہی مصیبت رہتی ہے۔''

(ایضاً،ص738)

رشید حسن خاں نے عبدالوہاب خاں سلیم کے نام ایک خط،22اگست 2005 میں لکھا کہ''غالبؔ والے کام کی کمپوزنگ ہورہی ہے اور تصحیح بنانا چاہتا ہوں،غالباً سال بھر میں وہ مکمل ہوجائے گا اور کتاب پریس میں چلی جائے گی۔''(ایضاً،ص743)پروفیسر علی احمد فاطمی نے جب رشید حسن خاں سے غالبؔ کے اوپر مضامین لکھوانے کی خواہش ظاہر کی تو موصوف نے 11مارچ 1998 کو خط لکھتے ہوئے بتایا۔''غالبؔ پر مضمون ضرور لکھوں گا،وعدہ کیا ہے تم سے،مگر جب تم غالبؔ نمبر نکالو گے،یا وہاں کسی مذاکرے کا انتظام کروگے۔اب کسی لکھنے کے لیے کسی تقریب یا بہانے کی ضرورت ہوتی ہے۔''(ایضاً،ص752)اسی طرح خاں صاحب نے یعقوب میراں مجتہدی کے نام 18اکتوبر 1999 میں مکتوب لکھتے ہوئے لفظیاتِ غالبؔ سے متعلق کام کی نوعیت کے بارے میں مطلع کیا:

''آج کل میں مرزا غالبؔ کی دستی تحریروں سے الفاظ کا گوشوارہ بنا رہا ہوں کہ اُنھوں نے اپنے قلم سے کس لفظ کو کس طرح اور کس کس طرح لکھا ہے۔اس کے سو صفحے مکمل کر لیے ہیں۔شاید اگلے مہینے کے آخر تک یہ کام مکمل ہو جائے گا۔''(ایضاً،ص 1035)

عبدالوہاب خاں سلیم کے نام ایک اور خط رشید حسن خاں نے 8 ستمبر 2005 کو تحریر کیا۔اس خط میں غالبؔ والے کام کے شروع کے حصے کی کمپوزنگ مکمل ہونے اور اس کی تصحیح کرنے کی بات تحریر کی۔ساتھ ہی عبدالوہاب خاں سلیم کی آواز کو بار بار سننے کی خواہش بھی ظاہر کی۔اس بارے میں رشید حسن خاں رقم طراز ہیں:

''غالب سے متعلق میری کتاب گنجینۂ معنی کا طلسم کے شروع کے حصے کی کمپوزنگ مکمل ہوگئی۔کل ہی مجھے یہ پیکٹ ملا ہے تصحیحات بنانے کے لیے۔میں اپنے مقدمے کے آخری صفحے کا عکس آپ کے پاس ملاحظے کے لیے بھیج رہا ہوں۔یوں کہ پوری کتاب چھپنے میں تو سال ڈیڑھ سال لگ جائے گا،آپ کو یاد کرتا رہتا ہوں۔فون پر ایک دن آپ کی آواز کئی بار سُنی۔''

(مکاتیب رشید حسن خاں، بنام رفیع الدین ہاشمی، جون 2009 ص 182 تا 183)

رشید حسن خاں نے پروفیسر سید عقیل رضوی کے نام 11 ستمبر 2003 کو لکھے خط میں اس بات کی تصدیق کی کہ لفظیاتِ غالبؔ پر کام تیزی سے ہو رہا ہے اور 17 ہزار کارڈ اب تک بن چکے ہیں۔ان کے مطابق یہ کام اُردو میں پہلی مرتبہ ہو رہا ہے اور یہ کام سال بھر میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔اس کام کو خاں صاحب تنقید کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے تھے۔تاکہ یہ کام اعلا پایے کا ہو۔اس بابت انھوں نے لکھا:

''لفظیاتِ غالبؔ پر کام ہو رہا ہے۔تقریباً سترہ ہزار کارڈ بنا چکا ہوں۔کلیاتِ نظم اُردو میں مستعمل جملہ الفاظ کا گوشوارہ بنے گا،مع امثلہ۔مقصد یہ ہے کہ تنقید کے نقطۂ نظر سے اس کا تجزیہ کیا جا سکے کہ کن لفظوں کو مرزا صاحب نے کن کن جہتوں سے استعمال کیا ہے۔مثلاً ان کے کلیدی الفاظ میں ''آئینہ (آئنہ) بھی ہے،بہ یک نظر یہ بات سامنے آ سکے کہ ان کے یہاں یہ لفظ کتنی جگہ آیا ہے اور کن معنوں کے ساتھ آیا ہے۔ہر اندراج کے ساتھ مثال کا شعر بھی ہے،تاکہ دیوان

نہ دیکھنا پڑے (نسخۂ عرشی اب ملتا بھی کہاں ہے)۔میرا خیال ہے کہ یہ کام اُردو میں (اور میری معلومات کی حد تک ہندستان کی کسی بھی زبان میں) پہلی بار ہو رہا ہے۔خیال ہے کہ سال بھر میں مکمل ہو جائے گا۔ہاں صاحب تنقیدی نقطۂ نظر سے یہ کسی کام آئے گا؟''(رشید حسن خاں کے خطوط،2011،ص872)

خاں صاحب نے پروفیسر مختارالدین آرزو سے 11جون 1993 میں اس بات کا مشورہ کیا کہ انتخابِ غالبؔ کا جو اصل نسخہ ڈاکٹر صدیقی مرحوم کے پاس تھا،ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے نے انھیں دے دیا ہے،اسے کیا اصل حالت میں شائع کرنا چاہیے یا نہیں۔اس انتخاب میں مالک رام کے ہاتھ سے لکھا مقدمہ اور حواشی صدیقی مرحوم کے لکھے ہوئے تھے۔اس کی کتابت صدیقی مرحوم نے اصل کے مطابق کرائی تھی۔ان تمام امور پر پروفیسر مختارالدین کی رائے رشید حسن خاں کے لیے اہمیت کی حامل تھی۔لکھتے ہیں:

''اب ایک مشورہ:آپ کو معلوم ہوگا کہ انتخابِ غالبؔ کا اصل نسخہ ڈاکٹر صدیقی مرحوم کے پاس تھا۔وہ اُس کو مرتب کر کے چھاپنا چاہتے تھے۔مگر چھاپ نہ سکے اور اُن کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے نے اب وہ سب کاغذ میرے پاس بھیج دیے ہیں۔ان میں ڈاکٹر صدیقی مرحام کے لکھے ہوئے حواشی ہیں اور مالک رام صاحب کا لکھا ہوا مقدمہ ہے۔یہ سب کتابت شدہ ہیں۔متن کی کتابت بھی ہو چکی تھی بہت پہلے مرحوم کی زندگی میں۔مگر یہ سب بٹر پیپر پر ہے۔خیر،آپ یہ بتائیے کہ کیا اِس مُخّر رمجموعے کو چھپنا چاہیے؟مرحوم نے متن کی کتابت اصل نسخے کے مطابق کرائی تھی یعنی اُسی املا میں۔یہ اب اُلجھن میں ڈالنے والی چیز بن جائے گی،اس کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے۔کیا رضاؔ صاحب نے اِسے شائع کر دیا ہے؟میں نے اُسے نہیں دیکھا۔بہ ہر صورت سارے اُمور کو پیش نظر رکھ کر اپنے مشورے سے نوازیے۔''(ایضاً،ص880 تا 881)

رشید حسن خاں سے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں بہ ذریعہ خط و کتابت املا کے مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔خاں

صاحب بھی ممتاز صاحب کو اپنے بیش قیمتی ادبی مشوروں سے نوازتے تھے۔اسی کڑی میں موصوف نے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کے نام 3فروری 1980 کو املا کے موضوع پر ایک مفصل خط تحریر کیا جس میں شعر و شاعری کے ذریعے املا کی باریکیوں کو عالمانہ انداز میں سمجھایا گیا ہے۔اسی خط میں غالبؔ کے املا پر بھی بحث کی گئی ہے تاکہ جو باتیں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے معلوم کی تھیں اُن کی وضاحت ہو جائے۔اس سے قبل یہ بحث پروفیسر نقوی سے بہ ذریعہ خط ہو چکی تھی۔ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کو رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

> ''غابؔ کے عہد تک فصحائے دہلی''واں''اور''یاں''کو غیر فصیح کہتے تھے اور ان کے بجائے ''یہاں''اور''وہاں''کو فصیح مانتے تھے۔غالبؔ نے ایک خط میں نہایت وضاحت بل کہ سختی کے ساتھ،اصلاح دیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ''واں''جب شعر میں نہ آئے تو اس کا مخفف''وہاں''بہ ہائے مخلوط التلفظ ہوگا۔''واں''نہیں ہوگا۔یہ بے امتیازی تو اِس زمانے میں ہوئی ہے کہ ہم شعرائے دہلی کے یہاں''واں''اور''یاں''لکھتے اور پڑھتے ہیں۔آپ یادگارِ غالبؔ کا پہلا اڈیشن دیکھیے۔مولانا حالیؔ نے التزام کے ساتھ اشعارِ غالبؔ میں ایسے مواقع پر''وہاں''اور''یہاں''لکھا ہے ہر جگہ۔یا آپ مولانا آسی کا مرتبہ کلیاتِ میرؔ اُٹھا لیجیے۔آپ دیکھیں گے کہ اس میں ہر جگہ''وہاں''اور''یہاں''ہوگا۔ایک جگہ بھی''واں''اور''یاں''نہیں ملے گا۔''(ایضاً،ص923)

رشید حسن خاں کے خطوط اس کے شاہد ہیں کہ غالبؔ سے متعلق تمام باتوں کو لکھ کر ارسال کرتے تھے۔اگر کسی نے بھی ان سے غالبؔ کے حوالے سے کوئی بات معلوم کرنا چاہی تو بلا تامل فوراً خط لکھتے اور اس کو غالبؔ سے متعلق مزید معلومات فراہم کرتے۔اسی سلسلے میں جب ڈاکٹر وہاب قیصر (مولانا آزاد نیشنل اُردو یونی ورسٹی،حیدرآباد) نے اپنی کتاب''سائنس اور غالبؔ''کے لیے مواد کی فراہمی اور کارآمد مشورے طلب کیے تو رشید حسن خاں نے انھیں غالبؔ سے متعلق بہت ساری باتیں بہ ذریعہ خط ارسال کیں۔غالبؔ کی شاعری کو سائنسی نقطۂ نظر سے پرکھنا اپنے آپ یں بڑی بات تھی۔ڈاکٹر وہاب قیصر نے رشید حسن خاں کو اپنی کتاب کا مسودہ مطالعے کے لیے بھیجا تھا۔تاکہ کتاب کے معائب اور محاسن کی نشان دہی ہو سکے۔ڈاکٹر وہاب قیصر نے مسودے کو بہ غور پڑھنے کے لیے اپنی کتاب کے''دستِ امکاں''کے تحت صفحہ 14 پر شکریہ بھی ادا کیا۔رشید حسن خاں نے''سائنس اور غالبؔ''کے حوالے سے ڈاکٹر وہاب قیصر کے نام دو خط ارسال کیے۔ان خطوط میں غالبؔ کے ذہن اور اُن کی فکری پختگی پر

عالمانہ بحث ہے۔12 جولائی2000 کو(4 صفحات پر محیط) لکھے گئے خط میں رشید حسن خاں نے لکھا:

''یہ بات بار ہا کہی گئی ہے کہ مرزا غالب ذہنی سطح پر اپنے زمانے سے بہت آگے تھے اور اس کا اُن کو احساس تھا، اُنھوں نے کئی جگہ اس بات کو اپنے انداز سے کہا بھی ہے، لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ وہ اُن اصولوں سے اور اُن حقائق سے بھی واقف تھے جنھوں نے بیسویں صدی میں نمود حاصل کی ہے، تو یہ صحیح اندازِ بیان نہیں ہوگا۔ غزل کے اچھے اشعار کی یہ صفت بیان کی گئی ہے اُن میں معنوی وسعت پنہاں ہوتی ہے جو مختلف وقفوں میں مختلف سطحوں پر جھلکنے لگتی ہے۔ مگر اس میں قاری کے ذہن کی کارفرمائی کا دخل ہوتا ہے، کہ وہ اپنے شعور، اپنے علم اور اپنی نظر کی حدوں سے تعبیرات کرتا ہے۔ مرزا صاحب کے متعدد اشعار میں اندازِ بیان کی تہ داری اس کمال کی ہے کہ آج ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخص تو ان سائنسی حقائق سے بھی واقف تھا جن سے ہم آشنا ہیں اور اُس نے اُنھیں حقائق کو نظم کیا ہے۔ مگر شاعر سائنسی حقائق سے ہماری طرح واقف نہیں تھا۔ وہاب صاحب نے مرزا صاحب کے بہت سے اشعار کے جو سائنسی مفاہیم بیان کیے ہیں، وہ اس لحاظ سے توجہ طلب ہیں کہ اس طرح پڑھنے والوں کو مرزا صاحب کے اشعار کی باطنی فضا کی وسعت کی اور ان کی کثیر الجہتی کا اندازہ ہو سکے گا اور یہ معلوم ہوگا یا اس کی توثیق ہوگی کہ مرزا صاحب ذہنی سطح پر اپنے زمانے سے بہت آگے تھے اور اس کا بھی اندازہ ہوگا کہ مرزا صاحب کی قوتِ تخیل کس قدر زبر دست تھی، ان کے یہاں تعبیرات کس کس طرح معرضِ بیان میں آئی ہیں، مضمون کی آفرینی کا کیسا خلاّ قانہ کمال حاصل تھا اُن کو اور ان کے اشعار میں معنوی وسعت کا عالم کیا ہے۔ یہ کام بجائے خود کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔''

جب ڈاکٹر وہاب قیصر کی کتاب 2000 کو منظرِ عام پر آئی تو رشید حسن خاں نے ایک اور تعریفی خط 8 جنوری 2001 میں تحریر کیا۔ کیوں کہ ڈاکٹر وہاب قیصر نے ایک کتاب کا ایک نسخہ تحفتاً خاں صاحب کو ارسال کیا تھا۔ کتاب ملنے کے بعد خاں صاحب نے قیصر صاحب کو مبارک باد پیش کی اور

ساتھ ہی اس کتاب کو غالبؔ شناسی کے باب میں ’’گراں قدر اضافہ‘‘ قرار دیا۔ اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد سائنسی نقطۂ نظر سے غالبؔ کے اشعار کی شرح اور تعبیرات سامنے آنے کے قوی امکان پیدا ہوئے۔ رشید حسن خاں نے اپنے خط میں ڈاکٹر وہاب قیصر کے اس کارنامے کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے لکھا:

’’آپ کا بھیجا ہوا علمی تحفہ ملا تھا۔ آپ نے یاد رکھا اور یاد کیا، اس کے لیے ممنون ہوں اور شکر گزار۔ میرا خیال ہے کہ اس کتاب سے مطالعۂ غالبؔ کی بعض نئی جہتیں رونما ہو سکیں گی، یعنی غالبؔ کے اشعار میں جو کلیدی الفاظ آئے ہیں، اُن کی معنویت میں اس طرح توسیع کے پہلو اُبھریں گے کہ قدیم تعبیرات کی جگہ نئے حقائق بنی کو جگہ مل سکے گی۔ مرزا صاحب سائنس سے واقف تھے یا نہیں، یہ الگ مسئلہ ہے؛ البتہ اُن کے اشعار میں بہت سے اہم الفاظ اِس طرح منسلک ہوئے ہیں کہ اُن کی نئی تعبیرات کا تعین کیا جا سکتا ہے اور اس کتاب سے اس عمل کو فروغ مل سکے گا۔ ایک دل چسپ کتاب کے منظرِ عام پر آنے کی مبارک باد قبول فرمایئے۔ آپ نے اشعار کے مختلف مفاہیم کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ دل چسپی کا پہلو کہیں بھی تاب نہیں ہونے پاتا، یہ بڑی خوبی ہے اس کتاب کی۔ البتہ ایک بات ضرور ذہن میں آئی ہے کہ اگر کسی طرح مرزا صاحب زندہ ہو کر تشریف فرماں ہوں اور یہ سب مفاہیم اُن کے سامنے پیش کیے جائیں تو کیا وہ سچ مچ اِنھیں اپنے ہی اشعار کے مفاہیم سمجھیں گے؟ یہاں جدید تنقید کا یہ نقطۂ نظر شاید کام آ سکے کہ مفہوم کا تعین در اصل قاری کیا کرتا ہے۔ بہ ہر طور، یہ سب بحثیں تو ہوتی ہی رہیں گی، مگر یہ بات اپنی جگہ رہے گی کہ ایک فکر انگیز کتاب سامنے آئی ہے۔ کتاب کا ایک بار پھر شکریہ۔‘‘

(یہ دونوں غیر مطبوعہ خط ڈاکٹر وہاب قیصر نے اپنی کتاب ’’سائنس اور غالبؔ‘‘ کے ساتھ راقم الحروف کو 29 مئی 2015 میں نگر پنچایت سِوال خاص، میرٹھ (یو۔ پی) کے پتے پر ارسال کیے)

رشید حسن خاں کی زندگی میں ہی ان سے کئی جعلی کتابیں منسوب کی گئیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احقر کا مضمون ’’رشید حسن خاں سے منسوب جعلی کتابیں‘‘)۔ میں اس موقع پر اس مضمون کا وہ حصہ قارئین کے

سامنے پیش کر رہا ہوں جس کا تعلق غالب سے متعلق کتابوں سے ہے۔120 صفحات پر مشتمل، غالب اکیڈمی کراچی سے 1987 میں شائع ہوئی کتاب ''غالب فکروفن'' (قیمت:30روپے) کو بھی رشید حسن خاں سے منسوب کیا جاتا ہے۔اس کتاب کے سرورق پر ''غالب فکروفن'' کے نیچے 'رشید حسن خاں' کا نام درج ہے جب کہ کتاب میں رشید حسن خاں کی لکھی ہوئی ایک سطر بھی موجود نہیں۔کتاب کا انتساب ڈاکٹر نورالحسن انصاری اور شاہد ماہلی کے نام ہے۔ان دونوں ناموں کے ٹھیک نیچے رشید حسن خاں کے جعلی دستخط ہیں۔ڈاکٹر ظ۔انصاری (نشاط کا شاعر)، پروفیسر امیر حسین عابدی (غالب اور سبک ہندی)، ڈاکٹر عابد پیشاوری (غالب، حالی، شیفتہ اور ہم)، کاظم علی خاں (تیغ تیز پر ایک نظر) اور ڈاکٹر شریف حسین قاسمی (غالب اور تذکرہ آفتابِ عالم تاب) کے اسمااس کی فہرست میں شامل ہیں۔اس کتاب کی اشاعت کے بعد پاکستان میں ان کے دوست 'لطف الرحمٰن' نے انھیں مبارک باد کا پیغام ارسال کیا۔جواب میں رشید حسن خاں نے لکھا کہ 'کراچی سے میری کوئی کتاب غالب فکروفن شائع نہیں ہوئی'۔اس کے جواب میں رشید حسن خاں کو 'لطف الرحمٰن'' نے ملتان سے خط لکھا اور ساتھ میں 'کراچی سے شائع شدہ کتاب 'غالب فکرو فن' بھی ارسال کی۔لطف الرحمٰن کا خط ملاحظہ کیجیے اور اندازہ کیجیے کہ ادبی مافیہ اپنے تجارتی فائدے کے لیے کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں:

''محترم رشید حسن خاں صاحب، تسلیمات،

آپ نے 13مارچ1989 کو تحریر فرمایا تھا'' کراچی سے میری کتاب غالب فکر وفن شائع ہوئی ہے۔ارے صاحب! میری کوئی کتاب اس نام کی نہیں اور نہ کراچی سے میری کوئی کتاب چھپی ہے۔اگر ایسی کوئی کتاب ہے تو پھر وہ جعلی کتاب ہے۔میرا اس سے کچھ واسطہ نہیں۔میں نے تو اسے دیکھا نہیں۔''

میرے محترم کتاب پیش کرتا ہوں۔یہ جعلی ہے یا اصل اس اس کا مقصد خود فرمائے۔آپ کا اس سے کوئی واسطہ ہو یا نہ ہو کتاب تو دیکھ لیجیے۔کتاب آپ کے نام سے شائع، اور وہ بھی غالب پر کیسے ممکن تھا کہ اسے نہ خریدتا۔

مخلص

لطف الرحمٰن خاں

یک شنبہ 7 مئی 1989

بی 149 غالب نما، حالی روڈ، گل گشت، ملتان 60700

(غالب فکر وفن، مرتب رشید حسن خاں، غالب اکیڈمی، کراچی، اشاعت، 1987)

جب رشید حسن خا کو یہ کتاب (غالب فکر وفن) مل گئی اور اس بات کا علم ہوا کہ ان کے نام سے ’غالب اکیڈمی کراچی‘ نے باقاعدہ کتاب شائع کی ہے تو انھوں نے انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی کے ہفت روزہ اخبار ’ہماری زبان، بابت 8 تا 14 اگست 2000‘ میں ایک مضمون ’’غالب فکر وفن، جعل سازی کا ایک نمونہ‘‘ لکھ کر ان تمام باتوں کا ازالہ کیا جو ان کے نام سے غلط منسوب کر دی گئی تھیں۔ رشید حسن خاں نے اپنے مضمون میں یہ بھی لکھا کہ انھوں نے اس جعلی کتاب کو انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی کے کتب خانے میں جمع کرا دیا ہے تا کہ آیندہ نسلیں جب بھی غالب سے متعلق کوئی تحقیقی کام کریں تو انھیں معلوم ہو سکے کہ رشید حسن خاں کے نام سے منسوب کتاب جعلی تھیں:

’’یہ میرا فرض تھا کہ میں اسی زمانے میں اس کی وضاحت کر دیتا کہ نری جعل سازی ہے، اس کتاب سے میرا کچھ تعلق نہیں۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا، یوں کہ دوسرے ضروری کاموں میں ایسا اُلجھا کہ یہ بات ذہن سے نکل گئی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے 1998 میں ’’غالب ببلیوگرافی‘‘ نام کی کتاب چھاپی ہے، اس میں صفحہ 39 پر اس کتاب کا بھی اندراج ہے میرے نام سے۔ یعنی اب اس پر مُہر بھی لگ گئی۔ اب جو میرے ان کرم فرما کا خط آیا تو میں نے ضروری سمجھا کہ صورتِ حال کی وضاحت کر دی جائے تا کہ غلط فہمی کے لیے مزید گنجایش نہ پیدا ہو اور یہ بات معلوم ہو جائے کہ اس کتاب سے میرا کچھ واسطہ نہیں، کوئی تعلق نہیں۔ کسی نے غالباً تجارتی مفاد کی خاطر یہ جعل بنایا تھا۔ اس پر جو میرے دستخط بنے ہوئے ہیں وہ بھی جعلی ہیں۔ ہاں میں یہ کتاب انجمن ترقی اُردو (ہند) کے کتاب خانے میں داخل کیے دے رہا ہوں اس خیال سے کہ جعل سازی کا یہ نمونہ محفوظ ہو جائے اور یوں بھی کہ کوئی صاحب اگر اسے دیکھنا چاہے تو دیکھ سکیں۔ لطف الرحمٰن خاں کا خط بھی اس کے صفحہ 2 پر مندرج ہے انھی کے قلم کا لکھا ہوا۔‘‘

(ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی 8 تا 14 اگست 2000، شمارہ نمبر 30 جلد نمبر 59، ص اول)

رشید حسن خاں سے منسوب ایک اور کتاب ''اشاریۂ کلامِ غالب'' ہے۔اس کتاب کو غالب صدی تقریبات کے موقع پر شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی کی جانب سے فروری 1970 میں شائع کیا گیا۔اس کتاب کی قیمت سات روپے تھی۔اشاریۂ کلامِ غالب کا پیش لفظ صفحہ''ج'' پر، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے 10 فروری 1970 کو رقم کیا۔پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اپنے پیش لفظ میں اس اشاریے کی افادیت، اہمیت اور معنویت پر بحث کی اور اس اہم پروجیکٹ میں شامل فرحت فاطمہ (دختر، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی) جناب محمد یعقوب اور رشید حسن خاں کا بہ صمیم قلب شکریہ ادا کیا۔اس موقع پر میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے''پیش لفظ'' کا وہ حصہ درج کر رہا ہوں تا کہ تحقیق کے میدان میں قدم رکھنے والے طلبہ جان سکیں کہ خواجہ احمد فاروقی نے آخر کیوں رشید حسن خاں کا نام اس کتاب میں شامل کیا:

> ''غالبؔ کے جشن صد سالہ کے موقع پر شعبہ اُردو دہلی یونی ورسٹی نے کئی مطبوعات کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، ان میں ''اشاریۂ کلام غالبؔ'' کی حیثیت کتاب الاشاعت کی ہے جس کو رفقائے کار جناب رشید حسن خاں، آنسہ فرحت فاطمہ اور جناب محمد یعقوب نے مل کر ترتیب دیا ہے۔''

(اشاریۂ کلامِ غالبؔ، شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی، فروری 1970، ص ج)

اشاریۂ کلام غالبؔ کے صفحہ''ر'' کے آخر میں تینوں مرتبین کے نام لکھے ہوئے ہیں۔سب سے پہلے فرحت فاطمہ اس کے بعد محمد یعقوب اور آخر میں رشید حسن خاں کا نام درج ہے۔1959 سے قبل رشید حسن خاں کے مضامین ہندوستان اور پاکستان کے موقر ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے تھے۔الغرض رشید حسن خاں نے اُردو املا، شاعری کی زبان، ترقی پسند افسانہ نگاروں کے افسانوں میں بیانہ کا مسئلہ اور اپنے ہم عصر شاعروں کے کلام میں زبان اور بیان کے مسائل کو اپنے مضامین کا حصہ بنایا۔کلاسیکی ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔رشید حسن خاں کی علم دوستی اور محنت شاقہ کی بدولت ہی خواجہ احمد فاروقی نے انھیں رسالہ اُردوئے معلی کی مجلس ادارت میں شامل کیا۔خواجہ احمد فاروقی نے رشید حسن خاں کو غالب کی صدی تقریبات کے موقع پر شائع ہونے والی کتاب'اشاریۂ کلامِ غالب'' کے مرتبین میں شامل کیا۔اس بارے میں ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

''پہلی بار غالب کا ترجمہ کے مسائل پر ایک بین الاقوامی گول میز کانفرنس کا انعقاد کیا گیا، جس میں رالف رسل اور ڈاکٹر شمل نے بھی شرکت کی۔ شعبے نے ڈاکٹر ذاکر حسین کا انتخابِ غالب، رشید حسن خاں صاحب، ڈاکٹر فرحت فاطمہ اور محمد یعقوب کا مرتب کیا ہوا ''اشاریۂ کلامِ غالب'' شائع کیا۔ غالبؔ کے جشنِ صد سالہ کے موقع پر شعبہ اُردو دہلی یونی ورسٹی نے مطبوعات کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، ان میں ''اشاریۂ کلامِ غالب'' کی بڑی اہمیت ہے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اس کے پیش لفظ میں لکھا ہے: ''اشاریۂ کلامِ غالب'' کی حیثیت کتاب الاستاد کی ہے، جس کو رفقائے کار جناب رشید حسن خاں، آنسہ فرحت فاطمہ اور جناب محمد یعقوب نے نے مل کر ترتیب دیا ہے۔''

(بیسویں صدی کی ممتاز شخصیت، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 2000، ص71)

رشید حسن خاں نے اسلم محمود کے نام 13 مارچ 2001 کو لکھے خط میں اس بات کی وضاحت کی کہ خواجہ احمد فاروقی نے اپنی بیٹی کو اشاریۂ کلامِ غالب میں شامل کرنے کے لیے یہ کتاب مرتب کرائی۔ موصوف نے اس کتاب سے قطع نظر کرتے ہوئے اسے کبھی اپنے پاس نہیں رکھا اور نہ ہی اس کا شمار اپنی تدوینات میں کیا۔ اشاریۂ کلامِ غالب کے بارے میں مزید باتیں درج ذیل خط میں ملاحظہ کیجیے:

''اشاریۂ کلامِ غالب کے نام کی میری کوئی کتاب نہیں۔ خواجہ فاروقی صاحب نے اپنی بیٹی کو کسی کام میں شامل کرنے کے لیے اس کتاب کو مرتب کرلیا تھا۔ یعقوب صاحب تھے ایک ریسرچ اسسٹنٹ، وہ تھے اور اُن کی صاحب زادی۔ انھی دونوں نے یہ کام کیا تھا۔ خواجہ صاحب نے یہ کیا کہ چھپتے وقت میرے علم کے بغیر نیچے میرا نام بھی لکھ دیا۔ کیا کرسکتا تھا۔ بہ ہر طور یہ کتاب شعبے کی طرف سے چھپی تھی۔ میرے پاس یہ نہیں، میں اسے اس قابل ہی نہیں سمجھتا تھا کہ اپنے پاس رکھتا۔''

(رشید حسن خاں کے خطوط، فروری 2011، ص217)

رشید حسن خاں نے 2 اگست 2001 کو پروفیسر ظفر احمد صدیقی کے نام لکھے خط میں بھی 'اشاریۂ کلامِ غالب کے بارے میں جو باتیں تحریر کیں وہ کافی اہم ہیں۔ خط میں رشید حسن خاں نے اس بات کو واضح

کیا کہ اشاریۂ کلامِ غالب میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔خواجہ احمد فاروقی نے اپنی جانب سے ان کا نام اس کتاب کے مرتبین میں شامل کیا ہے۔رشید حسن خاں اس کتاب کے اندراجات سے ذرا بھی مطمئن نہ تھے۔لکھتے ہیں:

''جس کتاب کا نام آپ نے پوچھا ہے،اُس کا نام ہے:اشاریۂ کلامِ غالب۔ یہ عرض کر دوں کہ یہ مرحوم فاروقی صاحب کا کرایا ہوا تھا اور اُن کے کرائے ہوئے سارے کام ساقط المعیار ہیں،یہ بھی ویسا ہی ہے۔انھوں نے صدر کی طاقت سے کام لے کر آخر میں میرا نام بھی دو دوسرے ناموں کے ساتھ لکھ دیا تھا اور میں اسے روک نہیں سکتا تھا،مگر میرا حصہ دور کا جلوہ ہے اور بس۔اس کے اندراجات سے میں ذرا بھی مطمئن نہیں اور نہ مآخذ سے۔ہاں یہ خواہش ضرور تھی کہ اس کام کو میں اپنے انداز سے کر سکتا۔کبھی کروں گا ضرور،مگر وہ کبھی کب آئے گا یہ معلوم نہیں۔'' (ایضاً،ص716)

اس طرح رشید حسن خاں نے اپنی ذاتی اور اجتمائی کاوشوں سے غالب شناسی میں ایک نیا باب وا کیا۔اُردو دُنیا انھیں صرف ایک محقق،ناقد اور مدوّن کے طور پر جانتی ہے لیکن ان کی زندگی کے ایسے بہت سے ادبی گوشے ہیں جن پر کام ہونا ابھی باقی ہے۔رشید حسن خاں کی شخصیت اپنے آپ میں ایک ادارہ اور ایک انجمن تھی۔دُنیا کی مختلف یونی ورسٹیوں میں ان کی تحقیقات و تدوینات کو نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ان کے ادبی کارناموں پر کئی ریسرچ اسکالرس کو Ph.D کی ڈگریاں تفویض کی جا چکی ہیں۔رشید حسن خاں کے جو خطوط ہمارے سامنے کتابی شکل میں موجود ہیں اگر صرف اُن کا ہی بہ غور مطالعہ کر لیا جائے تو جہانِ رشید حسن خاں میں مزید اضافہ ہو۔

خاں صاحب ایک منصوبہ بند زندگی گزارتے تھے۔وہ اپنے کاموں کی فہرست ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھتے تھے۔کون سا ادبی کام کب کرنا ہے اور کس کام کو کب مکمل کرنا ہے،ان سب کی جان کاری وہ بہ ذریعہ خطوط اپنے ہم عصر ادیبوں کو دیتے تھے۔اس سے اُردو ادب کو یہ فائدہ ہوا کہ ان کے علمی کارناموں کی اطلاع وقتاً فوقتاً ان کے مداحوں کو ملتی رہی۔ساتھ ہی ان کے عظیم الشان تحقیقی و تدوینی کاوشوں سے اُردو والے روشناس ہوتے رہے۔رشید حسن خاں کے بہت سے نادر مخطوطات منظرِ عام پر

نہیں آئے ہیں۔ پاکستان، (کراچی) کے مشفق خواجہ اور ممبئی کے کالی داس گپتا رضا کے نام رشید حسن خاں نے بہت سے خطوط ارسال کیے تھے۔ لیکن ان دونوں ادبی شخصیات کے راہیِ عدم ہو جانے کے بعد بیش قیمتی ادبی سرمایہ بھی ادبی دُنیا سے روپوش ہو گیا۔ آج اُردو دُنیا کو ان نادر خطوط کی سخت ضرورت ہے کیوں کہ ان دونوں کے پاس خاں صاحب کے کئی ادبی بھول بھلیاں موجود ہیں، اس طرح ان کی تحقیقی اور تدوینی کاوشوں میں بھی نئے باب وا ہوں گے۔ کالی داس گپتا رضاؔ تو خود ماہرِ غالبیات تھے۔ لازمی ہے رضاؔ صاحب سے بھی خاں صاحب نے لفظیاتِ غالب پر مشورہ ضرور کیا ہوگا۔

میں نے اس کتاب میں رشید حسن خاں کے اُن مضامین کو یک جا کرنے کی مقدور بھر سعی کی ہے جو غالب کی شخصیت، کلام، لفظیات اور املا وغیرہ سے متعلق ہیں۔ اس کتاب میں، میں نے دو مضمون (1، گنجینۂ معنی کا طلسم: تعارف اور تجزیہ، پروفیسر ظفر احمد صدیقی 2، راقم الحروف، گنجینۂ معنی کا طلسم، اشاریہ دیوانِ غالبؔ جلد اول) رشید حسن خاں کی مرتب کردہ کتاب ''گنجینۂ معنی کا طلسم (جلد اول) شامل کیے ہیں۔ ان دونوں مضامین میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ رشید حسن خاں نے کتنی عرق ریزی، جاں فشانی، تلاش و تحقیق کے بعد ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' کو تین جلدوں میں تیار کیا تھا۔ خاں صاحب نے اپنی عمرِ عزیز کا جتنا حصہ (1960 تا 2005) اس کتاب کو ترتیب دینے میں صرف کیا اُتنا کسی اور تدوین میں صرف نہیں کیا۔

''رشید حسن خاں کی غالب شناسی'' کتاب کو ترتیب دینے میں جن رفقا نے دامے، درمے قدمے اور سخنے میری مدد کی ان میں عارف محمد خاں، عبدالرشید، اختر زماں، ڈاکٹر عمیر منظر اویس سنبھلی، ڈاکٹر شاہ نواز فیاض، ڈاکٹر سلمان فیصل، ڈاکٹر خالد ظہیر، ڈاکٹر عادل احسان، ڈاکٹر خالد ظفر، ڈاکٹر مدنی اشرف وغیرہ کا نام قابلِ ذکر ہے۔ مرحوم رشید حسن خاں کے دونوں فرزندوں خورشید حسن خاں اور خالد حسن خاں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ جب بھی مجھے خاں صاحب سے متعلق کوئی بات دریافت کرنا ہوتی تو یہ دونوں بھائی بڑی ہی خوش دلی اور خندہ پیشانی سے اپنے والد کی باتیں مجھ سے شیئر کرتے۔ ڈاکٹر ٹی آر. رینا کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے رشید حسن خاں کی غالب شناسی کی جانب توجہ مبذول کرائی اور کہا کہ برخوردار اس کام کو آپ بہ آسانی کر سکتے ہو۔ ڈاکٹر الف ناظم (افتخار احمد قادری) کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ جنھوں نے اپنے نیک مشوروں سے مجھے نوازا۔ ڈاکٹر محمد مستمر اور ڈاکٹر فرقان احمد سردھونی کا بھی شکریہ کہ جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کے علاوہ اپنے مفید اور کارآمد مشوروں سے نوازا۔ اس موقع پر میں

اپنے مشفق ومہربان والدین افسر علی اور شکیلہ بانو کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ جنھوں نے رات دن میرے حق میں دعائیں کیں کہ یہ کام جلد منظرِ عام پر آ جائے۔لیکن اس کتاب کے منظرِ عام پر آنے سے قبل ہی میرے والدِ محترم جنت مکیں افسر علی 11 دسمبر 2019 کو اس دارِ فانی سے ہمیشہ کے لیے کوچ کر گئے۔میں اپنی شریک حیات یاسمین بیگم کا بہ صمیم قلب شکر گزار ہوں کہ جس نے خانگی زندگی کے قیمتی لمحات کو اس کارہائے نماں پر قربان کیے۔میں اپنی بیٹیوں گل افشاں جہاں، زینت ریشما اور بیٹوں فیصل ابراہیم، واصل ابراہیم کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے میرے ہر ادبی کام کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھا۔میں اُن تمام حضرات کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں غائبانہ طور پر ہر اعتبار سے میری مدد کی۔میں اپنی کم علمی اور کم مائیگی سے بہ خوبی واقف ہوں۔میں اس لائق تو نہیں تھا کہ رشید حسن خاں جیسے عظیم محقق اور خدائے تدوین کی غالب شناسی کے حوالے سے تحریر کردہ مضامین کو یک جا کروں۔پھر بھی میں رب العزت کا شکر گزار ہوں کہ خاں صاحب کی لکھی ہوئی تحریروں اور مضامین کو یک جا کر انھیں کتابی صورت میں پیش کر سکا۔میرے لیے یہ لمحہ باعثِ افتخار بھی اور سرمایۂ سعادت بھی ہے کہ رشید حسن خاں کی غالب شناسی کے حوالے سے یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی۔اگر اس کتاب کے اندرون صفحات یا بین السطور کوئی ایسی بات در آ گئی ہو جو قارئین کے لیے گراں گزرے، تو اسے درگزر کرتے ہوئے احقر کو مطلع کر دیا جائے تا کہ آیندہ اڈیشن میں در آئی خامیوں کی تصحیح کر لی جائے۔قارئین اور ناقدین کی نیک خواہشات کا طالب:

ابراھیم افسر

نگر پنچایت سِوال خاص،

ضلع میرٹھ (یو پی) 250501

جمعرات، 24 ستمبر 2020

Mobile-9897012528

email-ibraheem.siwal@gmail.com

ooo

پروفیسر ظفر احمد صدیقی

گنجینۂ معنی کا طلسم: تعارف و تجزیہ

رشید حسن خاں کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کی تحقیقی و تدوینی خدمات سے اردو کا ہر صاحبِ ذوق قاری واقف ہے۔ 'فسانۂ عجائب'، 'باغ و بہار'، 'سحرالبیان'، 'مثنویاتِ شوق'، 'زٹل نامہ' اور 'مصطلحاتِ ٹھگی' وغیرہ ان کے تدوینی کارنامے اردو ادب کی تاریخ میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔

ناچیز کو ان کی جناب میں نیاز حاصل تھا۔ زندگی کے آخری برسوں میں وہ بار بار اشاریۂ کلامِ غالب کا ذکر کرتے تھے۔ آخر میں انھوں نے یہ خوش خبری سنائی تھی کہ 'اشاریۂ کلامِ غالب' مکمل ہوگیا ہے اور یہ بھی کہ اس کی پروف ریڈنگ کا کام بھی وہ انجام دے چکے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد ڈاکٹر ٹی. آر. رینا سے متعدد بار دریافت کیا کہ اس کا مسودہ کہاں ہے؟ اس کی اشاعت کی کیا صورت ہوگی وغیرہ؟ وہ کہتے رہے کہ خلیق انجم صاحب کو بار بار توجہ دلاتا ہوں۔ دیکھیے کیا صورت بنتی ہے؟ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اس کے ضیاع کا اندیشہ ہونے لگا۔ بارے اب ڈاکٹر اطہر فاروقی اور ڈاکٹر رضا حیدر جیسے خان صاحب کے قدردانوں کی متحدہ کاوش کے نتیجے میں 'اشاریۂ دیوانِ غالب' کی پہلی جلد [الف تا چ] غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کی طرف سے شائع ہوکر منظرِ عام پر آگئی ہے۔ اس کے لیے یہ دونوں مبارک باد کے مستحق ہیں۔

بہ ظاہر یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ فرہنگِ کلامِ غالب، تلمیحاتِ غالب، استعاراتِ غالب اور تشبیہاتِ غالب جیسے موضوعات پر کام کرنا تو مفید مطلب ہوسکتا ہے، لیکن کلامِ غالب کی محض لفظ شماری کا کیا فائدہ؟ اس کا جواب خان صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"کسی بڑے شاعر کے کلام میں کتنے لفظ ہیں؟ ان کا اشاریہ بنانا بھی دل

چسپ کام ہے، لیکن یہ دیکھنا اس سے بھی زیادہ دل چسپ اور ضروری ہے کہ مختلف الفاظ نے کیسی کیسی نسبتوں کی تشکیل کی ہے۔ ایک لفظ بیس بار آیا ہے۔ کیا ہر جگہ ایک ہی معنی اور ایک ہی مفہوم میں آیا ہے؟ یا معنویت نے نئے نئے انداز سے خود کو نمایاں کیا ہے؟ ایسے مقامات کون سے ہیں؟ اس طرح لفظ شماری کا سادہ عمل وسیلہ بن سکتا ہے رنگارنگ معنویت کی بازیافت اور دریافت کا۔'' (مقدمہ ص ۹)

خان صاحب نے اپنے خیال کی وضاحت کے لیے کئی مثالیں دی ہیں۔ یہاں صرف ایک پر اکتفا کی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''بیان کی وسعت بھی مرزا صاحب کی شاعری کا ایک وصف ہے۔ اس صفت کی کارفرمائی نے مرکبات کی شکل میں ایک خاص طرزِ ادا کی صورت گری کی ہے۔ مثلاً 'یک' اور 'دو' سادہ سے لفظ ہیں۔ ترکیبی صورت میں ان لفظوں سے ایسے ٹکڑوں کی تشکیل ہوتی ہے جن میں بے کراں وسعت سما گئی ہے۔ ان مرکبات کو دیکھیے:

''یک بیاباں اوج، یک بیاباں بیضۂ قمری، یک بیاباں تپشِ بالِ شرر، یک بیاباں جلوۂ گل، یک بیاباں حسرتِ تعمیر، یک بیاباں ماندگی، یک جہاں امّید، یک جہاں چینِ جبیں، یک جہاں زانو تامل، یک جہاں قماش ہوس، یک جہاں ہنگامہ، یک چمن جلوۂ یوسف، ماتم یک شہرِ آرزو، یک عالم چراغاں، یک گلستاں، یک نیستاں عالم، یک عالمِ افسردگی، یک عالم گریباں چاکیِ گل، یک عالم گلستاں۔'' (ایضاً ص ۹)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غالب کے اندازِ فکر کو سمجھنے کے لیے ان مرکبات اور جن اشعار میں یہ ترکیبیں وارد ہوئی ہیں، ان سب کو بہ یک نگاہ سامنے رکھنا ضروری ہے۔ 'اشاریۂ دیوانِ غالب' کی ترتیب سے خان صاحب کا مقصد اصالتاً یہی ہے۔

اشاریۂ کلامِ غالب کے سلسلے میں خاں صاحب کا ارادہ یہ تھا کہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کے جملہ مفرد اور مرکب الفاظ اور کلیاتِ نظم فارسی کے صرف مرکبات کو شاملِ کتاب کریں۔ لیکن انھوں نے جب

کام شروع کیا تو نسخۂ عرشی کے صرف اسما کا احاطہ کرنے میں دو جلدیں بن گئیں۔ لہٰذا افعال و حروف اور فارسی مرکبات کو اس اشاریے میں شامل نہیں کیا جا سکا۔ موجودہ اشاعت کے لحاظ سے صرف اسما ہی اب تین جلدوں پر مشتمل ہیں۔

اس اشاریے میں ترتیبِ الفاظ یہ ہے کہ پہلے مفرد الفاظ کو حروفِ تہجی کی ترتیب کے مطابق رکھا گیا ہے۔ ہر لفظ کے ساتھ نمبر شمار بھی لکھا گیا ہے۔ پھر مقابل میں وہ شعر درج کیا گیا ہے جس میں وہ لفظ وارد ہوا ہے۔ متنِ شعر کے حوالے کے لیے نسخۂ عرشی کا صفحہ نمبر بھی درج کر دیا گیا ہے۔ یہ کسی لفظ کے اندراج کا پہلا حصہ ہوا۔

دوسرے حصے میں اس لفظ کے مرکبات کا اندراج کیا گیا ہے۔ پھر یہ اندراج بھی دو حصوں میں منقسم ہے۔ حصۂ اول میں وہ مرکب ہے جس میں متعلقہ لفظ، مرکب کا جزوِ اول ہے۔ مثلاً 'اشک' کے تحت 'اشکِ چشمِ سرمہ آلود'۔ حصۂ دوم میں وہ مرکب ہے جس میں متعلقہ لفظ درمیان میں آیا ہے یا آخر میں وارد ہوا ہے۔ مثلاً 'بارانِ اشک'، 'نازِ گراں مایگیِ اشک اور قدرِ اشکِ دیدۂ عاشق وغیرہ۔ جہاں جہاں متعلقہ لفظ، مرکب کا جزوِ اول ہے وہاں اس شعر کا اندراج بھی کیا گیا ہے جس میں وہ لفظ آیا ہے اور نسخۂ عرشی کا صفحہ نمبر بھی درج کیا گیا ہے۔ البتہ جہاں متعلقہ لفظ درمیان یا آخرِ مرکب میں آیا ہے وہاں شعر کا اندراج نہیں کیا گیا ہے، کیوں کہ حرفِ اول کے تحت اس شعر کو بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے۔

اس اشاریے کا ایک مقصود لفظ شماری بھی ہے۔ اس لیے خاں صاحب نے حاشیے میں ہر لفظ کے متعلق یہ بھی لکھ دیا ہے کہ وہ کلامِ غالب میں کُل کتنی بار آیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ کتنی بار بہ طورِ مفرد استعمال ہوا ہے اور کتنی بار بہ شکلِ مرکب وارد ہوا ہے۔ مثلاً 'آب' کے تحت حاشیے میں لکھ دیا گیا ہے کہ یہ لفظ کُل باون بار آیا ہے۔ بہ طورِ مفرد نو بار اور بہ طورِ مرکب تینتالیس بار۔ اسی طرح 'اسد' کے تحت انھوں نے شمار کر کے لکھ دیا ہے کہ ۲۶۸ بار مقطعے میں یہ لفظ بہ طورِ تخلص نظم ہوا ہے پھر وہ تمام مقطعے وہاں نقل کر دیے ہیں۔

رشید حسن خاں نے مقدمۂ کتاب میں یہ وضاحت بھی کی ہے کہ انھوں نے اشعار کے متن کے سلسلے میں نسخۂ عرشی طبع اول کو بنیادی ماخذ کی حیثیت سے استعمال کیا ہے، اور جہاں تک نسخۂ عرشی طبع ثانی کا تعلق ہے تو اسے صرف معاون نسخے کے طور پر کام میں لائے ہیں۔ اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی ہے:

''مجھے معلوم ہے کہ اشاعتِ اول پر نظر ثانی کا کام ان [مولانا عرشی] کی طویل علالت کے دوران ہوتا رہا، جو مکمل طور پر ان کا کام نہیں۔ اس نسخے میں کچھ اضافے بھی ہیں اور ان کے ذمے دار بھی وہ نہیں۔ بعض کمیوں اور کچھ فروگذاشتوں کے باوجود کتابِ حوالہ کی حیثیت نسخۂ اشاعتِ اول کو حاصل ہے جو مکمل طور پر عرشی صاحب کا مرتب کیا ہوا ہے۔'' (مقدمہ ص ۱۳)

اس ضمن میں وہ مزید لکھتے ہیں:

''نقلِ اشعار کے لیے میں نے بنیادی نسخے کے طور پر نسخۂ عرشی طبع اول کو سامنے رکھا۔ البتہ اس کا التزام کیا کہ ہر شعر کا طبع ثانی سے مقابلہ کر لیا جائے۔...نسخۂ عرشی طبع اول اور طبع ثانی کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوا کہ دونوں نسخوں کے بہت سے اشعار کا متن باہم مختلف ہے اور کچھ اختلافات بہت پریشان کن ہیں۔...طبع ثانی میں ایسے اغلاطِ متن اچھی خاصی تعداد میں ہیں جن سے غلط نامہ اور استدراک کا حصہ خالی ہے۔'' (مقدمہ ص ۱۳)

ان تفصیلات کے ذریعے اس طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ رشید حسن خاں نے پیشِ نظر اشاریے میں اشعار یوں ہی نقل نہیں کر دیے ہیں، بل کہ مرتبِ متن کی طرح پہلے ہر ہر شعر اور اس کے ایک ایک لفظ پر غور کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے شعر کو نقل کیا ہے۔ بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) چمن زارِ تمنا ہو گیا حرفِ خزاں لیکن
بہارِ نیم رنگِ آہِ حسرت ناک باقی ہے

خاں صاحب اس شعر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''طبعِ اول میں اسی طرح ہے [ص ۱۰۷] طبع ثانی میں 'چمن زار تمنا ہو گئی' ہے۔ اس نسخے کے غلط نامے یا کسی ضمیمے میں یہ حوالہ نہیں ملتا کہ طبع اول کے 'ہو گیا' کو 'ہو گئی' بنایا گیا ہے۔ اس صورت میں لامحالہ اسے کتابت کی غلطی مانا جائے گا۔ میں نے طبع اول کے مطابق 'ہو گیا' لکھا ہے۔'' (مقدمہ ص ۱۶)

(۲) ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

خاں صاحب نے یہاں اولاً یہ بتایا ہے کہ طبع اول میں 'رونق منہ پر' ہے [ص ۲۳۹] یہی طبعِ ثانی میں بھی

ہے[ص۳۱۸]۔اس کے بعد تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے: ''اب صورتِ حال یہ ہے کہ 'رونق منہ پر' صرف طبعِ دوم کے ایک نسخے کے آخر میں شامل سادہ اوراق پر کسی مجہول الاحوال شخص کے قلم سے لکھی ہوئی اس غزل میں ہے۔اس کے مقابلے میں دیوانِ غالب کے تیسرے اور چوتھے مطبوعہ اڈیشن میں جو غالبؔ کی تصحیح کے ساتھ چھپے ہیں 'منہ پر رونق' ہے۔ان دونسخوں کے مقابلے میں ایک نامعلوم الاحوال شخص کی تحریر کوکسی معقول وجہ کے بغیر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔...میں نے اسی بناپر اس شعر میں 'منہ پر رونق' لکھا ہے''۔(مقدمہ ص ۱۶۔۱۷)

(۳)

جام ہر ذرہ ہے سرشار تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

خاں صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''طبع اول میں 'دو عالم میں' ہے[ص۱۰۸]طبع ثانی میں 'دو عالم سے' ہے۔[ص۱۱۵] دونوں نسخوں میں اس شعر کے دوسرے مصرعے میں کسی طرح کے اختلافِ نسخ کا حوالہ نہیں ملتا؛اس صورت میں کسی وضاحت کے بغیر طبع ثانی کے متن کو کس بنا پر قبول کیا جاسکتا ہے؟نسخۂ رضا میں طبع ثانی کے مطابق ''دو عالم سے' ہے [ص۲۵۳] ڈاکٹر نقوی نے مطلع کیا کہ نسخۂ خودنوشت[نسخۂ قدیم بھوپال] میں 'دو عالم سے' ہے۔میں نے اسی بناپر طبع ثانی کے مطابق 'دو عالم سے' لکھا ہے۔(مقدمہ ص ۱۷)

(۴)

سُبحہ گرداں ہے اسی کے کفِ امّید کا ابر
بیم سے جس کے صبا توڑے ہے صد جازنّار

شعر نقل کرنے کے بعد خاں صاحب رقم طراز ہیں:

''طبع اول میں یہی ہے[ص۴]طبع ثانی میں 'اسی کی' ہے[ص۴]اس سلسلے میں یہ بات توجہ طلب ہے کہ 'چکنی ڈلی' والے قطعے میں 'صاحب کے کفِ دست' آیا ہے۔طبع اول اور طبع ثانی دونوں میں یہی ہے۔اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ طبع ثانی میں 'اسی کی کفِ امید' میں 'کی'،غلطیِ کتابت ہے۔نسخۂ رضا میں 'اُسی کی' ہے[ص۳۰۷]اور یہ نتیجہ ہے طبع ثانی کی نقل کا۔اگر طبع اول کا مقابلہ کرلیا جاتا تو معلوم ہوجاتا کہ 'اسی کے' ہونا چاہیے۔''(مقدمہ ص ۱۷)

(۵) طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسداللہ خاں قیامت ہے

خاں صاحب نے اولاً یہ بتایا ہے کہ نسخۂ عرشی طبع اول[ص ۳۰۵]اور طبع دوم[ص ۴۲۷] دونوں میں ’ریختہ کہنا‘ ہے۔ پھر طویل بحث کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ اس شعر کا واحد ماخذ غالب کا مکتوب بنام عبدالرزاق شاکر ہے اور اس میں ’ریختہ لکھنا‘ ہے۔ اس بنا پر انھوں نے اس شعر میں ’ریختہ لکھنا‘ لکھا ہے۔ آخر میں انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ شعر کے علاوہ غالب نے نثر میں بھی دو جگہ ’’ریختہ لکھتا تھا‘‘ تحریر کیا ہے۔ اس لیے شعر کا یہی متن درست ہے۔ (مقدمہ ص ۱۵)

حاصلِ گفتگو یہ ہے کہ رشید حسن خاں نے کلامِ غالب کا صرف اشاریہ ہی تیار نہیں کیا ہے بل کہ نسخۂ عرشی طبعِ اول اور طبعِ ثانی کی کمیوں اور فروگذاشتوں کا ازالہ کرتے ہوئے نیز اعراب، توقیف نگاری اور املاے غالب کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے نسخۂ عرشی کی تدوینِ جدید بھی کر دی ہے۔

اس اشاریے کے حوالے سے اب ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ غالب کا کلام اگر گنجینۂ معنی کا طلسم ہے تو رشید حسن خاں کا یہ اشاریہ طلسم کشا ہے۔ اس اجمال کی توضیح کے لیے بیاضِ غالب بخطِ غالب [مرتبہ نثار احمد فاروقی، نقوش، لاہور] سے ایک شعر نقل کیا جاتا ہے:

نقشِ صد سطرِ تبسم ہے بر آبِ زیرِ کاہ
حسن کا خط پر نہاں خندیدنی انداز ہے

یہ شعر غالبؔ کے نو دریافت کلام میں شامل ہے جو پہلی بار نسخۂ بھوپال قدیم یا بیاضِ غالب بخطِ غالب کے ذریعے منظرِ عام پر آیا۔ [نقوش ص ۲۱۵] یہ نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ شیرانی یا بعد کے کسی قلمی نسخے یا مطبوعہ اڈیشن میں شامل نہیں۔ نسخۂ عرشی طبعِ اول میں بھی یہ شعر موجود نہیں اس لیے کہ اس وقت تک غالب کا خود نوشت دیوان دریافت نہیں ہوا تھا۔ البتہ طبعِ ثانی کا حصۂ چہارم ’بادآورد‘ میں عرشی زادہ نے اسے درج کیا ہے۔ [ص ۴۵۲] لیکن اس کا متن اس طرح لکھا ہے:

نقشِ سطرِ صد تبسم ہے بر آبِ زیرِ گاہ
حسن کا خط پر نہاں خندیدنی انداز ہے

یہاں عرشی زادہ سے دو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ اول یہ کہ انھوں نے ’صد سطرِ تبسم‘ کو ’سطرِ صد تبسم‘ بنا دیا۔

دوم یہ کہ 'آبِ زیرِ کاہ' کو 'آبِ زیرِ گاہ' لکھ دیا۔[یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں غلطیاں سہوِ کاتب کا نتیجہ ہوں] اس کے برخلاف نثار احمد فاروقی نے بیاضِ غالب میں اصل کے مطابق بالکل درست متن نقل کیا ہے ،یعنی: 'نقشِ صد سطرِ تبسم ہے برآبِ زیرِ کاہ'۔

کالی داس گپتا رضاؔ نے بھی نسخۂ رضا میں اس شعر کا اندراج کیا ہے۔لیکن نسخۂ عرشی طبعِ ثانی کی پیروی کرتے ہوئے: 'نقشِ سطرِ صد تبسم ہے برآبِ زیرِ گاہ' لکھ دیا ہے۔اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ انھوں نے حاشیے میں 'صد سطرِ تبسم' کے آگے قوسین میں 'شاید سہوِ کتابت' لکھ دیا ہے[ص۲۳۹]۔گویا غالب کے خود نوشت صحیح متن کو سہوِ کتابت پر محمول کرلیا ہے۔پروفیسر حنیف نقوی نے ذاتی نسخۂ رضا [مخزونہ حنیف نقوی کلکشن ،مسلم یونی ورسٹی،علی گڑھ] میں اپنے قلم سے متن کی تصحیح کردی ہے۔گیان چند کی 'تفسیرِ غالب'[ص۵۵۱] میں بھی صحیح متن منقول ہے۔

عرشی زادہ اور کالی داس گپتا رضاؔ پر اعتماد کی وجہ سے ناقد شہیر جناب شمس الرحمٰن فاروقی بھی دھوکا کھا گئے ہیں۔انھوں نے اپنی گراں قدر تصنیف 'لغاتِ روزمرہ'[ص۳۳] میں بہ طورِ مرکب 'آبِ زیر گاہ' کا اندراج کیا ہے اور اس کی وضاحت اس طرح کی ہے:

'زیر' اور 'گاہ' کے درمیان اضافت نہیں ہے۔فقرے کے معنی ہیں ''پانی جونشیب میں ہو'' غالب:

نقشِ سطرِ صد تبسم ہے بر آبِ زیرگاہ
حسن کا خط پر نہاں خندیدنی انداز ہے

ناچیز فاروقی صاحب کا ادب واحترام ملحوظ رکھتے ہوئے مؤدبانہ عرض کرتا ہے کہ 'زیرگاہ' یقیناً ایک لفظ ہے اور لغات میں اس کا اندراج بھی ملتا ہے،لیکن مرکب شکل میں 'آبِ زیرگاہ' کا اندراج فارسی یا اردو کے کسی لغت میں میری دانست کی حد تک موجود نہیں۔پھر اس کے جو لغوی معنی تحریر کیے گئے ہیں ان کا غالب کے شعر سے کوئی رشتہ بھی قائم نہیں ہوتا،بل کہ وہ اس کی معنویت کی راہ میں حائل ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ 'فرہنگِ آنندراج'، 'برہانِ قاطع'، 'فرہنگِ معین' اور 'اسٹائن گاس' (Steingass) وغیرہ میں 'زیرگاہ' کے معنی کرسی ،صندلی،تخت وغیرہ کے لکھے ہیں، بلکہ آنندراج میں یہ وضاحت بھی ملتی ہے: ''کرسی کہ برآں نشینند وآں کرسی راز یرِ تختِ بزرگ گذارند،ازیں روے زیرگاہ گویند''۔

ان سب کے بعد جب ہم رشید حسن خاں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ انھوں نے پیشِ نظر اشاریے میں نسخۂ عرشی طبع ثانی کی پیروی کے بجائے بیاضِ غالب بخطِ غالب کے مطابق بالکل صحیح متن نقل کیا ہے۔اس کے ساتھ ہی مقدمۂ کتاب میں عرشی زادہ اور کالی داس گپتا رضا کے نقل کردہ متن کے مغشوش اور نادرست ہونے کی نشان دہی بھی کردی ہے۔

یہاں تک پہنچ کر راقم حروف نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ 'آب زیرِ کاہ' کی ترکیب غالب کے اردو کلام میں کہیں اور بھی آئی ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب بھی اس اشاریے سے مل گیا کہ یہ مرکب، کلامِ غالب میں صرف ایک بار استعمال ہوا ہے اور وہ بھی اسی شعر زیرِ بحث میں۔ظاہر ہے کہ ایسی قطعیت کے ساتھ یہ جواب کوئی بڑے سے بڑا ماہرِ غالبیات بھی نہیں دے سکتا۔

متنِ شعر پر گفتگو کے بعد شعر کی معنویت کی تلاش کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔پروفیسر گیان چند جین نے 'تفسیرِ غالب' میں اس شعر کی شرح اس طرح کی ہے:

نقشِ صد سطرِ تبسم ہے بر آبِ زیرِ کاہ
حسن کا خط پر نہاں خندیدنی انداز ہے

پہلے مصرعے کی مختلف تاویلوں سے شعر کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔کاہ؛ گھاس، بالخصوص سوکھی گھاس۔آبِ زیرِ کاہ؛ وہ پانی جس کی پوری سطح پر گھاس پھیلی ہو۔محبوب کا خط آیا ہوا ہے۔وہ آبِ زیرِ کاہ پر سیکڑوں استہزائی تبسم کررہا ہے کہ تم (پانی) گھاس سے دب کر رہ گئے، لیکن میرا حسن خط کے باوجود نہیں دبا۔اس طرح حسنِ محبوب در پردہ اپنے خط پر بھی خندہ کررہا ہے کہ تم مجھے زائل کرنے میں ناکام رہے۔

(۲) آبِ زیرِ کاہ سے مراد حسن کی وہ چمک دمک ہے جو گیاہِ سبزہ کے نیچے پوشیدہ ہے۔ظاہراً محبوب کا تبسم ظاہر نہ ہو، لیکن سبزۂ خط کے نیچے جلد پر تبسم کے سیکڑوں خطوط ہیں۔حسنِ محبوب اپنے خط پر خندہ کررہا ہے کہ اس کے باوجود حسن کی آب وتاب نہیں دبی۔یہ خندہ یا تبسمِ نہاں اس لیے ہے کہ اس کے نقوش سبزہ کے نیچے ہیں۔

(۳) جو پانی گھاس کے نیچے چھپا ہے اس کی سطح پر تبسم کے سیکڑوں خطوط ہیں۔وہ کاہ پر تبسم کررہا ہے کہ تو سمجھتی ہے کہ میں ختم ہوگیا، لیکن میں تیرے نیچے رواں دواں ہوں۔اسی کی مماثلت پر حسن محبوب اپنے سبزۂ خط کو خندہ آمیز انداز سے دیکھتا ہے کہ سبزۂ خط کے باوجود حسن دب نہ سکا۔جس طرح آبِ زیرِ کاہ

کاتبسم گھاس کے نیچے پوشیدہ ہے اسی طرح حسن کا خندیدنی انداز خط کے نیچے نہاں ہے۔
(تفسیرِ غالب،ص۵۵۱۔۵۵۲)

ناچیز عرض کرتا ہے کہ محترم گیان چند کی یہ شرح غالب کے اندازِ فکر سے مطابقت نہیں رکھتی، اس لیے کہ غالب نے آمدِ خط کو عموماً زوالِ حسن کی علامت بتایا ہے۔ سرِ دست اس دعوے کی تائید میں دو شعر پیش کیے جاتے ہیں:

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دودِ شمعِ کشتہ ہے شاید خطِ رخسارِ دوست

......

ہوا جب حسن کم خط برعذارِ سادہ آتا ہے
کہ بعد از صاف مے ساغر میں دُرد بادہ آتا ہے

[رشید حسن خاں کے اشاریے کی دوسری جلد ابھی شائع نہیں ہوئی ہے، جس میں لفظ 'خط' کے تمام اشعار یکجا درج کیے گئے ہوں گے، ورنہ یہ بھی بتایا جاسکتا تھا کہ غالب نے خط کا مضمون کُل کتنی بار اور کس کس انداز سے نظم کیا ہے] بہرحال راقمِ حروف کے خیال میں اس شعر کی شرح اِس انداز سے کی جاسکتی ہے:

آمدِ خط کے بعد محبوب کا رخسارِ سادہ آبِ زیرِ کاہ کی مانند ہوگیا ہے جس پر سبزۂ خط تبسم کی سیکڑوں سطروں کی طرح دکھائی دے رہا ہے۔ گویا حسنِ محبوب در پردہ خط پر تلخ ہنسی ہنس رہا ہے کہ تیری آمد میرے زوال کی علامت ہے۔

'آبِ زیرِ کاہ' کے مجازی معنی ''ظاہر میں اچھا باطن میں خراب کے ہیں'' (نوراللغات) چوں کہ سبزۂ خط آغاز میں خوش نما معلوم ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ بدنما ہوتا جاتا ہے، اس لیے نمودِ سبزۂ خط کے بعد رخسارِ محبوب کی 'آبِ زیرِ کاہ' سے تشبیہ نہایت بلیغ ہے۔

'خط' تحریر کو بھی کہتے ہیں، اس لیے سبزۂ خط کو 'نقشِ صد سطرِ تبسم' قرار دینا بھی نہایت پُر لطف ہے۔ کیوں کہ خط، نقش اور سطر باہم متناسب ہیں۔

'آمدِ خط' کے ذیل میں پیشِ نظر اشاریے میں یہ شعر بھی درج ہے:

آمدِ خط ہے، نہ کر خندۂ شیریں کہ مباد

چشم مور آئنۂ دل نگرانی مانگے

اس سے معلوم ہوا کہ شاعر کے نزدیک آمدِ خط کے بعد 'خندۂ شیریں' بے محل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے زیرِ بحث شعر کے مصرعِ ثانی میں خندۂ محبوب کو خندۂ تلخ پر محمول کیا گیا ہے۔

لفظ 'تبسم' کے تحت اس اشاریے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ 'سطرِ تبسم' کی ترکیب کلامِ غالب میں دو جگہ اور وارد ہوئی ہے، لیکن وہ دونوں شعر کسی اگلی جلد میں 'سطر' کے تحت درج کیے گئے ہوں گے۔ ان میں سے ایک شعر مجھے اتفاقاً لفظ 'انشا' کے تحت مل گیا جو یوں ہے:

گر دکھاؤں صفحۂ بے نقشِ رنگِ رفتہ کو

دستِ رد، سطرِ تبسم یک قلم انشا کرے

اس شعر کے حوالے سے یہ کہنا ہے کہ جس طرح اس شعر میں 'سطرِ تبسم' کا تعلق 'صفحۂ بے نقشِ رنگِ رفتہ' سے قائم کیا گیا ہے، اسی طرح شعر زیرِ بحث میں بھی سبزۂ خط کو محبوب کے آمادۂ سفر حسن پر 'صد سطر تبسم کا نقش' بتایا گیا ہے۔

خاں صاحب نے لکھا ہے: ''یہ کام صبر آزما ثابت ہوا۔ بارے اتمام کو پہنچا۔'' یقیناً یہ ان کا عہد آفریں کارنامہ ہے۔ اس سے اہلِ نقد و نظر کو تحقیقی اور تنقیدی دونوں طرح کے مباحث میں مدد ملے گی۔ امید ہے کہ اس کی بقیہ دونوں جلدیں بھی جلد ہی اشاعت پذیر ہوں گی تاکہ اس کا نفع عام اور فائدہ تام ہو سکے۔ خاں صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے:

ع: ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

....

کتاب یات:

۱- A Comprehensive Persian - English Dictionary by F. Steingass, Manohar 2007

۲- برہانِ قاطع، محمد حسین تبریزی، مرتبہ دکتر محمد معین، جلد دوم، کتاب فروشی ابن سینا، تہران، ۱۳۴۲

۳- بیاضِ غالب، مرتبہ نثار احمد فاروقی، مشمولہ نقوشِ غالب نمبر، حصۂ دوم، لاہور، طبع دوم، جولائی ۱۹۸۴ء

۴- تفسیرِ غالب، گیان چند جین، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر، ۱۹۷۱ء
۵- دیوانِ غالب کامل، نسخۂ رضا، کالی داس گپتا رضا، ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ، بمبئی، فروری ۱۹۹۵ء
۶- دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، طبع دوم ۱۹۸۲ء
۷- فرہنگِ آنندراج، محمد بادشاہ شاد، مرتبہ دکتر دبیر سیاقی، کتاب فروشی خیام ۱۳۶۳ شمسی
۸- فرہنگِ فارسی، دکتر محمد معین، جلد دوم، مؤسسہ انتشارات امیر کبیر، تہران ۱۳۷۱
۹- گنجینۂ معنی کا طلسم [اشاریۂ دیوانِ غالب] جلد اول، مرتبہ رشید حسن خاں، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۱۷ء
۱۰- لغاتِ روزمرہ، شمس الرحمٰن فاروقی، آج کی کتابیں، کراچی (پاکستان) ۲۰۰۳ء
۱۱- نوراللغات، جلد اول و دوم، نورالحسن نیر کاکوروی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور (عکسی اڈیشن) ۱۹۸۹ء

پروفیسر ظفر احمد صدیقی
سابق صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ-202002 (یوپی)
E-mail: zafarasiddiqi@gmail.com

(ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 22 تا 28 جولائی 2018، شمارہ:28، جلد 77، ص اول، دوم اور 7)

○○○

ابراہیم افسر

گنجینۂ معنی کا طلسم
(اشاریۂ دیوان غالبؔ، جلد اوّل)
(مرتب: رشید حسن خاں)

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ دہلوی (1869۔1797) کے اس اشعار سے متاثر ہوکر دیوانِ غالبؔ میں پنہاں اسرار کی گرہ کھولنے کے لیے ہندوستان کے مایہ ناز محقق، مدون، املا، زبان وقواعد شناس، مبصر اور متنی نقاد رشید حسن خاں مرحوم (2006۔1925) نے اپنی عمر عزیز کا ایک طویل وقت صرف کیا۔ یہ اشاریہ ان کی 45 سالہ تحقیقی وتدوینی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ انھوں نے ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' پر نوٹس بنانے کا کام دہلی یونی ورسٹی میں ملازمت ملنے پر 1960 کے بعد شروع کیا تھا۔ رشید حسن خاں دیوان غالبؔ کا ایک ایسا اشاریہ مرتب کرنا چاہتے تھے جس میں مرزا غالبؔ کے کلام میں در آئے الفاظ (مفرد اور مرکب) کو یکجا کر یہ معلوم کیا جا سکے کہ انھوں نے فلاں لفظ کو کتنی بار مرکب اور فلاں لفظ کو کتنی بار مفرد استعمال کیا ہے۔ رشید حسن خاں مرحوم نے دیوان غالبؔ کا کتنی عرق ریزی، گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا ہوگا یا یوں کہہ لیجیے کہ موصوف نے دیوان غالبؔ میں کتنی بار غوطہ زنی اور ورق گردانی کی ہوگی تب جا کر گوہر نایاب ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' کی شکل میں دیوان غالبؔ کا اشاریہ تیار ہوا۔ رشید حسن خاں کی دیرینہ خواہش تھی کہ دیوان غالبؔ کی شرح ان کی زندگی میں ہی شائع ہو جائے۔ لیکن رشید حسن خاں کا یہ خواب ان کی زندگی میں پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ موصوف یہ خواہش لیے ہوئے اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور) کے نام خاں صاحب نے 8 جون 2005 کو لکھے خط میں

گنجینۂ معنی کا طلسم کی کمپوزنگ اور اپنی زندگی میں اسے مکمل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ لکھتے ہیں:

> ''الفاظِ غالبؔ سے متعلق کتاب (گنجینۂ معنی کا طلسم) کی کمپوزنگ ایک صاحب دہلی میں کر رہے ہیں، اب تک صرف 109 صفحے ہو پائے ہیں، معلوم نہیں میری زندگی میں مکمل ہو گی بھی؟''

(رشید حسن خاں کے خطوط، جلد دوم، مرتب ڈاکٹر ٹی. آر. رینا، اُردو بک ریویو، دہلی 2015، ص 319)

آخر کار رشید حسن خاں کی وفات کے ٹھیک 11 سال بعد غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے اس ضخیم کتاب کے پہلے حصے (451 صفحات) کا 22 دسمبر 2017 کو بہ وقت شام 7:30 بجے تقسیم غالب ایوارڈ 2017 کے موقع پر غالب سمینار ہال میں جسٹس آفتاب عالم، ایس وائی قریشی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر رضا حیدر اور پروفیسر ہربنس مکھیا کے ہاتھوں رسمِ اجرا کرایا۔ خوش قسمتی سے راقم الحروف بھی کتاب کی رونمائی کے موقع پر موجود تھا۔ ڈاکٹر رضا حیدر (ڈائریکٹر، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی) نے سمینار ہال میں شرکا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب کے دوسرے اور تیسرے حصے کو بھی جلد ہی شائع کیا جائے گا۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی بتایا کہ پہلے اس کام کو انجمن ترقی اُردو (ہند) شائع کرنا چاہتی تھی، لیکن بعض وجوہات کی بنا پر انجمن اسے شائع نہ کر پائی۔ اب اس کتاب (گنجینۂ معنی کا طلسم) کو انجمن ترقی اُردو (ہند) اور غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے باہمی اشتراک سے منظرِ عام پر لایا جا رہا ہے۔ غور طلب ہے کہ رشید حسن خاں کی وفات کے بعد انجمن ترقی اُردو اس کام کو شائع کرانا چاہتی تھی۔ انجمن نے غالبؔ کے کلام کی شرح اور فرہنگ سے متعلق ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' نامی کتاب کو منظرِ عام پر لانے کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا۔ 1700 سے زائد صفحات کی کمپوزنگ بھی ہو چکی تھی لیکن ڈاکٹر خلیق انجم کی علالت، علمی اور ادبی مصروفیت اور دیگر مسائل کے سبب یہ کام ملتوی ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب بھی اس دارِ فانی سے 2016 میں رخصت ہو گئے۔ انجمن کے نئے اور فعال جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی صاحب، جو رشید حسن خاں کے نیاز مندوں میں سے ہیں، نے اس اہم کام کی جانب توجہ مبذول کی۔ اس طرح ان کی ذاتی کاوشوں اور کمپوزر عبدالرشید کی سچی لگن اور محنت کے سبب یہ کام مکمل ہو کر اب منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس کتاب کے پروف پڑھنے کی ذمہ داری خاں صاحب کے بعد ان کی ایک اور نیاز مند ڈاکٹر ارجمند آرا (اُستاذ، شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی) نے قبول کیں اور

غالبؔ کے اشعار کی قرأت کا ذمہ ڈاکٹر سرورالہدیٰ (اُستاذ، شعبۂ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) کے سپرد تھا۔ان دونوں حضرات نے اپنی ذمہ داریوں کو بہ حسن خوبی انجام دیا۔اس کتاب کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کی روداد کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر اطہر فاروقی نے مئی 2017 میں لکھے حرفِ آغاز میں کیا ہے:

''جب اس کتاب کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی تو میں نے غالب انسٹی ٹیوٹ سے درخواست کی تھی کہ وہ کسی طرح اس کتاب کو شائع کر دیں جسے انسٹی ٹیوٹ نے قبول فرما لیا تھا۔اب یہ کتاب غالب انسٹی ٹیوٹ اور انجمن ترقی اُردو (ہند) کی مشترکہ اشاعت (تین جلدوں میں) ہے جس کے لیے میں خصوصاً انسٹی ٹیوٹ کے جواں سال ڈائریکٹر ڈاکٹر رضا حیدر صاحب کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب تو انجمن کے صدر بھی ہیں اور رشید صاحب کے بے تکلف دوست بھی، اس لیے، ان کی فراخ دلی کا شکریہ ادا کرنا کس حد تک صحیح ہے، یہ تو رشید صاحب ہی بتا سکتے تھے۔یہ کتاب تین جلدوں میں شائع ہوگی۔''

(حرفِ آغاز، ڈاکٹر اطہر فاروقی، گنجینۂ معنی کا طلسم،، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2017، ص 8)

رشید حسن خاں نے گنجینۂ معنی کا طلسم پر 22 صفحات کو محیط مبسوط، مربوط، عالمانہ اور ناقدانہ مقدمہ تحریر کیا۔اس کتاب کا پورا متن 421 صفحات پر مشتمل ہے۔رشید حسن خاں اس کتاب سے قبل دو کتابیں 'انشائے غالب(اشاعت 1994، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، کل صفحات 147)اور املاے غالبؔ (اشاعت 2000، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، کل صفحات 216) مرتب کر چکے تھے۔ان کے لیے کلام غالبؔ کا اشاریہ تیار کرنا زیادہ آسان تھا۔کیوں کہ ان کے سامنے غالبؔ کے املا اور انشا کا مواد پہلے ہی سے موجود تھا۔پھر بھی مرحوم نے ایک ایک لفظیات کی تدوین، تصحیح اور ترتیب پر اپنا تن، من اور دھن قربان کیا۔اس صبر آزما کام کے لیے موصوف نے اپنی آنکھوں سے رات دن تنِ تنہا تیل ٹپکایا۔یہی کام اگر کوئی ادبی ادارہ کرتا تو اس کے لیے پوری ٹیم کا انتخاب کیا جاتا اور لاکھوں روپے کا بجٹ بھی دیا جاتا۔لیکن سلام ہو رشید حسن خاں کی ادبی تحقیقی اور تدوینی کاوش کو جنھوں نے بغیر سرکاری امداد کے غالبؔ کے کلام کی شرح مکمل کی کیوں کہ انھیں وہ سہولتیں دستیاب نہیں تھیں جنھیں استعمال کرنے کا انھیں حق تھا۔شاہ

جہاں پور جیسے چھوٹے شہر میں بیٹھ کر اتنا بڑا کارنامہ انجام دینا رشید حسن خاں جیسے تحقیقی سالار کے ہی بس میں تھا۔اس کتاب کے منظرِ عام پر آ جانے کے بعد مرحوم رشید حسن خاں کا شمار شارحینِ غالب میں ضرور کیا جائے گا۔یہ کتاب دیوانِ غالبؔ کو نئے تناظر میں دیکھنے، سمجھنے اور اس کی قرأت میں معاون و مددگار ثابت ہوگی۔اس کتاب سے دیوان غالبؔ کی لفظیات کی جانب ناقدین اور محققین کی توجہ ضرور مبذول ہوگی۔مرحوم خاں صاحب کی تدوینی خدمات کا بار اتنا زیادہ ہے کہ کوئی بھی دورِ حاضر کا مدون اس بار کو اُٹھانے کے لیے تیار نہیں۔ان کے تحقیقی مطالعے کا ہی یہ کمال ہے کہ انھوں نے گنجینۂ معنی کا طلسم کے لیے امتیاز علی خاں عرشی کے تدوین شدہ نسخے کو اپنے کام کی اساس بنایا۔رشید حسن خاں مرحوم کے دیرینہ دوست اور غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے مرحوم کی علمی و تدوینی فتوحات کے علاوہ ادبی کارہائے نمایاں اور اس کتاب کی اشاعت پر اپنی بات کو قارئین کے سامنے پیش کرتے ہوئے لکھا:

> ’’گنجینۂ معنی کا طلسم‘‘ کو شائع کرتے ہوئے مجھے فخر کا احساس ہو رہا ہے۔اس کتاب میں غالب کی شاعری کے الفاظ اور تراکیب کی ایک دنیا ہے جسے دیوان غالب سے الگ کر کے پڑھنا ایک نئے تجربے سے گزرنا ہے اور ان تراکیب کے ساتھ اشعار بھی درج کیے گئے ہیں جن میں یہ تراکیبیں آئی ہیں۔رشید حسن خاں نے اس کتاب کی تیاری میں عمر کا عزیز ترین حصہ صرف کیا ہے اور انھیں آج کی طرح وہ سہولتیں بھی حاصل نہیں تھیں۔اپنے وسائل کو استعمال کر کے انھوں نے جو یہ کارنامہ انجام دیا ہے وہ عملی ادبی کام کرنے والوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا۔اس کتاب سے واضح ہے کہ رشید حسن خاں نے دیوان غالب کی ایک خاص انداز سے قرآت کی ہے اور قرأت کا یہ انداز عام تنقیدی مطالعے سے بہت مختلف ہے۔اسے تنقیدی مطالعہ کے بجائے تحقیقی مطالعہ کہنا چاہیے۔اندازہ کیجیے کہ تحقیقی مطالعہ تنقیدی مطالعے سے کبھی کس قدر اہم ہو جاتا ہے رشید حسن خاں نے دیوان غالب کا جتنی بار مطالعہ کیا ہے وہ ایک واقعہ ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کی اشاعت سے مطالعہ غالب ایک نئی منزل

میں داخل ہو جاتی ہے جو غالب کے قارئین کو نئی سمتوں کی طرف لے جائے گی۔رشید حسن خاں آج ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن ان کی یہ کاوش ان کی موجودگی کا ہمیشہ احساس دلاتی رہے گی۔‘‘

(پیش لفظ،،مشمولہ گنجینۂ معنی کا طلسم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2017، ص7)

یہاں یہ بات واضح کر دوں کہ اس اشاریۂ دیوان غالب سے قبل رشید حسن خاں مرحوم’’ کلاسیکی ادب کی فرہنگ، جلد اوّل‘‘ مرتب کر چکے ہیں۔یہ فرہنگ خاں صاحب کے مرتب کردہ کلاسیکی متون کی شرح ہے۔اس فرہنگ کو انجمن ترقی اُردو ہند نے 2003 میں قارئین کے سامنے پیش کیا۔اس فرہنگ کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔اس فرہنگ کی دوسری جلد پر کام شروع ہو چکا تھا لیکن خاں صاحب کی عمر نے ساتھ نہ دیا۔خوشی کا مقام یہ ہے کہ خاں صاحب نے دیوان غالبؔ کا اشاریہ اپنی زندگی میں ہی ترتیب دے دیا تھا اوراس پر مقدمہ 16 اپریل 2005 کو رقم کیا تھا۔خاں صاحب نے اس کتاب کو نیویارک، امریکہ میں مقیم اپنے عزیز دوست الحاج عبدالوہاب خاں سلیم کی فرمایش پر مرتب کیا تھا۔حیرانی کی بات یہ ہے کہ خاں صاحب نے اس کام سے دیگر علمی کاموں میں مصروفیت کی وجہ سے بے اعتناعی نہ برتی بل کہ اپنے مشن میں رات دن لگے رہے۔یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ دیوان غالبؔ کی لفظیات کی شرح کی تدوین کا کام بھی ہوتا رہا اور دوسری تدوینی کتابیں بھی یکے بعد دیگرے منظر عام پر آتی گئیں۔رشید حسن خاں مرحوم نے عبدالوہاب خاں سلیم کی ادبی اور علمی خواہش اور دوسری علمی باتوں کا خلاصہ 16 اپریل 2005 کو لکھے اپنے مقدمے میں کیا۔لکھتے ہیں:

’’میں محبِ مکرّم الحاج عبدالوہاب خاں سلیم کا خاص طور پر شکر گزار ہوں جن کے پیہم تقاضوں نے اور اصرار نے کام کی رفتار کو سُست نہیں ہونے دیا۔در اصل اس موضوع پر اس انداز کی کتاب مرتب کرنے کی فرمایش اُنھی نے کی تھی۔میں اُن کی بات ٹالتا نہیں، یوں ہامی بھر لی تھی۔عبدالوہاب خاں صاحب میرے مخلص کرم فرما اور غم گسار ہیں۔اُن کے پیہم اصرار کا فیضان ہے کہ درمیان میں کام رُکا نہیں ۔ سچی بات یہ ہے کہ خاں صاحب کی کتاب دوستی اور اُن کا بے مثال خلوص شاملِ حال نہ رہتا تو میں موجودہ حالت میں اِس کام کو

شاید نہ کر پاتا۔'' (ایضاً، ص30)

رشید حسن خاں کو عبدالوہاب خاں سلیم سے اس کام کے سلسلے میں جو انسیت اور محبت تھی وہ کسی سے چھپی نہیں تھی۔ اس لیے خاں صاحب گنجینۂ معنی کا طلسم کی کتابت اور پروف ریڈنگ کا کام کہاں تک مکمل ہو گیا ہے کی اطلاع بہ ذریعہ خط سلیم صاحب کو وقتاً فوقتاً دیتے رہتے تھے۔ رشید حسن خاں نے 8 ستمبر 2005 کو عبدالوہاب خاں سلیم کے نام لکھے خط میں گنجینۂ معنی کا طلسم کے کام کی نوعیت کے بارے میں تحریر کیا:

> ''محبِ مکرّم!
>
> غالبؔ سے متعلق میری کتاب گنجینۂ معنی کا طلسم کے شروع کے حصے کی کمپوزنگ مکمل ہو گئی ہے، کل ہی مجھے یہ پیکٹ ملا ہے تصحیحات بنانے کے لیے۔ میں اپنے مقدمے کے آخری صفحے کا عکس آپ کے ملاحظے کے لیے بھیج رہا ہوں یوں کہ پوری کتاب چھپنے میں تو سال ڈیڑھ سال لگ جائے گا۔ آپ کو یاد کرتا رہتا ہوں۔'' (رشید حسن خاں کے خطوط، 2011، ص744 تا 745)

رشید حسن خاں نے اپنے مقدمے میں اس بات کا خلاصہ بھی کیا ہے کہ اس کتاب کا نام ڈاکٹر اسلم پرویز کا تجویز کیا ہوا ہے۔ موصوف نے ڈاکٹر اسلم پرویز مرحوم (1932-2017) کا شکریہ اپنے مقدمے میں ادا کیا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ ڈاکٹر اسلم پرویز نے بھی ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جس میں کل مضامین 13 ہیں اور اسے غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے 2014 میں شائع کیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ خاں صاحب سے قبل غالب صدی کے سلسلے میں 1970 میں شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی کی جانب سے بھی ایک کتاب ''اشاریۂ کلام غالب'' منظرِ عام پر آ چکی ہے۔ اس کتاب میں غالب کے اُردو فارسی کلام کے منتخب مرکبات کا اکٹھا کیا گیا تھا۔ لیکن یہ کام مکمل نہیں تھا۔ خواجہ احمد فاروقی نے رشید حسن خاں کا نام ان کی مرضی کے خلاف اس کے مرتبین میں شامل کیا تھا۔ بطور مرتب خاں صاحب اس نامکمل کام سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کی نظر میں اشاریۂ غالب کام سلیقے اور قرینے سے ہونا چاہیے تھا۔ اس کام کا خاکہ اُسی وقت سے ان کے ذہن میں گردش کر رہا تھا اور وہ فکر مند تھے کہ یہ کام غالب کی شایانِ شان ہونا چاہیے۔ اس بارے میں مزید

تفصیلات دیتے ہوئے رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''میرے ذہن میں یہ خیال اُسی وقت بیٹھ گیا تھا کہ یہ کام بھی کرنے کا ہے لیکن دوسرے کاموں نے مہلت نہیں دی۔ اس پر تیس بتیس سال گزر گئے۔ زندگی کی محدود مدت میں سب ضروری کاموں کی تکمیل کون کر سکا ہے؛ یہ سوچ کر اب سے دو سال پہلے میں نے اس کام کا ڈول ڈالا۔ یہ بات عام ہے کہ ایسے کاموں میں بہت سی اُلجھنیں سامنے آتی رہتی ہیں، ایسا ہی ہوا۔ بہ ہر طور، زورقِ اندیشہ بہ ساحل رسید۔'' (مقدمہ، گنجینۂ معنی کا طلسم، 2017، ص12)

میں یہ بات کو بھی عرض کر دوں کہ ایک زمانے سے خاں صاحب کلام غالب کی لفظیات سے متعلق خط و کتابت اپنے عزیز و اقارب سے کر رہے تھے۔ تاکہ کلام غالبؔ سے متعلق ایک ایسی فرہنگ تیار کی جا سکے جو سنجیدہ قاری اور طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے بھی کام آئے۔ رشید حسن خاں نے کلام غالبؔ کی لفظیات پر جن ادب نواز ہم نواؤں سے بہ ذریعہ خطوط مشورہ کیا اُن میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، پروفیسر حنیف نقوی، ڈاکٹر صابر سنبھلی، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، اسلم محمود، پروفیسر اصغر عباس، ڈاکٹر ٹی. آر. رینا، ڈاکٹر خلیق انجم، شاہد ماہلی، عبدالرزاق قریشی، پروفیسر علی احمد فاطمی پروفیسر سید عقیل احمد رضوی، مختارالدین احمد، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، یعقوب میرا مجتہدی، عبدالوہاب خاں سلیم وغیرہ کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ان مایہ ناز ادبی شخصیات سے بہ ذریعہ قلم گفت و شنید سے ادب کے طالب علموں خاص کر جہان غالبؔ میں غوطہ لگانے والے قارئین کو بہت سی کارآمد باتیں معلوم ہوئیں۔ رشید حسن خاں کلامِ غالبؔ کی فرہنگ پر دہلی یونی ورسٹی میں ملازمت کے زمانے سے ہی کام کر رہے تھے۔ خاں صاحب غالبؔ انسٹی ٹیوٹ دہلی سے بھی وابستہ تھے۔ وہ اس ادارے میں ایک رکن تھے۔ اس لحاظ سے غالبؔ پر ہونے والی ہر ادبی سرگرمیوں اور سیمناروں کے وہ چشم دید گواہ تھے۔ رسالہ غالبؔ نامہ کی طباعت اور اس میں شامل مضامین پر ان کی گہری نظر تھی۔ اپنے دوستوں کو وہ کلامِ غالبؔ کی تدوین کے لیے آمادہ کرتے تھے۔ تاکہ غالبؔ شناسی میں مزید اضافہ ہو۔ پروفیسر حنیف نقوی کے نام 17 اگست 1984 کو لکھے خط میں کلامِ غالبؔ کی تدوین سے متعلق ضروری باتیں ہیں۔ لکھتے ہیں۔

''غالبؔ کے کلامِ فارسی کی تدوین کو آپ اپنے ذمّے لے لیجیے۔ یہ کام عمر بھر کی کمائی

ثابت ہوگا اور مزید شہرت و ناموری کا سبب بھی بنے گا اور ایک اچھا کام بھی ہو جائے گا۔ظاہر ہے کہ ضروری مآخذ کے عکس آپ کو ملنا چاہیے۔آپ براہِ کرم یہ کیجیے کہ ایک فہرست اُن مآخذ کی بنا دیجیے جن کی ضرورت ہوگی۔''(رشید حسن خاں کے خطوط،2011،ص120)

رشید حسن خاں نے پروفیسر حنیف نقوی کے نام 22 اگست 1999 کو خط تحریر کیا۔جس میں مرقع غالب ملنے اور گنجینۂ معنی کا طلسم کے لیے گوشوارۂ غالب بنانے کی اطلاع دی گئی۔اس بابت انھوں نے لکھا:

''نقوی صاحب !مرقع غالب مل گئی۔فون کیا تھا،آپ تھے نہیں شکر گزار ہوں۔گوشوارۂ غالب کا کام شروع کر دیا ہے،چاہتا ہوں کہ یہ اب مکمل ہو ہی جائے۔چند صفحے بھیج رہا ہوں،طریقۂ کار کے متعلق آپ کی رائے مطلوب ہے۔شروع کے صفحے چھوٹ گئے ہیں اور عکس نہیں بن پایا،دوبارہ اُنھیں بھیج نہیں پایا،آخر میں ''بادشاہ'' کی بحث ناتمام ہے،اگلے صفحے پر بھی آئے گی۔کل سے سارا دن اِسی کام کی نذر کر رہا ہوں۔چاہتا ہوں کہ چھے مہینے میں یہ مکمل ہو جائے۔''(ایضاً،ص201)

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے نام 31 اکتوبر 2004 کو خط تحریر کرتے ہوئے رشید حسن خاں نے گنجینۂ معنی کا طلسم کے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ انھوں نے دیوان غالب میں شامل الفاظ کو مرکب اور مفرد طریقے سے سامنے رکھا ہے۔بار بار آنے والی الفاظ کی نشان دہی کی گئی ہے۔اور حاشیے میں ہر لفظ کی تعداد کو لکھا گیا ہے۔اس بارے میں رشید حسن خاں یوں رقم طراز ہیں۔

''میں نے ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' کی رعایت سے الفاظ کو مفرد اور مرکب کی مناسبت سے سامنے رکھا تھا،تاکہ بہ یک نظر لفظ کے طریق استعمال اور اُس کی معنویت کی آئینہ داری ہو جائے۔اصل دیوان کی ورق گردانی نہ کرنا پڑے اور یہ بھی سامنے آجائے کہ وہ کون سے الفاظ ہیں جو بار بار آئے ہیں اور کن کن معنوی رعایتوں کے ساتھ آئے ہیں۔حاشیے میں ہر لفظ کی تعداد اور مرکب و مفرد کی وضاحت بھی کی تھی،کہ فلاں لفظ اِتنی بار آیا ہے؛مفرد اِتنی بار اور مرکّب اِتنی

بار۔"(ایضاً،ص312)

رشید حسن خاں نے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کو 10 فروری 2005 میں اس بات کی اطلاع دی کہ" غالب والا کام نظرِ ثانی کے لحاظ سے ہنوز نامکمل ہے، دیکھیے مکمل ہوتا ہے کہ نہیں۔ بہ ہر طور جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"(ایضاً،ص153) پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے نام 2 مئی 2005 کو لکھے گئے خط میں رشید حسن خاں نے غالب والے کام کے مکمل ہونے اور اس کی کمپوزنگ ہونے کی اطلاع دی۔ رشید حسن خاں نے 8 جون 2005 میں ہاشمی صاحب کو خط تحریر کرتے ہوئے گنجینۂ معنی کا طلسم کو اپنی زندگی میں ہی مکمل ہونے کی بات سوالیہ نشان کے ساتھ کہی۔ یہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ خاں صاحب اپنی زندگی کے ایام کو بھانپ گئے تھے کہ اب اُن کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔

رشید حسن خاں نے پروفیسر اصغر عباس (سابق صدر اُردو اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) کے نام ایک طویل خط بغیر تاریخ کے تحریر کیا۔ اس خط میں غالبؔ والے کام کو جلد از جلد مکمل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے۔ دراصل خاں صاحب گنجینۂ معنی کا طلسم کے کام کو جلد سے جلد مکمل کر لینا چاہتے تھے۔ کیوں کہ ان کی صحت اب خراب رہنے لگی تھی۔ ان باتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے خاں صاحب رقم طراز ہیں:

> "غالب والا کام رُکا ہوا ہے دو مہینے سے۔ ذرا صحت بحال ہو تو اُسے مکمل کر دوں۔ اُسے بہ ہر طور مکمل کر لینا چاہتا ہوں۔"

(رشید حسن خاں کے خطوط 2011، ص256)

پروفیسر اصغر عباس کے نام ایک اور خط، جس کے سرنامے پر تاریخ درج نہیں ہے، میں رشید حسن خاں گنجینۂ معنی کا طلسم کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

> "میں آج کل غالبؔ کے مکمل کلام نظمِ اُردو کے الفاظ کا توضیحی اشاریہ مرتب کر رہا ہوں۔ آدھے سے زیادہ کام مکمل ہو چکا ہے۔ دعا کیجیے کہ یہ طول طویل اور اُلجھا ہوا کام مکمل کر سکوں۔ یہ ہندوستان کی کسی بھی زبان میں کسی بڑے شاعر کے مکمل کلام کا پہلا توضیحی اشاریہ ہوگا۔" ایضاً،ص257)

رشید حسن خاں گنجینۂ معنی کا طلسم (فرہنگ دیوانِ غالبؔ) کو ہر حال میں مکمل کرنا چاہتے تھے۔ اس کی تیاری میں وہ ہر وقت ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) کے کمپوزر عبدالرشید اس کی

کمپوزنگ کر رہے تھے۔لیکن کاتب کے کمپیوٹر کی خرابی نے رشید حسن خاں کے اس عظیم الشان کارنامے کو شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیا۔خاں صاحب اس کام کو جلد از جلد مکمل کر کے شائع کرنا چاہتے تھے۔لیکن بعض دوسری تحقیقی اور تدوینی سرگرمیوں کے سبب اس کام میں تاخیر ہوتی گئی۔اس طرح یہ کام ادھورا ہی رہ گیا۔رشید حسن خاں نے اپنی وفات سے 4 ر مہینے قبل یعنی 28 اکتوبر 2005 کو انجمن ترقی اُردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کے نام دیوانِ غالبؔ کے متعلق ایک خط تحریر کیا، جس میں کاتب عبدالرشید کے کمپیوٹر کی خرابی اور غالبؔ والے کام کو ملتوی کرنے کے اپنے ارادے سے انجم صاحب کو مطلع کیا۔لکھتے ہیں:

> ''کل عبدالرشید صاحب کا مفصّل خط کوریر سے ملا، اُسی کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا پڑا۔بات یہ کہ انجمن میں صرف وہی ایک شخص ہیں جو کمپوزنگ کا کام کر سکتے ہیں اور انھوں نے اطّلاع دی ہے کہ اُن کے گھر کا کمپیوٹر بگڑ گیا ہے جو دو ڈھائی مہینے سے پہلے سنبھل نہیں پائے گا۔اُن کا سارا دن ہماری زبان اور اردو ادب میں صرف ہو جاتا ہے۔اِسی لیے اُنھوں نے غالبؔ والے کام کو روک دیا ہے، کمپیوٹر ہی نہیں تو کام کیسے ہوگا۔ظاہر ہے کہ جب کمپیوٹر ٹھیک ہوگا تبھی کام شروع ہوگا اور جب وہ مطلع کریں گے اور غالبؔ والے صفحات بھیجنا شروع کریں گے، تبھی اگلا پروگرام بنایا جائے گا۔اِس میں 6-7 مہینے ضرور لگیں گے یہ میرا خیال ہے۔غالبؔ والے کام کو سال ڈیڑھ سال ہو گیا ہے یوں پہلے اُسی کا مکمل ہونا ضروری ہے۔'' (ایضاً، ص 394 تا 395)

رشید حسن خاں نے عبدالوہاب خاں سلیم کے نام خط، مرقومہ 22 اگست 2005 میں لکھا کہ ''غالبؔ والے کام کی کمپوزنگ ہو رہی ہے اور تصحیح بنانا چاہتا ہوں، غالباً سال بھر میں وہ مکمل ہو جائے گا اور کتاب پریس میں چلی جائے گی۔'' (ایضاً، صفحہ 743) پروفیسر علی احمد فاطمی نے جب رشید حسن خاں سے غالبؔ کے اوپر مضامین لکھوانے کی خواہش ظاہر کی تو موصوف نے 11 مارچ 1998 کو خط لکھتے ہوئے بتایا۔''غالبؔ پر مضمون ضرور لکھوں گا، وعدہ کیا ہے تم سے، مگر جب تم غالبؔ نمبر نکالو گے، یا وہاں کسی مذاکرے کا انتظام کرو گے۔اب کسی لکھنے کے لیے کسی تقریب یا بہانے کی ضرورت ہوتی

ہے۔'' (ایضاً،ص 752) اسی طرح خاں صاحب نے یعقوب میراں مجتہدی کے نام 18 اکتوبر 1999 میں مکتوب لکھتے ہوئے لفظیاتِ غالبؔ سے متعلق کام کی نوعیت کے بارے میں مطلع کیا۔لکھا کہ'' میں آج کل میں مرزا غالبؔ کی دستی تحریروں سے الفاظ کا گوشوارہ بنا رہا ہوں کہ اُنھوں نے اپنے قلم سے کس لفظ کو کس طرح اور کس کس طرح لکھا ہے۔اس کے سو صفحے مکمل کر لیے ہیں۔شاید اگلے مہینے کے آخر تک یہ کام مکمل ہو جائے گا۔'' (ایضاً،ص 1035)

عبدالوہاب خاں سلیم کے نام ایک اور خط رشید حسن خاں نے 8/ستمبر 2005 کو تحریر کیا۔اس خط میں غالبؔ والے کام کے شروع کے حصے کی کمپوزنگ مکمل ہونے اور اس کی تصحیح کرنے کی بات تحریر کی۔ساتھ ہی عبدالوہاب خاں سلیم کی آواز کو بار بار سننے کی خواہش بھی ظاہر کی۔اس بارے میں رشید حسن خاں رقم طراز ہیں:

> ''غالب سے متعلق میری کتاب گنجینۂ معنی کا طلسم کے شروع کے حصے کی کمپوزنگ مکمل ہوگئی۔کل ہی مجھے یہ پیکٹ ملا ہے تصحیحات بنانے کے لیے۔میں اپنے مقدمے کے آخری صفحے کا عکس آپ کے پاس ملاحظے کے لیے بھیج رہا ہوں۔یوں کہ پوری کتاب چھپنے میں تو سال ڈیڑھ سال لگ جائے گا،آپ کو یاد کرتا رہتا ہوں۔فون پر ایک دن آپ کی آواز کئی بار سُنی۔''

(مکاتیب رشید حسن خاں، بنام رفیع الدین ہاشمی، جون 2009،ص 182 تا 183)

رشید حسن خاں نے پروفیسر سید عقیل رضوی کے نام 11 ستمبر 2003 کو لکھے خط میں اس بات کی تصدیق کی کہ لفظیاتِ غالبؔ پر کام تیزی سے ہو رہا ہے اور 17 ہزار کارڈ اب تک بن چکے ہیں۔ان کے مطابق اس نوعت کا کام اُردو میں پہلی مرتبہ ہو رہا ہے اور یہ کام سال بھر میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔اس کام کو خاں صاحب تنقید کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے تھے۔تا کہ یہ کام اعلا درجے کا ہو اور ادبی کسوٹی پر کھرا اُترے۔اس بابت انھوں نے لکھا:

> ''لفظیاتِ غالبؔ پر کام ہو رہا ہے۔تقریباً سترہ ہزار کارڈ بنا چکا ہوں۔کلیاتِ نظم اُردو میں مستعمل جملہ الفاظ کا گوشوارہ بنے گا،مع امثلہ۔مقصد یہ ہے کہ تنقید کے نقطۂ نظر سے اس کا تجزیہ کیا جا سکے کہ کن لفظوں کو مرزا صاحب نے کن کن

جہتوں سے استعمال کیا ہے۔مثلاً ان کے کلیدی الفاظ میں ''آئینہ(آئنہ) بھی ہے، بہ یک نظر یہ بات سامنے آسکے کہ ان کے یہاں یہ لفظ کتنی جگہ آیا ہے اور کن معنوں انسلاکات کے ساتھ آیا ہے۔ ہر اندراج کے ساتھ مثال کا شعر بھی ہے، تا کہ دیوان نہ دیکھنا پڑے (نسخۂ عرشی اب ملتا بھی کہاں ہے)۔میرا خیال ہے کہ یہ کام اُردو میں (اور میری معلومات کی حد تک ہندستان کی کسی بھی زبان میں) پہلی بار ہو رہا ہے۔خیال ہے کہ سال بھر میں مکمل ہو جائے گا۔ہاں صاحب تنقیدی نقطۂ نظر سے یہ کسی کام آئے گا؟''

(رشید حسن خاں کے خطوط،2011،ص872)

رشید حسن خاں نے''گنجینۂ معنی کا طلسم'' کو 16اپریل2005 کومقدمہ لکھ کر مکمل کیا۔اس مقدمے کو موصوف نے بنیادی مآخذ،املا،ترتیب الفاظ،بہ سلسلۂ مرکبات،چند وضاحتیں،استثنااور غیر معتبر کلام کے عناوین کے تحت تقسیم کیا۔مقدمے کی ابتدامیں رشید حسن خاں نے لفظ کے متحرک ہونے اوراس کے باطن میں چھپی ہوئی معنویت پر بحث کی ہے۔باطن لفظوں کی معنویت اوران کا اشعار سے جو گہرا تعلق ہوتا ہے، جسے قاری پہلی ہی قرأت میں پہچان لیتا ہے۔لیکن کچھ اشعار ایسے بھی ہوتے ہیں جو بار بار قرأت کرنے پر ہی سمجھ میں آتے ہیں۔غالب کی شاعری کی تہہ داری کا راز اسی میں پنہاں ہے۔رشید حسن خاں کے نزدیک غالب کے اشعار میں بیان کی وسعت اوراس کی کارفرمائی نے مرکبات کی شکل لے کرایک خاص طرز کی صورت گری سے قاری کو روشناس کرایا ہے۔اس کے تحت خاں صاحب نے غالب کے اُن اشعار کونمونے کے طور پر پیش کیا جن میں''یک''اور''دو''الفاظ آئے ہیں۔اسی سلسلے کواور دراز کرتے ہوئے خاں صاحب نے مرزا غالب کے ان اشعار کی بھی درجہ بندی کی ہے جن میں موسیقی اور نغمگی کے عنصر موجود ہیں۔ساتھ ہی خاں صاحب دیوانِ غالب نسخہ عرشی میں شامل مفرد اور مرکب الفاظ اور کلیات نظم فارسی کے صرف مرکبات کو بھی اس اشاریے میں شامل کیا ہے۔رشید حسن خاں نے اس بات کا بھی اہتمام کیا کہ جوقدیم اُردو قواعد ہے اس میں جو اسم،فعل اور حرف کی تقسیم کی گئی ہے کتاب کے پہلے حصے میں اسموں کے مفردات اور مرکبات کو شامل کیا جائے اور دوسرے حصے میں افعال،حروف اور فارسی مرکبات کو رکھا جائے۔ساتھ ہی مفرد اور مرکب الفاظ کے ساتھ غالب کا ایک ایک شعر بہ طور

مثال لکھا جائے۔ان کی نظر میں اس سے دو فائدے ہوں گے اول الفاظ شماری کی تکمیل اور دوم لفظ شماری کے ساتھ ساتھ لفظوں کی معنوی وسعت بھی نگاہوں کے سامنے آجائے گی۔رشید حسن اشاریۂ غالب کی تیسری جلد میں افعال اور حروف کے ساتھ متعلقہ شعر کو شامل نہیں کرنا چاہتے ہیں۔لیکن فارسی مرکبات کے ساتھ اشعار کو نقل کرنے کا ان کا ارادہ ہے۔

اب میں رشید حسن خاں کے مقدمے میں شامل بنیادی مآخذ پر گفتگو کرنے کی جسارت کروں گا۔بنیادی مآخذ کے تحت رشید حسن خاں نے لکھا ہے کہ ان کے سامنے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے دو دیوان، دیوان غالب نسخۂ عرشی طبع اول 1958 اور طبع ثانی 1982 تھے۔لیکن انھوں نے اپنی تدوین ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' کی بنیاد نسخۂ عرشی طبع اول 1958 کو بنایا۔اشاعت ثانی کو انھوں نے محض معاون نسخے کے طور پر استعمال کیا۔کیوں کہ خاں صاحب کے نزدیک طبع ثانی کے مقدمے میں عرشی زادے نے ضرورت سے زیادہ اپنی دخل اندازی کی ہے۔اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ جب مولانا عرشی بیمار تھے اور یہ نسخہ انجمن ترقی اُردو (ہند) میں اشاعت کے لیے آیا تو ان کے صاحب زادے یعنی عرشی زادہ نے اس کے سرورق پر مولانا عرشی کے نام کی جگہ اپنا نام عرشی زادہ تحریر کیا تھا۔ڈاکٹر خلیق انجم (ناظم انجمن ترقی اُردو (ہند) اور مالک رام (صدر انجمن ترقی اُردو (ہند) دونوں یہ چاہتے تھے کہ طبع ثانی کے سرورق پر مولانا عرشی کا نام لکھا ہونا چاہیے نہ کہ عرشی زادے کا۔بہر کیف! رشید حسن خاں نے اپنے سامنے دونوں نسخوں کے علاوہ تفسیر غالب (مصنف گیان چند جین) کو رکھا تا کہ اشعار کے متن کا میلان کیا جا سکے اور اشعار کے متن میں اختلافات سے بچا جا سکے۔ساتھ ہی دیوانِ غالب، نسخۂ کالی داس گپتا رضا سے بھی استفادہ کیا۔ان کے علاوہ گل رعنا مرتب مالک رام اور نسخۂ حمیدیہ اور نسخہ شیرانی بھی ان کے پیش نظر تھے۔ان تمام نسخوں کو سامنے رکھ کر کام کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان نسخوں میں جو متن کی غلطیاں در آگئی ہیں انھیں درست کیا جائے۔رشید حسن خاں نے ایسے اشعار کو نقل کیا ہے جو مختلف نسخوں میں علاحدہ علاحدہ لکھے گئے ہیں۔میں اس حوالے سے رشید حسن خاں کا ایک بیان نقل کرتا ہوں:

''صبا! نگاہ تپانچہ طرف سے بلبل کے
کہ روئے غنچۂ گل سوئے آشیاں پھر جائے

طبع اول کے متن میں مصرع یوں ہے: صبا، لگا وہ طپانچہ طرف سے بلبل

کی (ص305)؛ لیکن اس کے غلط نامے میں لکھا گیا ہے کہ ''بلبل کی'' غلط ہے، صحیح ''بلبل کے'' ہے۔ طبع ثانی کے متن میں یہ مصرع یوں لکھا ہوا ہے؛ صبا، لگا وہ طپانچے طرف سے بلبل کی [ص427]۔ اِس نسخے کے استدراک میں یا متعلقہ حاشیے میں یہ نہیں لکھا گیا کہ طبعِ اول کے غلط نامے میں ''بلبل کے'' کو صحیح لکھا گیا ہے اور یہ کہ اُسے نہ ماننے کی وجہ کیا ہے۔ یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ طبعِ اول میں ''طپانچہ'' ہے، اُسے ''طپانچے'' کیوں بنایا گیا۔''

(مقدمہ، گنجینۂ معنی کا طلسم، مرتب رشید حسن خاں، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2017، ص20)

رشید حسن خاں نے ''املا'' کی بحث میں میں دو الفاظ ''پیچ و تاب''، ''خرّم'' پر عالمانہ گفتگو کی ہے۔ ساتھ ہی غالبؔ کے اشعار میں توقیت نگاری کے مسائل پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ انھوں نے غالب کے اشعار کی مثال دے کر لفظ ''پیچ و تاب'' کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ غالب اپنے خطوط اور اشعار میں لفظ ''پیچ و تاب'' کو ترجیح دیتے تھے۔ جب کہ نسخۂ عرشی طبع اول میں لفظ ''پیچ و تاب'' ہے اور اشاعت ثانی میں ''پیچ تاب'' ملتا ہے۔ رشید حسن خاں نے اپنی تدوینی تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ طبع ثانی کے پندرہ مصروعوں میں سے چھے مصروعوں میں ''پیچ و تاب'' ملتا ہے، پانچ مصروعوں میں ''پیچ تاب'' اور چار مصرعوں میں ''پیچتاب'' کا استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن دیوان غالب اشاعت اول نسخۂ عرشی میں لفظ ''پیچ و تاب'' کو فوقیت کی بنا پر اسی کو مرجح قرار دیا گیا۔ ''پیچ و تاب کی طرح لفظ ''خرّم'' بھی ناقدانہ گفتگو کی گئی ہے۔ کیوں کہ مرزا غالب نے اپنے کلام اور خطوط دونوں میں لفظ ''خورّم'' کا استعمال کیا ہے۔ اس بات کی مزید تصدیق خطوط غالب کے عکس سے ہو سکتی ہے جو مرقع غالب میں شامل کیے گئے ہیں۔ رشید حسن خاں نے غالب کے املا سے متعلق بحث کو اپنی کتاب ''املاے غالب میں شامل کیا ہے۔ اس کتاب میں غالب کے املا سے متعلق مکمل بحث ہے۔ اس بات کو رشید حسن خاں نے اپنے مقدمے میں بھی تحریر کیا ہے کہ اگر کسی شخص کو غالب کے املا سے متعلق کچھ معلومات کرنی ہے تو وہ میری کتاب املاے غالب کا مطالعہ کرے۔ اس بارے میں رشید حسن خاں رقم طراز ہیں:

''اس خیال کے پیش نظر مرزا صاحب کے کلام میں اُن کے منشا کے خلاف املائی صورتیں جگہ نہ پا سکیں، میں نے املاے غالب کے نام سے ایک کتاب مرتب کی

تھی جو چھپ چکی ہے۔مقصود یہ تھا کہ مرزا صاحب کے اُردو فارسی کلام کے مرتبین اور ناقلین جن مشکلات اور مسائل سے دو چار ہو سکتے ہیں، اُن کی نشان دہی کی جائے۔یہ بھی واضح کیا جائے کہ مرزا صاحب نے اپنے قلم سے کس لفظ کو کس طرح لکھا ہے یا کس طرح لکھنے کی ہدایت کی ہے۔میں نے اپنی اس کتاب میں املاے غالب کے مندرجات کی پابندی کی ہے۔اس کتاب میں شامل اشعارِ غالبؔ کے کسی لفظ کے املا سے متعلق کوئی بات دریافت طلب ہو تو املاے غالب کو دیکھا جائے۔''(ایضاً،ص24)

اسی طرح پنکچویشن سے متعلق بحث میں بھی خاں صاحب نے اس جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ غالب کے اشعار میں پنکچویشن کا صحیح استعمال نہیں کیا گیا ہے۔اس کی تفصیل کے لیے بھی ہمیں املاے غالب کی جانب رُخ کرنا ہوگا۔

ترتیبِ اشعار سے بحث کرتے ہوئے رشید حسن خاں نے''گنجینۂ معنی کا طلسم'' کی جلد اول کے بارے میں لکھا ہے کہ''پہلے مفرد الفاظ کو حرف تہجی کی تریب کے مطابق لکھا گیا ہے۔پھر ہر لفظ کے ساتھ نمبر شمار کیا گیا ہے جس میں وہ لفظ آیا ہے اور ہر شعر کے آخر میں صفحہ نمبر درج کیا گیا ہے۔''رشید حسن خاں نے اس بات کا خاص اہتمام کیا کہ مرکبات کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔تاکہ قاری بہ آسانی انھیں پہچان سکے۔یعنی ایک وہ مرکب جن میں متعلقہ لفظ مرکب کا جزو اول ہے جیسے''اشک''۔اس کے تحت''اشک اور چشمِ سرمہ آلود''۔مرکبات کی دوسری درجہ بندی میں وہ مرکب شامل ہیں جو لفظ کے درمیان میں آئے ہیں یا آخر میں۔رشید حسن خاں نے ایسے لفظوں کے سامنے نمبر شمار تو لکھ دیے لیکن اشعار نہیں لکھے ہیں۔تیسرے حصے میں وہ مرکبات شامل ہیں جن میں متعلقہ لفظ مرکب کا پہلا جُز ہے۔ایسے مرکبات کے سامنے خاں صاحب نے شعر بھی لکھ دیے ہیں۔یہاں یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ غالب کے کلام میں مفرد الفاظ سے زیادہ مرکب الفاظ کا زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ان تمام امور کا احاطہ کرتے ہوئے رشید حسن لکھتے ہیں:

''ہر حرف کے تحت حصۂ اول کے مفرد الفاظ کو اور تیسرے حصے کے مرکبات کے پہلے لفظ کو(جو شمار میں آئے گا) جلی لکھا جائے۔دوسرے حصے کے مرکبات میں

شمار کے لیے نمبر شمار کے دائرے کو اور اُس میں مندرج نمبر شمار کو جلی لکھا جائے گا۔اس طرح سب لفظوں کو بہ آسانی شمار کیا جا سکتا ہے۔مزید یہ کہ حاشیے میں ہر لفظ کے متعلق یہ لکھا گیا ہے کہ وہ کُل کتنی بار آیا ہے۔یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کتنی بار بہ طورِ مفرد آیا ہے اور کتنی بار بہ طورِ مرکب۔مثلاً الف ممدوح کے تحت پہلا لفظ''آب'' ہے۔اس کے حاشیے میں لکھا گیا ہے کہ یہ لفظ کُل باون بار آیا ہے؛ بہ طورِ مفرد نو بار بہ طورِ مرکب تینتالیس بار۔اس طرح یہ بات بھی سامنے آ گئی کہ مرزا صاحب کے کلام میں مفرد اور مرکب الفاظ کا عمومی تناسب کیا ہے۔یہ معلوم ہو سکے گا کہ مفردات کے مقابلے میں مرکبات کا اوسط زیادہ اور بہت زیادہ ہے۔اس تناسب کو نظر میں رکھ کر مرزا صاحب کی شاعری میں خیال اور اظہار کے کئی اہم پہلوؤں پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔اس سلسلے میں اس کا لحاظ رکھا جانا چاہیے کہ جن الفاظ کے ساتھ مفرد یا مرکب نہ لکھا ہو، اُنھیں مفرد سمجھا جائے۔''(ایضاً،ص25)

رشید حسن خاں نے بہ سلسلۂ مرکبات کی بحث میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ جو الفاظ دو یا دو سے زیادہ اجزا سے مل کر بنے ہیں لیکن ایک کلمے کے طور پر استعمال میں آتے ہیں ،ایسے لفظ جو کسی اسم یا فارسی کے فعلِ امرِ حاضر سے مل کر بنے ہیں جنھیں قواعد کی زبان میں اسمِ فاعل سماعی کہا جاتا تھا، جیسے دل کش،راہ رو،رہ نما خوش فشاں،حاشیہ بردار،محفل آرا،بُت پرست،غریب نواز،ذائقہ شناس وغیرہ۔ایسے مرکبات میں انھوں نے یاے مصدری (ی۔ئی) کا لاحقہ شامل کر لیا ہے۔جیسے بُت پرستی،دل نوازی،رہ نمائی،خوں فشانی،دل ربائی وغیرہ۔رشید حسن خاں نے سلسلۂ مرکبات کی وضاحت میں چند تاویلات پیش کی ہیں۔لکھتے ہیں:

''اسی انداز کے دوسرے مرکبات مرزا صاحب کے کلام میں بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ایسے لفظوں نے کلام کی معنویت اور بیان کی رنگا رنگی میں بہت اضافہ کیا ہے۔یہ سب بہ لحاظِ اصل مرکب الفاظ ہیں؛مگر ان کی ساخت ایسی ہے کہ یہ ایک کلمے کے طور پر استعمال میں آتے ہیں اور اسی طرح اشعار میں

آ ئے ہیں۔ایسے سبھی مرکب ٹکڑوں کو،جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے،ایک کلمے کے طور پر جلی لکھا گیا ہے مگر شمار میں ان سب کو مرکب کلمے مانا گیا ہے۔'' (ایضاً،ص25)

رشید حسن خاں نے اپنے مقدمے میں چند وضاحتیں عنوان کے تحت گیارہ نکات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ان نکات میں ان امور کی جانب توجہ مبذول کی گئی جن کا تعلق لفظ کی ساخت سے ہے۔اس معاملے میں رشید حسن خاں نے لکھا ہے کہ اگر اصل لفظ کی دو شکلیں اشعار میں موجود ہیں تو انھیں مستقل طور پر دو الفاظ مانا جائے گا۔جیسے راہ اور رہ، راہ گزر اور رہ گزر وغیرہ۔اسماے جمع کو بھی انھوں نے مستقل لفظ مانا ہے۔جیسے لالہ ہا،گل ہا، راتیں اور باتیں اسماے اعداد کو بھی اسی زمرے میں رکھا گیا ہے۔کلماتِ تحسین و تعجب،کلمات تاسف کو بھی مختلف لفظ مان لیا گیا ہے۔رشید حسن خاں نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ دیوانِ غالب کے اشعار کے متن میں تبدیلی نہ کی جائے۔موصوف نے لفظ ''آپ''، ''اور''، ''سِوا'' اور ''گویا'' پر بحث کرتے ہوئے لکھا کہ جو لفظ جس معنی میں آیا ہے اُسے اُسی معنی میں پڑھا جائے۔''

رشید حسن خاں نے استثنا کے حوالے سے لکھا ہے لفظ از اور کی دوسری شکلوں ''ز،با، بر، براے، بہہ، در، یہ سب حرفِ جار ہیں۔انھیں شمار میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔لیکن ایسے الفاظ جو اس حرفوں سے مل کر ایک کلمے کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں ایسے الفاظ کو مستثنا لفظوں کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔مقدمے کے آخر میں رشید حسن خاں نے غیر معتبر کلام کے متعلق چند معروضات پیش کیے ہیں۔ان کا ماننا تھا کہ نسخۂ عرشی اشاعت اول میں چند غیر معتبر اشعار شامل ہو گئے تھے لیکن طبع ثانی میں اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ انھیں اس نسخے سے نکال دیا جائے۔رشید حسن خاں نے یہ بھی تحریر کیا کہ انھوں نے اپنے تدوینی نسخے میں غیر معتبر کلام کو شامل نہیں کیا ہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم کا پورا مقدمہ ادبی مباحث کا نادر مرقع ہے۔پورے مقدمے میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ غالب کے اشعار میں موجود مفرد اور مرکب الفاظ کو کہاں، کیسے اور کیوں استعمال کیا ہے۔''گنجینۂ معنی کا طلسم''، کتاب کے شائع ہونے سے غالب کے کلام اور اس کے اشاریے پر کام کرنے والوں کے پاس مواد کی فراہمی دستیاب ہو گئی ہے۔ساتھ ہی ایک صحت مند اور صالح تنقید کا رواج بھی عام ہو گا۔متانت اور سنجیدگی سے اشعار کی قرأت کرنے والے قاری کے لیے یہ اشاریہ کسی علمی و ادبی تحفے سے

کم نہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ جہان غالب کے باب میں یہ کتاب سنگِ میل ضرو ثابت ہوگی۔محبان رشید حسن خاں اوران کی تحقیقی وتدوینی کارناموں سے فیض حاصل کرنے والوں کے لیے بھی یہ کتاب ایک معجزہ ہے۔ایک طویل عرصے سے اس کتاب کا بے صبری سے انتظار ہو رہا تھا۔یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ مرزا غالب اور رشید حسن خاں کی پیدائش کا مہینا دسمبر ہی ہے۔سال 2017 جو غالب کا220واں اور رشید حسن خاں کا85واں یوم ولادت تھا۔اس موقع پر اس کتاب کا منظر عام پر آنا خوش آئین بات ہے۔

(ادب وثقافت،مولانا آزاد نیشنل اُردو یونی ورسٹی،حیدرآباد،ستمبر 2018،ص286 تا304)

(ماہ نامہ قومی زبان،کراچی،فروری 2019،ص13 تا26)

نوٹ:مجلسِ ترقی ادب،۲۔نرسنگھ داس گارڈن،کلب روڈ،لاہور سے ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' کی تینوں جلدیں یکجا کر کے 2019 میں شائع کر دی گئی ہیں۔کتاب کا 'حرفے چند' ڈاکٹر تحسین فراقی نے رقم کیا۔

○○○

رشید حسن خاں کی غالب شناسی

لطف الرحمٰن بہ نام رشید حسن خاں

محترم رشید حسن خاں صاحب، تسلیمات،

آپ نے 13 مارچ 1989 کو تحریر فرمایا تھا ''کراچی سے میری کتاب غالب فکر وفن شائع ہوئی ہے۔ارے صاحب! میری کوئی کتاب اس نام کی نہیں اور نہ کراچی سے میری کوئی کتاب چھپی ہے۔اگر ایسی کوئی کتاب ہے تو پھر وہ جعلی کتاب ہے۔میرا اس سے کچھ واسطہ نہیں۔میں نے تو اسے دیکھا نہیں۔''

میرے محترم کتاب پیش کرتا ہوں ۔یہ جعلی ہے یا اصل اس کا مقصد خود فرمائے۔آپ کا اس سے کوئی واسطہ ہو یا نہ ہو کتاب تو دیکھ لیجیے۔کتاب آپ کے نام سے شائع،اور وہ بھی غالب پر کیسے ممکن تھا کہ اسے نہ خریدتا۔

مخلص

لطف الرحمٰن خاں

یک شنبہ 7 مئی 1989

بی149 غالب نما، حالی روڈ، گل گشت، ملتان60700

(غالب فکروفن، مرتب رشید حسن خاں، غالب اکیڈمی، کراچی، اشاعت 1987)

نوٹ: ''غالب فکروفن'' نام کی کوئی کتاب رشید حسن خاں نے مرتب نہیں کی۔اس کتاب میں رشید حسن

خاں کا کوئی مضمون شامل نہیں ہے۔اس کتاب میں جن مقالہ نگاروں کی تحریں شامل ہیں ان کے اسما اس طرح ہیں: ڈاکٹر ظ انصاری (نشاط کا شاعر)، پروفیسر امیر حسن عابدی (غالب اور سبکِ ہندی)، ڈاکٹر عابد پیشاوری (غالبؔ، حالیؔ، شیفتہؔ اور ہم)، کاظم علی خاں (تیغ تیز پر ایک نظر)، اور ڈاکٹر شریف حسین قاسمی (غالبؔ اور تذکرۂ آفتابِ عالم تاب)۔غالب فکر وفن کی ضخامت 120 صفحات ہے۔مزید تفصیل کے لیے احقر کا مضمون ''رشید حسن خاں سے منسوب جعلی کتابیں'' کا مطالعہ کیجیے۔مرتب۔

○○○

رشید حسن خاں

غالب فکر و فن

(جعل سازی کا ایک نمونہ)

پچھلے مہینے میرے ایک کرم فرمانے دریافت کیا ہے کہ آپ نے اپنی مرتبہ کتاب 'غالب فکر و فن' میں مقدمے یا پیش لفظ کے نام سے کچھ نہیں لکھا۔ یہ معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ آخر آپ نے اس کتاب کو مرتب کیوں کیا۔ اس میں پانچ مضامین شامل ہیں اور یہ پانچوں مضمون غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے رسالے ''غالب نامہ'' میں چھپ چکے ہیں۔ آخر ان مضامین کو کتاب میں جمع کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ان میں ایک مضمون بھی ایسا نہیں جس میں کوئی ایسی بات لکھی گئی ہو جسے انکشاف یا دریافت کہا جا سکے۔ ان میں وہی باتیں لکھی گئیں ہیں جو پہلے لکھی جا چکی ہیں۔ آپ پیش لفظ کے نام سے ایک صفحہ تو لکھ ہی سکتے تھے۔ اس کتاب میں ساتویں صفحے پر ''انتساب'' ہے، اُس کے نیچے آپ کے دستخط ہیں۔ یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ یہ آپ ہی کے دستخط ہیں؟

میں نے اپنے کرم فرما کے خط کے جواب میں جو کچھ لکھا، اس کا خلاصہ اس تحریر میں درج کر رہا ہوں۔ اس خیال سے کہ اس تحریر کی حیثیت ''اعلانِ عام'' کی ہو جائے اور آیندہ کسی طرح کی غلط فہمی نہ پیدا ہو، اسے 'ہماری زبان' میں اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں۔

یہ بات ہے مارچ 1989 کی، میرے کرم فرما لطف الرحمٰن خاں صاحب نے ملتان سے بہ طورِ شکایت اپنے خط میں لکھا کہ آپ نے اپنی نئی کتاب ''غالب فکر و فن'' مجھے نہیں بھیجی، آخر کیوں۔ میں نے فوری طور پر ان کے خط کا جواب لکھا، یہ وضاحت کی کہ میں نے غالبؔ سے متعلق کوئی کتاب لکھی ہی نہیں، آپ کو کیا بھیجتا۔ انھوں نے اس کے جواب میں ایک پیکٹ بھیجا، جس میں 'غالب فکر و فن' نام کی ایک چھپی ہوئی کتاب تھی، اُسی کتاب کے سرورق کے اندرونی سادہ صفحے پر خط لکھا، جو درجِ ذیل ہے:

''محترم رشید حسن خاں صاحب، تسلیمات

آپ نے 13 مارچ 1989 کو تحریر فرمایا تھا'' کراچی سے میری کتاب غالب فکر وفن شائع ہوئی ہے۔ارے صاحب! میری کوئی کتاب اس نام کی نہیں اور نہ کراچی سے میری کوئی کتاب چھپی ہے۔اگر ایسی کوئی کتاب ہے تو پھر وہ جعلی کتاب ہے۔میرا اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ میں نے تو اسے دیکھا نہیں۔''

میرے محترم کتاب پیش کرتا ہوں۔یہ جعلی ہے یا اصل اس کا مقصد خود فرمائے۔آپ کا اس سے کوئی واسطہ ہو یا نہ ہو کتاب تو دیکھ لیجیے۔کتاب آپ کے نام سے شائع،اور وہ بھی غالب پر کیسے ممکن تھا کہ اسے نہ خریدتا۔

مخلص

لطف الرحمٰن خاں

یک شنبہ 7 مئی 1989 ''

کتاب پر میرا نام لکھا ہوا تھا، یعنی چھپا ہوا تھا، اس طرح: ''غالب فکر وفن/مرتب/رشید حسن خاں/غالب اکیڈمی کراچی'' چوتھے صفحے پر لکھا ہوا ہے: اشاعت 1987، قیمت تیس روپے''۔صفحہ پانچ پر فہرستِ مضامین ہے، پانچ مضامین ہیں مندرجہ ذیل حضرات کے: ڈاکٹر ظ انصاری، پروفیسر امیر حسن عابدی، ڈاکٹر عابد پیشاوری، کاظم علی خاں، ڈاکٹر شریف حسین قاسمی۔ساتویں صفحے پر انتساب ہے: ''ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔شاہد ماہلی''۔اس کے نیچے میرے دستخطوں کی نقل ہے، جو واضح طور پر جعل سازی کا کرشمہ ہے۔کسی خاصے اناڑی نے یہ جعل بنایا ہے۔جتنے لوگوں نے خطوں میں میرے دستخط دیکھے ہیں، وہ بلا تامّل کہہ دیں گے کہ یہ ان کے دستخط نہیں، کسی نے بنائے ہیں۔

یہ میرا فرض تھا کہ میں اسی زمانے میں اس کی وضاحت کر دیتا کہ نری جعل سازی ہے، اس کتاب سے میرا کچھ تعلق نہیں۔مگر ایسا نہیں ہو سکا، یوں کہ دوسرے ضروری کاموں میں ایسا اُلجھا کہ یہ بات ذہن سے نکل گئی۔غالب انسٹی ٹیوٹ نے 1998 میں ''غالب ببلیو گرافی'' نام کی کتاب چھاپی ہے، اس میں صفحہ 39 پر اس کتاب کا بھی اندراج ہے میرے نام سے۔یعنی اب اس پر مُہر بھی لگ گئی۔اب جو میرے ان کرم فرما کا خط آیا تو میں نے ضروری سمجھا کہ صورتِ حال کی وضاحت کر دی جائے تاکہ غلط فہمی

کے لیے مزید گنجایش نہ پیدا ہو اور یہ بات معلوم ہو جائے کہ اس کتاب سے میرا کچھ واسطہ نہیں، کوئی تعلق نہیں۔کسی نے غالباً تجارتی مفاد کی خاطر یہ جعل بنایا تھا۔اس پر جو میرے دستخط بنے ہوئے ہیں وہ بھی جعلی ہیں۔ہاں میں یہ کتاب انجمن ترقی اُردو (ہند) کے کتاب خانے میں داخل کیے دے رہا ہوں اس خیال سے کہ جعل سازی کا یہ نمونہ محفوظ ہو جائے اور یوں بھی کہ کوئی صاحب اگر اسے دیکھنا چاہے تو دیکھ سکیں۔لطف الرحمٰن خاں کا خط بھی اس کے صفحہ 2 پر مندرج ہے انھی کے قلم کا لکھا ہوا۔

(ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی 8 تا 14 اگست 2000، شمارہ نمبر 30 جلد نمبر 59، ص اول)

ooo

رشید حسن خاں

غالب کے خطوط (جلد اوّل)

(مرتب: خلیق انجم)

غالبؔ کے خطوط کی پہلی جلد اب چھپ کر سامنے آئی ہے، جس کو دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے اور آنکھو کی روشنی بڑھ جاتی ہے۔ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات لکھ رہا ہوں کہ خلیق انجم صاحب نے بہت دل لگا کر اور نظر جما کر اس کام کو انجام دیا ہے۔ انھوں نے بہت صبر و تحمل کے ساتھ کئی سال صرف کیے متن کی تصحیح پر، اور بہت سا وقت خرچ کیا متن سے متعلق حواشی لکھنے پر، انھوں نے ضروری مصادر اور مآخذ کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ یہ قیاس نہیں، میں یہ بات ذاتی معلومات کی بنا پر لکھ رہا ہوں۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ انھوں نے تلاش و جستجو کا حق ادا کرنے کی ایمان دارنہ کوشش کی ہے، اور جدید اصولِ تدوین کی روشنی میں متن کو مرتب کیا ہے۔

میں خلیق انجم صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُن کی اِس کتاب سے جہاں غالبؔ شناسی کے ذخیرے میں اہم اضافہ ہوگا، وہاں غالبؔ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کی فہرست مطبوعات میں ایک ایسی کتاب کا اضافہ ہوگا جسے صحیح معنوں میں اہم کتاب کہا جا سکے گا۔ ایسی اہم کتاب جس کا مطالعہ ہر غالبؔ شناس کے لیے ازبس ضروری ہے۔

(غالب کے خطوط، مرتب خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، کتاب کا بیک فلیف، اشاعت 2011)

○○○

”دستنبو“ کا اُردو ترجمہ
”رستخیز بے جا“
(۱۲۷۴ھ۔۱۸۵۷ء)
مترجم: رشید حسن خاں

بہ نامِ خداوندِ پیر و زگر
مہہ و مہر ساز و شب و روزگر

....

میں اس کتاب کا آغاز کرتا ہوں اُس خدا کے نام سے جو کامیابی بخشنے والا ہے جو چاند، سورج اور دن، رات کا خالق ہے۔

دیباچہ

عظیم طاقت کا مالک ہے وہ شہنشاہ جس نے نو آسمانوں کو بلند کیا اور سات ستاروں کو روشنی عطا کی۔ بڑا صاحبِ علم ہے وہ خدا جس نے جسم کو روح سے سرفراز کیا اور انسان کو حکمت و انصاف (کی دولت) بخشی۔ جس نے مادّے اور وسائل کی مدد کے بغیر سات (زمینوں) اور نو (آسمانوں) کو پیدا کیا۔ مشکل اور آسان کاموں کا بن جانا (اِس سلسلے میں راستے کی) معمولی رکاوٹوں کا دور ہونا (ان سب اُمور کو) ان کی رفتار واثرات سے متعلق کیا۔

(خدا نے) ان ضابطوں کو اس طرح مرتب نہیں کیا کہ یہ اجرام جو باہم متضاد ہیں (مختلف صفات رکھتے ہیں) ایک دوسرے سے دور دور رہتے ہیں اور (کبھی) ایک جگہ جمع ہو جاتے، طاقت کے باوجود فرماں برداری نہ کریں اور قوتِ کارفرمائی اور صلاحیتِ تاثیر کے باوصف فرمانِ (قدرت) کے تابع ہوں:

> ''تم آسمانوں اور ستاروں کے راز (جاننے) کا کیا دعوا کرتے ہو تم تو ابھی تک چت اور پٹ کے فرق سے واقف نہیں ہو۔ ستاروں کی پرستش نہ کرو (ان کو دنیا کے کاموں میں مطلق صاحبِ اختیار نہ مانو) کیوں کہ ایک آفتاب (خدا) بھی موجود ہے، جس کی روشنی (کائنات کی تمام) ظاہر و پوشیدہ چیزوں کو حلقے میں لیے ہوئے ہے۔''

اگر زہرہ و مشتری میں (سعد ہونے کے لحاظ سے) فائدہ پہنچانے کی کچھ صلاحیت ہے (تو ہو) اور زحل و مریخ میں (نحس ہونے کے اعتبار سے) نقصان رسانی کی خاصیت ہے تو ہوا کرے، جو لوگ واقفِ

حقیقت ہیں، وہ جانتے ہیں کہ نحوست و برکت اور مسرّت وغم کا سرچشمہ کہاں ہے۔ستارے ایک عادل شہنشاہ کے ملازم ہیں (اس) عدالت کے سپاہی کبھی حلقۂ انصاف سے قدم باہر نہیں نکالتے ہیں۔مِل جُل کر کام کرنے اور کارسازی (تعمیلِ حکم) کے علاوہ ان کو کسی چیز سے تعلق نہیں۔اگر ان میں سے کسی نے سخت گیری کے (وسیلے سے) اُلجھے ہوئے کاموں کو سُلجھانا چاہا، یا کسی نے نرمی کے (ذریعے) سے ہنگامۂ زندگی کی رونق افزائی کی، تو یہ سب زندگی کو) بنانے سنوارنے اور (مشکل کو حل کرنے) کے مختلف انداز ہیں؛ظلم یا بے نیازی نہیں:

> ''مُغنّی ساز کے تاروں پر مضراب سے ضرب لگاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے
> اس کا مقصد کیا ہوتا ہے۔مسرّتیں مصیبتوں کے پردے میں چھپی ہوئی ہیں۔
> دھوبی غصّے میں آکر کپڑے کو پتّھر پر نہیں مارتا۔''

درحقیقت کسی چیز کا فنا ہونا کسی دوسری چیز کے وجود کا سبب بنتا ہے۔حقیقتاً آرام وتکلیف اور بلندی وپستی ساری چیزیں (خدا کی طرف سے) انسان کو ملتی ہیں، اس لیے وہ سب فائدے اور بہبودی کا وسیلہ بن جاتی ہیں، اور ان سے مسرّتیں حاصل ہوتی ہیں۔دولت مند کسی محتاج کو چند پیسے دے یا ہزاروں روپے، ریشم کے تھان عطا کرے یا کمبل (ہر صورت میں) سخاوت اور درویش پروری ہے۔قدرت کے عطیّات کو اچھائی بُرائی کے خانوں میں تقسیم کرنا یا کمی بیشی (کا الزام رکھنا) کج خیالی وکم فہمی ہے۔

یہ دُنیا کی بے حقیقت چیزیں جو (فنا کے طاقت ور تھپیڑوں کے) سامنے ہیچ ہیں، کیا ان کے لیے یہ بخششِ (خداوندی) کچھ کم ہے کہ وہ موجود ہیں۔

لیکن یہ (دقیق) باتیں کم نظر اور کم معرفت لوگوں کی رسائیِ ذہن سے باہر میں اور اظہارِ بیان کی وہ طاقت بھی ختم ہوگئی؛ مجبوراً میں چند سیڑھیاں نیچے اُترتا ہوں (آسان اندازِ بیان اختیار کرتا ہوں اور) اُنھی کہی ہوئی باتوں کو صاف اور سادہ انداز میں کہتا ہوں۔آسمان کی گردش چکّی کی رفتار کی مانند ہے۔تم اچھی طرح جانتے ہو کہ چکّی کو چلانے والا ضرور ہوتا ہے، پھر تم یہ کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ آسمان کو گردش میں رکھنے والا بھی کوئی ہے۔آسمان کے چرخے میں ستاروں کی صلاحیتِ نفع رسانی اور اذیّت دہی کے تاروں سے بنی ہوئی پٹی لگی ہے، جس سے چند پردے تیار ہو کے اہلِ دُنیا کی نگاہوں کے سامنے ڈال دیے گئے ہیں۔صاحبانِ معرفت اور واقفانِ اسرار ان پردوں کے باوجود دیکھ لیتے ہیں کہ ہر

کام کا کرنے والا خدا ہی ہے:

''جب یہ مسلّم ہے کہ آسمان کی گردش حکمِ خدا کے تابع ہے تو پھر آسمان جو کچھ دے اس کو ظلم کیسے کہہ سکتے ہیں؟''

سُبحان اللہ! کتنا عظیم ہے وہ خدا جو وجود عطا کرتا ہے اور عدم کو ختم کرتا ہے جو ظلم کو ختم کرنے والا اور انصاف کی روشنی پھیلانے والا ہے۔ وہ انصاف (کی طاقت) سے طاقت وروں کا زور گھٹا دیتا ہے اور اپنے کرم سے کم زوروں کو طاقت بخشتا ہے۔ ابابیل کے کنکروں کی ضرب سے فیل سوار خودسروں کا خاک میں مل جانا یا ایک مچھّر کا نمرود کو موت کے بستر پر سُلا دینا کیا تھا؟ یقیناً یہ وہ نشانیاں ہیں جن سے اُس کی (بے پناہ) قوّت وقدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ ورنہ مجھ کو بتاؤ کہ یہ دو مختلف قسم کی تباہیاں جو مختلف زمانوں میں نازل ہوئیں، یہ کس ستارے کی نگاہِ ستم کا کرشمہ تھیں:

''ضحّاک، جمشید سے تخت وتاج چھین لیتا ہے۔ سکندر، دارا کا سینہ چاک کر دیتا ہے۔ عفریت حضرت سلیمان کے ہاتھ سے انگوٹھی اُڑا لے جاتا ہے، جو دیو اور پریوں پر حکمرانی کرتے تھے۔ تم جزا وسزا کے اسرار سے واقف نہیں ہو۔ بس آسمانوں اور ستاروں کو ہر چیز کا ذمّے دار سمجھتے ہو۔''

خدا جس طرح کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے اُسی طرح ہر موجود کو فنا بھی کر سکتا ہے۔ وہ خالق جس نے ایک لفظِ ''کُن'' سے سارے عالم کو پیدا کیا، اگر وہ اس عالم کو فنا کر دے تو کس کی مجال ہے کہ چوں وچرا کر سکے۔

تمهید

اِس زمانے میں ہر راگ اور آہنگ اور ہر چیز کا قاعدہ ہی بدل گیا۔ سپاہی سردار سے منحرف ہو گئے۔ سخن طرازی سے کیا فائدہ، کہنا چاہیے کہ زمانہ ہی بدل گیا۔ منجّمین کا خیال ہے کہ جس زمانے میں ایران کے آخری شہنشاہ یزدجرد کی محفلِ عیش عربوں کے حملوں سے درہم برہم ہو گئی تھیں، اُس وقت زحل ومرّیخ دونوں برجِ سرطان میں جمع تھے۔ آج کل بھی برجِ سرطان، زحل ومرّیخ کا مسکن معلوم ہوتا ہے۔ یہ بغاوت، لڑائی، ظلم، خوں ریزی اور ذلّت اسی (قرانِ نحس کے) اثرات ہیں۔ (لیکن) جو لوگ شناسائے حقیقت ہیں، وہ اس بات کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں؟ ایران پر عرب کا حملہ (بالکل دوسری چیز

تھی، وہ) تو ایک ملک پر دوسرے ملک کے لوگوں کی فوج کشی تھی، لیکن یہاں تو فوج نے اپنے سرداروں سے بغاوت کی ہے۔ ایران کی قدیم داستانوں سے ان دو لڑائیوں کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔

جنگ عرب: ایران اور غدر کا مقابلہ

ایران پر (عرب کا) حملہ مذہبی بنیاد پر تھا۔ ایران جو علم و حکمت کے لحاظ سے ویران ہو چکا تھا، ایک نئے مذہب کی برکتوں سے معمور ہو گیا، اور اس کی بہ دولت آگ کی (پرستش اور) غلامی سے نجات پائی، لیکن (ہندوستان میں) جہاں سوال صرف قانون کا ہے، ہندوستان والے کس نئے آئین کی حفاظت کا سہارا لے کر (اپنے اس فعل پر) خوشی کا اظہار کر سکتے ہیں؟

اہلِ ایران نے آتش پرستی سے منہ موڑ کر خدا پرستی کا راستہ دیکھا، لیکن ہندوستان والے منصف حاکموں (انگریزوں) کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر درندہ صفت انسانوں کے دام میں گرفتار ہو گئے۔ تم نہیں دیکھتے ہو کہ دامن و دام دادو دو میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انگریزی حکومت کے علاوہ کسی دوسری حکومت میں انصاف کی اُمید رکھنا بالکل نادانی ہے۔ عربوں کے تازیانے سے جو زخم لگے تھے، وہ مبارک مذہب (اسلام) اُن زخموں کا مرہم بن گیا تھا۔ اگر ان مصیبتوں کے بعد زمانہ امن و راحت کی دولت بخشتا تو مصیبت زدہ غم و آلام کو بھول سکتے تھے۔ اگر کسی واقفِ راز و صاحبِ نظر کے خیال میں اس قیامت کے بعد کوئی راحت ملنے والی ہو تو بتایئے اور میرے غم گین اور خوف زدہ دل کو تسکین بخش کر ممنون کرے۔ (امن و انتظام کے ذمّے دار) ملازمین، حاکموں سے بغاوت کریں۔ سپاہی افسروں کو قتل کریں اور خوشیاں منائیں اور ان کو ذرا بھی پشیمانی نہ ہو۔

اے واقفانِ اسرار و عارفینِ سود و زیاں! یہ سارا ہنگامہ خدا کا قہر ہے۔ ایران کی وہ جنگ اس قدر مایوس کن اور تباہ کار نہیں تھی:

> ''ساز سے پریشان نغمے اس لیے بلند ہو رہے ہیں کہ عالمِ اضطراب میں مضراب
> سے تاروں کو بے طرح چھیڑ رہا ہوں۔''

میں اس قدر نافہم نہیں ہوں کہ ستاروں کو روشن ہونے کے باوجود نور کہہ دوں، آسمان کو عظیم و بلند ہونے کی باوصف بے سر و ساماں سمجھوں، مخلوقِ آسمانی کی کارگزاریوں کو جھوٹ سمجھوں، یا ان دو منحوس ستاروں (زحل و مرّیخ) کے ایک بُرج میں جمع ہونے سے آج بھی انھیں پُر آلام حالات کی توقع کروں

جواب سے ایک ہزار سال پہلے (جنگِ عرب وایران کے زمانے میں) واقع ہوئے تھے۔

میں جو زمانے کے ہاتھوں نا قابلِ علاج مصیبتوں میں گرفتار ہوں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس زمین پر بسنے والے، جنھوں نے برجِ سرطان کو نہیں دیکھا ہے اور روزحل و مرّیخ کے نام ہی سے واقف ہیں، نا شنیدہ اور اَن دیکھی باتوں میں نہ اُلجھیں، بل کہ یہ سمجھ لیں کہ زمانے نے جس کے سینے میں ماضی و مستقبل کے راز محفوظ ہیں اور اچھے لوگوں کے کام کو بگاڑنا اس کی پُرانی عادت ہے (اس موقعے پر) اس بات کو روا نہ رکھا کہ باغی فوجوں کی دست بُرد سے دانایانِ فرنگ کو نقصان پہنچائے، اس لیے اس نے اس گروہ (باغیوں) پر اُن کی ہر جانب سے آنے والی افواج کو مُسلّط کر دیا۔

اِس کتاب کے پڑھنے والے یہ سمجھ لیں کہ میں نے جس کے قلم کی جنبش سے کاغذ پر (الفاظ کے) موتی بکھر جاتے ہیں، انگریزی حکومت کے نان و نمک سے پرورش پائی ہے اور بچپن سے ان فاتحینِ عالم کے دسترخوان کا ریزہ چیں ہوں۔ سات آٹھ سال ہوئے کہ بادشاہِ دہلی نے مجھ کو بلایا اور مجھ سے فرمایش کی کہ میں تیموری خاندان کے بادشاہوں کی تاریخ لکھوں، جس کے عوض 600 روپے سالانہ دیا جائے گا۔ میں نے اِس خدمت کو قبول کر لیا اور کام میں مشغول ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد بادشاہ کے اُستاد کا انتقال ہو گیا اور اصلاحِ شعر کا کام بھی مجھ سے متعلق کر دیا گیا۔

ملازمت قلعه کا ذکر

میں بوڑھا اور کمزور تھا، نیز گوشۂ تنہائی میں بیٹھے رہنے اور آرام کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ بہرے پن کی وجہ سے بارِ خاطرِ حاضرین ہو جاتا تھا۔ کوئی بات کر رہا ہے اور میں اس کے ہونٹوں کی جنبش پر نظر جمائے ہوئے ہوں۔ مجبوراً ہفتے میں ایک دو بار قلعے میں جاتا تھا۔ اگر بادشاہ محل سے برآمد ہوتے تھے تو کچھ دیر حاضرِ خدمت رہتا تھا ورنہ دیوانِ خاص میں کچھ دیر بیٹھ کر چلا آتا تھا۔

اس مدّت میں جتنا کام مکمل ہو جاتا، اس کو اپنے ساتھ لیے جاتا تھا یا کسی کے ہاتھ بھیج دیتا تھا۔ یہ تھا میرا تعلق اور میرا کام۔ لیکن یہ تیز رفتار آسمان اس خیال میں محو تھا کہ ایک نئے انقلاب کا خاکہ مرتب کرے اور میرے اس سکون و آرام کو جس میں آسایش و فراغت کا کوئی حصّہ نہیں تھا اور جو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک تھا، تباہ کر دے:

”(یہ آسمان ایسا ظالم ہے) کہ دشمن ہو یا دوست ہر ایک اس کی تیغِ بے پروائی سے زخمی رہتا ہے۔“

11مئی 1857

اس سال جس کا مادّۂ تاریخی بہ رعایتِ تخرجہ ''رستخیزِ بے جا'' ہے۔ اور اگر صاف صاف پوچھو تو 16 رمضان المبارک 1273ھ کو پیر کے دن دوپہر کے وقت مُطابق 11 مئی 1857 اچانک دہلی کے قلعے اور فصیل کی دیواریں لرزا اُٹھیں، جس کا اثر چاروں طرف پھیل گیا۔ میں زلزلے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اس دن جو بہت منحوس تھا۔ میرٹھ کی فوج کے کچھ بدنصیب اور شوریدہ سر سپاہی شہر میں آئے۔ نہایت ظالم ومفسد اور نمک حرامی کے سبب سے انگریزوں کے خون کے پیاسے۔ شہر کے مختلف دروازوں کے محافظ جوان فسادیوں کے ہم پیشہ اور بھائی بند تھے، بل کہ کچھ تعجب نہیں کہ پہلے ہی سے ان محافظوں اور فسادیوں میں سازش ہوگئی ہو، شہر کی حفاظت اور ذمّے داری اور حقِ نمک ہر چیز کو بھول گئے۔ ان بِن بُلائے یا مدعو کردہ مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ اُن مدہوش سواروں اور اکھڑ پیادوں نے جب دیکھا کہ شہر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور محافظ مہمان نواز ہیں، دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑ پڑے۔ جدھر کسی افسر کو پایا اور جہاں اِن قابلِ احترام (انگریزوں) کے مکانات دیکھے، جب تک اُن افسروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر دیا، اُدھر سے رُخ نہیں پھیرا۔

کچھ مسکین، گوشہ نشین جن کو انگریزی حکومت کی مہربانی سے کچھ نان ونمک میسّر تھا، شہر کے مختلف علاقوں میں ایک دوسرے سے دور زندگی کے دن گزار رہے تھے (ایسے مسکین وصلح پسند) جو تیر وتبر کے فرق سے ناواقف تھے اور اندھیری راتوں میں چوروں کے شور غل سے ڈر جاتے تھے، جن کے ہاتھ تیر و تلوار سے خالی تھے۔ سچ پوچھو تو ایسے لوگ ہر گلی کوچے اور شہر کے ہر حصے میں ہیں۔ یہ وہ لوگ نہیں جو لڑائی کے ارادے سے کمر کس کر تیّار ہو سکیں۔ اس کے باوجود (کہ ایسے صلح پسند وخیر خواہ شہر کے ہر حصّے اور ہر گلی کوچے میں تھے) اس وجہ سے کہ تیز بہنے والے پانی کو خس وخاشاک سے نہیں روکا جا سکتا، اپنے آپ کو مجبور سمجھ کر ہر شخص غم گین وماتم زدہ اپنے گھر میں بیٹھا رہا۔

مجبوری وخانہ نشینی

انھیں غم زدہ لوگوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ شور وغوغا سُنا۔ چاہتا تھا کہ کچھ معلوم کروں کہ اتنے میں شور مچ گیا کہ اندرونِ قلعہ صاحب اجنٹ بہادر اور قلعہ دار قتل کر دیے گئے۔ ہر طرف سے پیادوں اور سواروں کے دوڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ زمین ہر طرف

گل اندامون (انگریزوں) کے خون سے رنگین ہوگئی۔ باغ کا ہر گوشہ ویرانی اور بربادی کے سبب سے بہادروں کا مدفن بن گیا۔

انگریزوں کے قتل پر اظہارِ افسوس

افسوس وہ پیکرِ علم و حکمت، انصاف سکھانے والے خوش اخلاق و نیک نام حاکم! اور صد افسوس وہ پری چہرہ نازک بدن خاتونیں جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور جن کے بدن کچّی چاندی کی طرح دمکتے تھے! حیف وہ بچّے جنھوں نے ابھی دنیا کو (اچھی طرح) دیکھا بھی نہیں تھا، جن کے ہنس مُکھ چہرے گلاب و لالہ کے پھولوں کو شرماتے تھے اور جن کی خوش رفتاری کے سامنے ہرن اور کبک کی رفتار بد نُما معلوم ہوتی تھی، یہ سب ایک دم قتل و خوں کے بھنور میں پھنس کر (بحرِ فنا میں) ڈوب گئے۔

(فنا کی) چنگاریاں برسانے والی وہ موت، شعلے جس کا سرمایہ ہیں، جس کے ہاتھوں لوگ غم زدہ رہتے ہیں اور ماتمی لباس پہننے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اگر ان مقتولین کے سرہانے آہ و زاری کرے اور اس غم میں سیاہ پوش ہو جائے تو روا ہے۔ اگر آسمان (اس غم میں) غبار کی طرح منتشر ہو جائے اور زمین گردِ باد کی طرح اپنی جگہ چھوڑ دے تو بجا ہے:

> ''اے موسمِ بہار! بسمل کی طرح خاک و خون میں مل جا، اے زمانے! اندھیری رات کی طرح تاریک ہو جا، اے آفتاب! (اس غم میں) اپنے رخساروں کو (پیٹ کر) نیلا کر لے، اور اے چاند! (غمگین) زمانے کے دل کا داغ بن جا۔''

خُدا خُدا کر کے وہ منحوس دن ختم ہوا، ہر طرف گہرا اندھیرا پھیل گیا۔ ان سیاہ باطنوں اور بے رحم قاتلوں نے شہر میں جا بجا پڑاو ڈالا۔ اندرونِ قلعہ شاہی باغ کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا اور نشیمنِ سلطانی کو خواب گاہ۔ رفتہ رفتہ دور دور کے شہروں سے خبریں آئیں کہ مختلف فوجوں کے باغیوں نے ہر چھاونی میں افسروں کو قتل کر دیا ہے (اور نمک حراموں نے کھُلّم کھُلّا بغاوت کا شور مچا رکھا ہے) گروہ کے گروہ خواہ سپاہی ہوں یا زمین دار، سب یک دل ہو گئے اور کسی طے شدہ پروگرام کے بغیر دور و نزدیک ہر جگہ ایک ہی کام کے لیے کمر بستہ ہو گئے ہیں اور پھر کیسی مضبوطی سے کمریں کسی تھیں کہ صرف اس دریائے خوں کی موجیں ہی ان کو کھول سکتی تھیں جو کمروں سے گزر جائے۔ (مختلف مقامات کے لوگ کسی قرارداد کے بغیر جس طرح ایک ہی کام یعنی قتل و خوں میں لگ گئے تھے اس سے) ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس طرح جھاڑو

کی بہت سی سینکوں کو ایک ہی بند سے باندھا جاتا ہے، اسی طرح گنتی شمارے سے باہران لڑنے والوں کی کمریں بھی ایک ہی ''کمر بند'' سے بندھی ہوئی ہیں۔

باغیوں کی مذمت

بے شک ہندوستان کو آرام وآسایش سے اس حد تک خالی کرنے کے لیے کہ اگران چیزوں کو ڈھونڈا جائے تو ایک گھاس کے تنکے کے برابر بھی نشان نہ ملے، ایسی ہی جھاڑو کی ضرورت تھی۔ بہت سے لشکر سرداروں کے بغیر تیّار ہو گئے، بہت سی فوجیں افسروں کے بغیر لڑائی کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ توپیں، گولہ بارود، چھرّے غرض سارا سامان انگریزوں سے حاصل کیا، لڑائی کے سارے طریقے انگریزوں سے سیکھے اور انھیں سکھانے والوں اور مالکوں سے لڑنے کے لیے تیّار ہو گئے۔

دل، لوہے یا پتّھر کا ٹکڑا نہیں ہے، کیسے نہ بھر آئے؟ آنکھیں رخنۂ دیوار نہیں ہیں کہ آنسو نہ بہائیں، حکمرانوں کی موت کا غم منانا چاہیے اور ہندوستان کی ویرانی پر رونا چاہیے۔ شہر حاکموں سے خالی اور بندہ ہائے بے خداوند سے بھرا ہوا جیسے باغ، باغبان سے خالی اور درختانِ بےثمر سے پُر ہو۔ لُٹیرے ہرقسم کی پابندیوں سے اور سوداگر محصول ادا کرنے کی ذمّے داریوں سے آزاد۔ گھر ویرانے معلوم ہوتے ہیں اور مکانات (لوٹ مار کرنے والوں کے لیے) ''خوانِ مفت'' کا حکم رکھتے ہیں۔ جو لوگ گم نامی کے گوشوں میں چھپے ہوئے تھے، وہ گروہ در گروہ خنجر بہ کیف اپنی آرایش اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتے پھرتے ہیں۔ امن پسند اور نیک نہاد لوگ گھر سے بازار تک آتے ہوئے راستے میں بیسیوں جگہ عاجزی اور مغلوبیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ لُٹیرے دن میں دلیری کے ساتھ لوٹ مار میں مصروف ہیں اور رات میں ریشمی بستروں پر محوِ خواب۔

شرفا کی تباہی

بڑے بڑے عالی خاندان لوگوں کے گھروں میں چراغ جلانے کے لیے تیل نہیں۔ اندھیری رات میں جب پیاس کی شدّت بڑھتی ہے، بجلی چمکنے کے منتظر رہتے ہیں کہ دیکھیں کہ کوزہ کہاں رکھا ہوا ہے اور گلاس کدھر ہے۔

(زمانے کی) اس بے نیازی و بے امتیازی کو کیا کہوں کہ وہ کم رُتبہ لوگ، جو سارا دن مٹّی بیچنے کے لیے زمین کھودتے تھے،، اُن کو مٹّی میں سونے کے ٹکڑے مل گئے اور جن لوگوں کی محفل میں رات میں

آتشِ گل سے چراغ روشن رہتے تھے، اندھیرے گھروں میں ناکامی و نامرادی کے غم میں مبتلا ہیں۔

کوتوالِ شہر کی زن و دختر کے علاوہ ساری نازنینانِ شہر کا زیور بزدل اور سیہہ کار رہزنوں کے قبضے میں ہے (زیور و آرائش سے معرّا ہونے کے بعد) ان نازنینوں میں جو ہلکا سا اندازِ ناز باقی رہا تھا، اس کو ان نو دولت گداز ادوں نے چھین لیا کہ ان کی خود نمائی کے کام آئے جو محبّت کرنے والے نازنینوں کے ناز اُٹھاتے تھے، وہ اب ان بدنہاروں کے ناز اُٹھانے پر مجبور ہیں۔ ان گھٹیا لوگوں کے دماغوں میں غرور اس حد تک سما گیا ہے کہ اگر ان کی حرکات کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کچھ بگولے چکّر کھاتے پھر رہے ہیں۔ بڑے بڑے عالموں اور نام وروں کی آبرو مٹی میں ملا دی گئی اور جن لوگوں کے پاس نہ دولت تھی نہ عزّت، وہ بے اندازہ زرو جواہر اور عزّت و آبرو کے مالک ہیں۔ جس کا باپ گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا، وہ ہوا کو اپنا خادم سمجھ رہا ہے۔ جس کی ماں پڑوسی کے گھر آگ مانگ کر لاتی تھی وہ آگ پر حکم چلانے کا مدّعی ہے۔ کمین، آگ اور ہوا پر حکومت کرنا چاہتے ہیں اور ہم ان پریشان حال لوگوں میں سے ہیں جو صرف سکون و آسایش کے چند لمحوں اور انصاف کے خواہش مند ہیں:

> ’’میرا درد بھرا دل تمھارے نزدیک ایک قصّہ ہے اور بس، لیکن اس کو سُن کر
> ستاروں کی آنکھوں سے اشک کون جاری ہو جائیں گے۔‘‘

ڈاک کا انتظام درہم برہم ہو گیا جس کے سبب سے بہت سے کام رُک گئے، ہرکاروں نے آنا جانا اور ڈاک لے جانا بند کر دیا، ڈاک میں پیام بجنسہ پہنچانے کی گنجایش نہیں ہوتی۔ ہاں خطوں کی آمد و رفت کا قاعدہ ہے، مگر اس محکمے کی ایک اور شاخ (ٹیلی گراف) ہے کہ نہ مضراب کی جنبش، بل کہ جنبش کی مضراب سے جو اس سے پیدا ہوتی ہے ہزاروں پیام (خبریں) اندر سے باہر نکلتے ہیں (پہنچتے ہیں)۔

غدر کی مذمّت

(جو لوگ) مذہب اور قانون کے بے حد پابند ہیں، انصاف کو نظر انداز نہ کریں اور بتائیں کہ اس سارے انتظام کا درہم برہم ہو جانا، خدا کی بخشی ہوئی دولت کا لُٹ جانا، ڈاک کا نظام درہم برہم ہو جانا اور دوستوں کے حالات معلوم نہ ہونا کیا یہ ساری باتیں اس لائق نہیں کہ ان کا ماتم کیا جائے اور آنسو بہائے جائیں۔ بڑے بڑے بہادروں کا یہ حال ہو جائے کہ وہ اپنے سائے سے ڈریں، سپاہی، بادشاہ اور درویش ہر ایک پر حکومت کرنے لگیں، کیا یہ صورتِ حال لائقِ افسوس نہیں؟ ان روح فرسا مصائب پر

آنکھیں آنسو نہیں بہائیں گی؟ اور کیا اس نوحہ گری پر لعن طعن کرنا اس ماتم سرائی پر طنز کرنا اور اس گریہ و زاری پر ہنسنا جائز ہے؟ اور کیا ان پُر آلام حالات سے اظہارِ بے زاری کو ضعفِ ایمان اور نادرستیِ مذہب سمجھا جائے گا؟:

''میں شعر وسخن کے جواہر سے کیا دل لگاؤں جب کہ آہِ گرم سے میرے دل پر ہزاروں آبلے پڑ گئے ہیں۔ میرا دل بُجھ چکا ہے اور قُویٰ اس حد تک جواب دے چکے ہیں کہ اب مجھ کو نہ سزا کا غم ہے نہ جزا کی خوشی۔''

باد شاہ کی مجبوری

اس سرگذشتِ پُر مصیبت کا مارا ہوا یہ اسیرِ قیدِ بستر (تنہائی) اس رودادِ غم کو پھر شروع کرتا ہے۔ جب پہلی بار وہ گم راہِ جنگ جو آئے تو جو خزانہ وہ اپنے ساتھ لائے تھے، خزانے میں جمع کر دیا اور اپنے سر شاہی آستانے پر جھکا دیے۔ جلد ہی زمانے نے کچھ ایسا انتظام کیا کہ ہر طرف سے فوجیں جمع ہونا شروع ہو گئیں اور اس سرزمین (دہلی) کی طرف روانہ ہو گئیں۔ بادشاہ جب فوج کا انتظام نہ کر سکا، فوج نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بادشاہ مجبور ہو کر رہ گیا:

''فوج نے بادشاہ کو اپنے حلقے میں لے لیا، جیسے چاند کو گہن لگ جائے۔ ماہِ نو گہن میں نہیں آتا۔ گہن تو چودھویں رات کے چاند کو لگتا ہے۔ بادشاہ اُس چاند کی طرح تھا جس کو گہن لگ گیا ہو، وہ ماہِ کامل نہیں تھا۔''

قیدیوں کی رہائی

میں نے اس بات کا ذکر نہیں کیا، حالاں کہ یہ بات بیان کرنے کے لائق تھی کہ یہ شہرت طلب جنگ جو جس مقام سے وہاں کے قید خانے کا دروازہ کھول دیا اور قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ وہ پُرانے قیدی جنھوں نے نئی نئی آزادی پائی تھی، شاہی دربار میں آئے، سجدہ کیا اور کسی علاقے کی صوبے داری چاہی۔ آقاؤں سے بھاگے ہوئے غیر وفادار غلاموں نے آستانِ شاہی کو بوسہ دیا اور کسی سرسبز علاقے کی حکومت کے طلب گار ہوئے۔ کوئی نہیں کہتا ہے اور میں بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہر خواہش مند کو حاضر ہونے کی اجازت اور ہر پناہ مانگنے والے کو پناہ کیوں دے دی جاتی ہے؟ بس یہ زمانے کی بُل عجبی ہے۔

تعداد فوج

اب دہلی کے اندر اور باہر تقریباً پچاس ہزار سواروں اور پیادوں کی فوج پڑی ہوئی ہے۔ صاحبانِ علم و دانش انگریزی حکّام کے قبضے میں اس وسیع شہر کا کوئی علاقہ نہیں ،صرف شہر کے جانب مغرب ایک پہاڑی پر ان کا قبضہ ہے۔ یہ پہاڑی شہر سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ (انگریزوں نے) نہایت ہنرمندی سے اس جگہ پر مورچہ قائم کر کے ایک مضبوط قلعہ سا بنالیا ہے اور اس کے چاروں طرف کئی اژدہا صفت، رعد خروش توپیں لگادی ہیں اور استقلال کی مدد سے اس عالمِ پریشانی میں اطمینان (کی دولت) حاصل کر لی ہے۔

شہر کی فوج نے جو میگزین اسی شہر سے حاصل کیا تھا، اس میں سے چند توپیں شہر کی فصیل پر جمادی ہیں اور اس طرح اپنے آپ کو جنگجو سرداروں کا حریف فرض کر لیا ہے۔ توپوں اور بندوقوں کے دھوئیں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے اور اس سے اولے برس رہے ہیں۔ رات دن دونوں طرف سے گولہ باری ہوتی ہے، جیسے اُپر سے پتھر برس رہے ہوں۔ مئی، جون کی گرمیاں ہیں، دھوپ کی تیزی روز بہ روز بڑھتی ہی جارہی ہے۔ آفتاب برجِ ثور و جوزا میں بے طرح آتش افروزی میں مشغول ہے۔ معلوم ہوتا ہے خود بھی اسی آگ میں بھنا جارہا ہے۔ جو لوگ سرد و ہوادار مکانوں میں آرام و آسایش کے ساتھ رہتے تھے، دن بھر دھوپ میں جلتے ہیں اور راتیں انھیں جلتے ہوئے پتّھروں پر پیچ و تاب کے عالم میں بسر کرتے ہیں۔ اسفندیار اس میدانِ جنگ میں ہوتا تو روئیں تنی کے باوصف اس کی ہمّت و جواں مردی ہوا ہو جاتی۔ اگر رستم اس داستان کو سُن لیتا تو جی چھوڑ دیتا۔ (شہر کی فوج کے) مختلف مقامات سے آئے ہوئے سپاہی دن چڑھے شیر دل انگریزوں سے لڑنے کے لیے جاتے ہیں اور سورج ڈوبنے سے پہلے ہی واپس آجاتے ہیں۔ بیرونِ شہر کی داستانِ شب و روز تو یہ تھی، اندرونِ شہر (کیا ہو رہا تھا اس سلسلے میں) ایک دن کا قصہ سننے کے لائق ہے:

> ''میرے ساز کے تاروں میں وہ نغمے پنہاں ہیں جن سے چنگاریاں برستی ہیں۔
> میں ڈرتا ہوں کہ مغنّی ان کی زد میں نہ آجائے۔ میری زبان پر وہ داستان ہے
> جس سے میرے دل پر خنجر چلنے لگتے ہیں۔''

ایک شخص جس کے دماغ میں بے جا پندار اور تکبّر کے خیالات بھرے ہوئے تھے درِ پردہ اپنے

آقا اور مُربّی کا دشمن بن گیا۔اس خیال سے کہ اگر یہ واقف کار اور رازداں زندہ رہے گا تو میں نے جو خزانہ (ناجائز طریقوں سے) جمع کیا ہے۔اس کا راز کھل جائے گا، ہمیشہ نقصان پہنچانے کی تدبیریں سوچتا تھا اور یہ بات مشہور کر کے کہ حکیم احسن اللہ خاں انگریزوں کے خیر خواہ اور طرف دار ہیں،فوج کے افسروں کو ان کی طرف سے بھڑ کا تا رہتا تھا۔

حکیم احسن اللہ خاں

ایک دن کچھ لوگ (حکیم احسن اللہ خاں کو) قتل کرنے کے لیے ان کے محل پر چڑھ دوڑے۔حکیم صاحب اس وقت قلعے میں بادشاہ کے پاس تھے۔چند آشفتہ سر قلعے میں گئے اور حکیم صاحب کو گھیر لیا۔بادشاہ نے انتہائی محبّت و بندہ پروری سے (حکیم صاحب کو بچانے کے لیے) اپنے آپ کو ان پر گرا دیا،اس طرح حکیم صاحب بچے۔جان تو بچ گئی،لیکن یہ فتنہ اُس وقت تک ختم نہیں ہوا،جب تک کہ ان کا سارا گھر تباہ نہیں ہو گیا (حکیم صاحب کا) گھر (جو خوب صورتی و آرایش میں) لنگارخانۂ چین کی طرح تھا لوٹ لیا گیا۔ایوان کی چھت کو آگ لگا دی گئی۔چھت کے شہ تیر اور منقش تختے جل کر راکھ ہو گئے،دیواریں سیاہ پڑ گئیں،گویا وہ محل اس غم میں سیاہ پوش ہو گیا تھا:

> ''آسمان کی مہربانی سے دھوکا نہ کھانا۔یہ بے وفا جس شخص کو آغوشِ محبّت میں جگہ دیتا ہے،اس کو کشمکش عذاب میں مبتلا کر دیتا۔''

بُرے سے بُرا غلام اپنے آقا سے اس طرح پیش نہیں آ سکتا بہ شرط یہ کہ وہ والد الحیض نہ ہو۔یہ خبیث،نمک حرام جس کے منہ پر چیچک کے داغ ہیں،بے حیائی کے سبب سے جس کی آنکھیں پھیل گئی ہیں اور دہانہ فراخ ہو گیا ہے،اپنے آپ کو زہرہ و مشتری کی طرح سمجھتا ہے۔ہر طرف کولھے مٹکاتا ہوا،انداز دکھاتا ہوا گزرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوش خرامی میں کبک و تدرو کو شرماتا ہے۔میں نے اس کا نام اس لیے نہیں لکھا کہ وہ ایک گدا زادۂ گم نام ہے۔میں اس پر لعنت بھیج کر جو داستان کہہ رہا تھا اس کو پھر شروع کرتا ہوں۔

تفضل حسین خاں

فوجیں ہر طرف سے آ کر جمع ہو رہی تھیں۔بادشاہ کا نام لگا ہوا تھا،اس وجہ سے دور دور کے سردارانِ فوج اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔فرخ آباد کے نامور (سردار) تفضّل حسین خان نے جن کو کبھی بادشاہ سے

علاقۂ نیازمندی نہیں تھا، دور ہی سے آستانِ شاہی کو سجدہ کیا اور خط میں اپنے آپ کو نیاز مندِ قدیم لکھا۔

خان بہادر خاں

خان بہادر خان نے جو گمراہ مشہرت طلب تھا او جو بریلی میں کچھ لشکر جمع کر کے سردار بن بیٹھا تھا، ایک سوایک اشرفیاں، نقرئی ساز و سامان سے آراستہ ہاتھی اور گھوڑا بارگاہِ شاہی میں بھیجا۔

چشم بد دور خورشید نشان نواب یوسف علی خان بہادر فرمان روائے رام پور نے جو اس علاقے میں باپ دادا کی جاں نشینی (کا حق ادا کر رہے) ہیں اور انگریزی حکومت کے ساتھ ان کا رشتۂ دوستی اتنا مضبوط ہے کہ زمانہ ہزار برس میں بھی کسی طریقے سے اس کو نہیں توڑ سکتا، مجبوراً صرف زبانی پیام بھیج کر لوگوں کی زبان کو بند کیا۔

واقعاتِ لکھنؤ

لکھنؤ میں جب فوج نے (انگریزوں) سے رشتۂ تعلق توڑ لیا، (بیش تر) انگریز (دشمنی کی) اس آگ سے بچ کر دوسرے مقامات پر اپنے متعلقین کے پاس چلے گئے، لیکن (فوج کے) چند سرداروں نے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر بیلی گارد میں قیام کیا، جو لکھنؤ کا ایک مشہور مقام ہے اور بہادری کے ساتھ دروازے بند کر لیے۔

شرف الدولہ نے جو بڑے واقف کار، اور معاملات کو سمجھنے والے تھے اور جو نوابانِ اودھ کے زمانے میں وزارت کے عہدے پر سرفراز تھے، اس کم تعداد لیکن باشان و شوکت گروہ (انگریز) کو نظر انداز کر کے واجد علی شاہ کے دس سالہ لڑکے کو تختِ حکومت پر بیٹھا دیا اور اس کو شہنشاہِ ہندوستان کا وزیر اور اپنے آپ کو پیش کار اور نائب وزیر فرض کر لیا۔ اس نامور شخص (شرف الدولہ) نے گویا ہُما کو گرفتارِ دام کر لیا تھا۔ جب یہ سارا کام مکمل کر لیا، ایک منتخب شخص کو مناسب پیشکش کے ساتھ (دہلی) روانہ کر دیا۔ قاصد آیا، دو روز آرام کیا، پھر بارگاہِ شاہی میں حاضر ہوا۔ دو صبا رفتار گھوڑے، دہ کوہِ صفت ہاتھی، ایک سو اکیس اشرفیاں اور ایک سنہری کلاہ جو رنگ برنگ کے نایاب موتیوں سے مزیّن تھی، پیش کی اور ایک جوڑ بازو بند جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے، ملکہ کی خدمت میں محل میں بھیجا۔

یہ ساری شان و شوکت روشنیِ چراغ کی طرح (جلد ختم ہونے والی) تھی، گویا زمانے کی نظرِ بد اسی رونق کی منتظر تھی۔ حکومتِ اودھ کی اس پیشکش کے بعد آئینہ و سکندر اور جام و جمشید کی ساری داستان ختم ہو

گئی۔(باغی)فوج کے شورغل سے نصیب کی آنکھیں کھلی ہی تھیں کہ پھر مُند گئیں۔نہیں نہیں شہنشاہ کی قسمت کا ستارہ اتنی بلندی پر پہنچ گیا کہ دنیاوالوں کی نگاہوں سے پنہاں ہوگیا:

"جب قسمت کا ستارہ گردش میں آجاتا ہےتو تاج کی بھی کوئی قیمت نہیں رہتی۔تم نہیں دیکھتے کہ تغیر کے خوف سے سورج آسمان پر کیسا کانپتا رہتا ہے۔"

14ستمبر

جس دن وہ سبز قدم قاصد آیا اور بادشاہ نے بندہ پروری فرمائی،اُس کے کل کو پیر کے دن قمری مہینے کی چوبیس اور ستمبر کی چودہ تاریخ کو پہاڑی کے دامن میں بیٹھے ہوئے (انگریزوں) نے شان وشکوہ کے ساتھ کشمیری دروازے پر ایسا حملہ کیا کہ کالوں کی فوج کو بھاگتے ہی بنی:

"مئی کے مہینے میں اگر انصاف دہلی سے اُٹھ گیا تھاتو ستمبر میں ظلم وستم کا دور ختم ہو گیااور انصاف کا زمانہ واپس آ گیا۔چار مہینے چاردن کے بعد سورج آب وتاب کے ساتھ طلوع ہوا۔دہلی دیوانوں سے خالی ہو گئی۔عقل مند (انگریزوں) نے بہادری کے ساتھ اس پر قبضہ کرلیا۔"

اگر چہ 11 مئی سے 14 ستمبر تک 4 مہینے 4 دن کا وقفہ ہے،لیکن اس بنا پر کہ پیر کا دن شہر (انگریزوں) کے ہاتھ سے نکلا تھااور پیر کے دن ہی قبضے میں آیا،ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہر کا ہاتھ سے نکل جانااور پھر قبضے میں آجانا یہ دونوں کام ایک ہی دن میں ہوئے۔مختصر یہ کہ فاتحین نے راستے میں جس شخص کو پایا قتل کردیا۔شہر کے عالی خاندان اور صاحبِ عزّت افرادعزّت اورآبروکو بچانے کے لیے گھروں کے دروازے بندکر کے بیٹھ رہے۔

شہر میں بد باطن (باغیوں) کی فوج تھی،اس میں سے کچھ لوگوں نے بھاگ جانے کی ٹھان لی اور کچھ لوگوں نے غرور میں آکرلڑنے کی تیاری کی۔خبیث اورآوارہ لوگوں کا یہ گروہ شیر دل فاتحین سے اُلجھ پڑا۔یہ لوگ اپنے خیال میں تو دشمنوں کو قتل کررہے تھے،لیکن میرے خیال میں وہ شہر کی عزّت وآبروکو برباد کررہے تھے۔

دو تین دن تک کشمیری دروازے سے لےکر چوک تک تمام راستے میدانِ جنگ بنے رہے۔دہلی دروازہ،ترک مان دروازہ،اجمیری دروازہ یہ تینوں دروازے اس فوج کے قبضے میں رہ گئے۔مجھ مُردہ

دل کا غم کدہ (مکان) وسطِ شہر میں کشمیری دروازے اور دہلی دروازے کے درمیان ہے اور میرے مکان سے ان دونوں دروازوں کا فاصلہ برابر ہے۔ اگر چہ گلی کا دروازہ بند کرلیا گیا تھا، لیکن ابھی اتنا حوصلہ باقی تھا کہ دروازہ کھول کر باہر چلے جاتے تھے اور کھانے پینے کا سامان لے آتے تھے۔

انگریزوں کی فتح اور مظالم

میں نے ابھی کہا کہ غضب ناک شیروں (انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی کچھ بے سرو سامان لوگوں کو قتل کرنا اور چند مکانوں کو جلانا جائز سمجھا۔ ہاں جس مقام کو لڑ کر فتح کرتے ہیں، لوگوں پر ایسی ہی سختیاں کی جاتی ہیں۔

اِس غصّے اور دشمنی کو دیکھ کر لوگوں کے مُنھ فق ہو گئے۔ بے شمار مرد عورتوں کے گروہ جن میں معمولی لوگ بھی تھے اور صاحبِ حیثیت بھی، ان تینوں دروازوں سے باہر نکل گئے۔ شہر کے باہر جو چھوٹی بستیاں اور مقبرے تھے، اُن میں پناہ گزیں ہو گئے۔ اس خیال سے کہ کسی مناسب وقت پر شہر میں واپس آ جائیں گے یا کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں گے۔

میرے دل پر نہ خوف و دہشت کا اثر ہوا اور نہ پائے استقلال کو جنبش ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں گنہ گار تو نہیں کہ سزا پاؤں۔ انگریز بے گناہ ہوں کو قتل نہیں کرتے ہیں اور شہر کی آب و ہوا نا ساز گار نہیں ہے۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ ان بدخیالیوں کو دل میں جگہ دوں اور اِدھر اُدھر بھاگتا پھروں۔

(اب) مکان کے ایک کونے میں بے سروسامانی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں (اس) تنہائی میں) قلم میرا رفیق ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں اور قلم سے دردناک الفاظ ٹپکتے ہیں:

> ''میں بالکل مفلس اور بے سروسامان ہوں خداوند! کب تک یہ سوچ سوچ کر
> خوش ہوتا رہوں گا کہ یہ جواہر (کلام) میری ہی کان کے ہیں۔''

ازل کا لکھا ہوا بدل نہیں سکتا۔ ازل میں قسمتیں لکھی جا چکی ہیں ہر ایک کو نوشتۂ قسمت کے مطابق سروساماں عطا کیا گیا ہے۔ مصیبتیں اور راحتیں اسی حکمِ ازل کا نتیجہ ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ بے دلی و بے جگری کو چھوڑ کر، جس طرح بچّے ہر تماشے کو خوشی کے ساتھ دیکھتے ہیں؛ ہر لمحہ بدلنے والے زمانے کی حیرت فزا نیرنگیوں کو اس بڑھاپے میں خوشی کے ساتھ دیکھتا رہوں۔

18 ستمبر

جمعے کے دن محرّم کی 26 تاریخ تھی اور ستمبر کی 18۔ دن چڑھے دنیا کو خوشی بخشنے والا آفتابِ عالم تاب برجِ سنبلہ کے ایک درجے میں پہنچ کر کسوف میں آ گیا اور اہلِ عالم کی چشمِ جہاں میں پُرتاریکی نے ظلم ڈھایا۔ گمراہ باغی اندرون و بیرونِ شہر سے خنزیروں کی طرح بھاگنے لگے اور فاتحین نے شہر اور قلعے پر قبضہ کرلیا۔ کشت و خون اور پکڑ دھکڑ کی (آفت) اس گلی تک آ گئی، خوف سے لوگوں کے دل دہل گئے۔

کوچے کی در بندی

اس گلی میں صرف دس بارہ گھر ہیں اور راستہ ایک ہی طرف سے ہے (گلی اندر سے بند ہے) گلی میں کوئی کنواں نہیں ہے (اس گلی کے) زیادہ تر رہنے والے چلے گئے ہیں (اس طرح کہ) عورتیں بچوں کو چھاتی سے لگائے ہوئے تھیں اور مردوں کے کاندھوں پر سامان کی گٹھریاں تھیں۔ کچھ لوگ باقی رہ گئے تھے، ہم سب نے مِل کر گلی کا دروازہ اندر سے بند کرلیا اور پتھر چُن دیے۔ گلی سربستہ تو تھی ہی، دربستہ بھی ہوگئی (ایک راستہ تھا وہ بھی بند ہوگیا):

> ''میری روح جسم سے زیادہ خستہ و درماندہ ہو تو تعجب کی بات نہیں کیوں کہ میرا دل قید خانے کے گوشے سے بھی زیادہ تنگ ہے۔''

مہاراجا پٹیالہ کی مدد

(اتفاقاً) اس مصیبت میں کام بننے کی ایک صورت پیدا ہوگئی۔ فلک مرتبہ مریخ خشم راجا نرندر سنگھ بہادر فرماں روائے پٹیالہ اس جنگ میں (انگریز) فاتحین کے ساتھ ہیں اور ان کی فوج شروع سے انگریزی لشکر کی مددگار ہے۔ راجا کے چند ملازمینِ خاص جو اُن کی سرکار میں اونچے عہدوں پر ہیں اور شہر کے نامور اور قابلِ عزّت لوگوں میں سے ہے (میری مراد ہے) حکیم محمود خاں، حکیم مرتضٰی خاں، حکیم غلام اللہ خاں (سے) جو حکیم شریف خاں جنت مکان کی اولاد ہیں، اس کوچے میں رہتے ہیں، دور تک اُن کی دورویہ عمارتیں چلی گئی ہیں۔

میں دس سال سے ان میں سے ایک صاحبِ جاہ و ثروت کا پڑوسی ہوں۔ ان تین حضرات میں سے اوّل الذکر (حکیم محمود خاں) متعلقین اور اہلِ خانہ کے ساتھ اپنے بزرگوں کی طرح باعزّت زندگی بسر کرتے ہیں اور باقی دونوں حضرات پٹیالہ میں راجا کی مصاحبت میں کامیابی و کامرانی کے ساتھ رہتے

ہیں۔ چوں کہ دہلی کی فتح متوقع تھی، راجا نے ازراہِ بندہ پروری طاقت وراور جنگجو (انگریزوں) سے طے کرلیا تھا کہ جب (شہر) فتح ہوگا، اس گلی کے دروازے پر محافظ مقرّر کردیے جائیں گے تا کہ انگریز فوجی جن کو گورا کہتے ہیں، گھروں کو نقصان نہ پہنچائیں۔

اثنائے کلام میں کبھی کبھی (مجبوراً) چند دوسری باتوں کا تذکرہ بھی آجاتا ہے۔ان ضمنی باتوں کے بعد (میں) پھر اصل موضوع پر آتا ہوں۔ سارے شہر میں 15 ستمبر سے ہر گھر کا دروازہ بند ہے۔ دُکان دار اور خریدار دونوں غائب ہیں۔ نہ گندم فروش ہے کہ گیہوں خریدیں، نہ دھوبی ہے کہ کپڑے دُھلنے کو دیں۔ حجّام کو کہاں ڈھونڈیں کہ سر کے بال تراشے اور مہتر کو کہاں سے ڈھونڈ کرلائیں کہ صفائی کرے۔ بہر حال جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے، ان پانچ مہینوں میں (گلی کے لوگ) باہر نکل کر پانی تو برابر لے آتے تھے، کبھی کبھی آٹا وغیرہ بھی مل جاتا تھا، لیکن اس کے بعد یہ صورتِ حال ختم ہوگئی۔ (گلی کا) دروازہ پتھروں سے بند کرلیا گیا اور دلوں کے آئینے پر غم واَلم کا غبار چھا گیا:

> ’’کوششوں کے سارے ہنگامے ٹھنڈے پڑ گئے۔اب مصیبتیں، خون کو آگ کی طرح جلارہی ہیں۔‘‘

پانی اور غلّے کا قحط

گھروں میں کھانے کا جس قدر سامان تھا رفتہ رفتہ ختم ہوگیا۔ پانی اگرچہ بے حد احتیاط سے پیا گیا، لیکن آخر کار کوزے یا گھڑے میں ایک قطرہ نہیں رہا۔ عورتوں، مردوں میں سے کسی میں برداشت کی طاقت نہیں رہی۔ صبر کے ساتھ دن گزارنے اور (اپنے آپ کو) سامانِ خورد ونوش حاصل کرلینے کا فریب دینے کا وقت بھی گزر گیا۔ دوشبانہ روز سب بھوکے پیاسے رہے:

> ’’افسوس! یہ گریہ درازی اور ذلّت ومحتاجی! اور صد حیف یہ بے چارگی اور پریشان حالی وبے سروسامانی!۔‘‘

تیسرے دن جیسا کہ اس سے قبل ذکر آچکا ہے، مہاراجا (پٹیالہ) کی فوج کے سپاہی آگئے اور پہرہ دینے لگے۔ گلی کے رہنے والوں نے لوٹ مار کرنے والوں کے خوف سے نجات پائی۔ ’’ہر چہ باد باد‘‘ کہتے ہوئے پہرے داروں سے باہر جانے کی اجازت چاہی۔ یہ پہرہ ازراہِ دوستی تھا نہ کہ ازراہِ دشمنی، اس لیے یہ کہا گیا کہ چوک کے بازار تک جاسکتے ہیں۔ چوک کے آگے قتل وخون کا بازار گرم ہے اور راستہ پُرخطر ہے۔

مجبور و پریشاں حال لوگوں نے دروازہ کھول دیا۔ بھشتی اور مشک کا ملنا ناممکن تھا، اس لیے ہر گھر سے ایک مرد اور میرے ملازمین میں سے دو شخص گئے میٹھا پانی دور تھا اور (اتنی) دور جا نہیں سکتے تھے، مجبوراً نیم شور پانی مٹکوں اور گھڑوں میں بھر لائے۔ اس طرح اس نمکین پانی سے وہ آگ بجھی جس کا دوسرا نام پیاس ہے۔

باہر جانے والے اور پانی لانے والے لوگ کہتے تھے کہ اس گلی میں جس سے آگے جانے کی ہم کو اجازت نہیں ہے، سپاہیوں نے کچھ مکانوں کے دروازے توڑ ڈالے (ان گھروں میں) نہ تو بنورے میں آٹا ملا، نہ برتن میں روغن۔ میں نے کہا اچھا بندہ وہ جو برتن، تھیلے، آٹے اور تیل کا ذکر نہ کرے، ہماری روزی، تو ایسے (روزی رساں) کے ذمّے ہے جو ہم کو نظر انداز نہیں کرے گا۔ خدا کی بخشش کا شکرانہ ادا کرنا شیطانیت ہے۔

آج کل ہم لوگ اپنے آپ کو قیدی سمجھ رہے ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ بالکل قیدیوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ نہ تو کوئی آتا ہے کوئی سننے کو بات ملے، نہ خود باہر جا سکتے ہیں کہ اپنی آنکھوں سے سارے واقعات دیکھیں۔ یقیناً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے کان بہرے ہیں اور آنکھیں بے نور، اس کشمکش کے علاوہ نہ کھانے کو روٹی ہے نہ پینے کو پانی۔

ایک دن اچانک بادل آیا، پانی برسا۔ ہم نے (صحن میں) ایک چادر باندھ لی۔ اور ایک مٹکا اس کے نیچے رکھ دیا اور (اس طرح) پانی حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بادل دریا سے پانی لیتا ہے اور زمین پر برساتا ہے (لیکن) اس بار یہ ہما صفت بادل پانی، چشمۂ حیواں سے لایا۔ گویا سکندر نے جو چیز اپنی بادشاہت کے دور میں ڈھونڈی تھی، مجھ پریشاں حال نے وہ دولت (آبِ حیات) اس تباہی و بربادی کے عالم میں پالی:

> ''اے غالب! دوست کی طرف سے کبھی کوتاہی نہیں ہوتی (البتہ) وہ اس طرح
> کام بناتا ہے کہ ہم سمجھ نہیں پاتے ہیں۔''

سوانح غالب

اس موقعے پر میں چاہتا ہوں کہ کچھ اپنی زندگی اور اشغال کے متعلق بھی لکھوں، اس طرح کہ یہ سر گزشت سلسلۂ کلام سے غیر متعلق نہ ہونے پائے:

''میں نئے داغوں سے زخم ہائے جگر پر مرہم رکھ رہا ہوں، اور میں نشتر کی مدد سے
دل سے پیکان نکال رہا ہوں۔''

اس سال میری زندگی کا باسٹھواں سال شروع ہوا (اتنی مدّت سے) میں اس دنیا کی خاک چھان رہا ہوں اور پچاس برس سے شعروشاعری میں مصروفِ جگر گدازی ہوں۔ میری عمر پانچ سال کی تھی کہ میرے والد عبداللہ بیگ خان بہادر کا انتقال ہوگیا خدا اُن کی روح پر بے شمار رحمتیں نازل کرے۔ میرے چچا نصراللہ بیگ خاں بہادر نے مجھ کو اپنا بیٹا بنالیا اور لاڈ پیار سے پرورش کی۔ جب میری عمر نو سال کی ہوئی تو میرے چچا جو میرے سرپرست بھی تھے موت کی گہری نیند سو گئے (گویا) میری قسمت سو گئی۔

(میرے یہ) لائق تعریف و صاحبِ جاہ وحشمت (بزرگ) چار سو سواروں کے سردار، اور جنرل لارڈ لیک بہادر کے وفادار متعلقین میں سے تھے اس فاتح اور سخی سردار کی مہربانی سے وہ آگرہ کے قریب دو پرگنوں کے حاکم اور مالک تھے۔ ان کے انتقال کے بعد (وہ) دونوں پرگنے انگریزی حکومت نے واپس لے لیے۔ اس جاگیر کے بجائے میرا اور میرے حقیقی بھائی کا کچھ وظیفہ مقرّر کر دیا گیا جو میری آرام و آسایش کا ذریعہ تھا۔ چناں چہ اس سال 1857 میں اپریل تک کا وظیفہ کلکٹری دہلی کے خزانے سے میں نے حاصل کیا۔ مئی سے اس خزانے کا دروازہ ہی بند ہوگیا (اب) میں بدنصیبی سے دوچار ہوں اور دل طرح طرح کے خیالاتِ پریشاں کا مسکن ہے۔

اس سے پہلے صرف بیوی تھی، نہ کوئی لڑکا تھا نہ لڑکی۔ تقریباً پانچ سال ہوئے کہ میں اپنی بیوی (جو میری تباہی کی ذمّہ دار ہے) کے خاندان کے دو بے ماں باپ کے بچوں کو لے کر پال لیا ہے۔ ان شیریں زبان بچوں سے مجھ کو بے انتہا محبت ہے۔ اس علامِ بے چارگی میں (دونوں بچے) میرے ساتھ ہیں اور میرے دامن و گریباں کے پھول ہیں۔

مرزا یوسف

بھائی جو دو سال مجھ سے چھوٹا ہے، تیس سال کی عمر میں دیوانہ ہوگیا۔ تیس برس سے وہ اس طرح زندگی گزار رہا ہے کہ نہ کسی کو ستاتا ہے نہ شوروغوغا کرتا ہے۔ اس کا مکان میرے گھر سے تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر ہے۔ اس کی بیوی اور لڑکیوں نے بچوں اور کنیزوں کے ساتھ بھاگ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ گھر کے فاترالعقل مالک اور سارے سامان کو ایک بوڑھے دربان اور ایک بُڑھیا کنیز کے ساتھ چھوڑ دیا۔

اگر میں جادو جانتا ہوتا تب بھی (ان حالات میں) میں کسی کو بھیج کر ان تینوں آدمیوں کو نہ بُلوا سکتا تھا نہ سامان منگوا سکتا تھا۔ یہ بہت بڑا غم ہے اور میرے دل پر اس کا بہت اثر ہے۔

وہ دونوں ناز پروردہ بچے پھل، دودھ، مٹھائی مانگتے ہیں، لیکن ان کی خواہش پوری کرنا میرے بس میں نہیں۔ افسوس! اس ایک بات کو کیا کہوں۔ جب تک زندہ ہوں روٹی اور پانی کی فکر رہے گی اور مرنے کے بعد کفن دفن کی۔ میں دن رات اس فکر میں رہتا ہوں کہ بھائی نے دن میں کیا کھایا (ہوگا) اور رات میں کیسے سویا (ہوگا) ار (حالات سے) ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا ہوں کہ (بھائی) زندہ بھی ہے یا مصیبتیں (اُٹھاتے اُٹھاتے) مر گیا ہے:

''میرے ہونٹوں پر صرف آہ و فغاں نہیں ہے، خدا کی قسم (اس غم سے) میں جاں
بہ لب ہوں۔''

جو حالات میں نے بیان کیے یہ دل دکھانے والے ہیں، لیکن جو کچھ میں کہہ نہیں سکا ہوں وہ بھی روح فرسا ہے۔ جو لوگ حالات سے واقف ہیں، میں ان سے توقع کرتا ہوں کہ وہ میری پُر درد داستان کو غور سے سُنیں گے اور سُن کر انصاف کریں گے۔

قصیدہ در مدح ملکہ وکٹوریہ

میں اس بُڑھاپے میں چراغِ صحن اور آفتابِ لبِ بام کی مانند ہوں۔ میرا مطلب چراغ کی روشنی اور سورج کی نور افشانی سے نہیں ہے، بل کہ جس طرح صبح کے وقت چراغ کا روغن ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے اور اس کی روشنی ہلکی ہو جاتی ہے اور دن ڈھلے سورج کی چمک دمک ماند پڑنا شروع ہو جاتی ہے، وہی میرا حال ہے۔ دو سال ہوئے کہ میں نے ملکۂ انصاف پسند، فلک رفعت، ستارہ حشم ملکۂ وکٹوریہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اور ڈاک سے جو دہلی سے بہ راہِ راست بمبئی اور وہاں سے لندن جاتی ہے، آقائے ہُنر پرور و حاکمِ نامور لارڈ الن برا بہادر کے حضور میں بھیجا، جو گورنری کے زمانے میں از راہِ کرم میرے مرّبی تھے:

راہِ سخن کشودم اگر کود نہ شد کہ بخت
راہم بہ بزمِ بانوے گیتی ستاں دہد

یہ شعر اُسی قصیدے کا ہے، وہ قصیدہ اِسی ردیف قافیے میں ہے۔ کسے خیال تھا کہ ایسا مشکل کام اس آسانی

سے بن جائے گا۔ تین مہینے کے بعد اچانک ایک مبارک قدم قاصد اس سرو بوستان سروری (لارڈ الن برا) کا نوازش نامہ ملا۔ یہ خط انگریزی میں تھا نہایت محبّت کے ساتھ لکھا تھا کہ قصیدہ ہمارے پاس پہنچ گیا اور ہم نے اس کو ملکہ معظّمہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے متعلقینِ بارگاہِ شاہی کے سپرد کر دیا۔ اس پُر مسرّت پیغام اور مبارک جواب کو تیس دن نہیں گزرے تھے کہ سردار مہربان مسٹر ٹنگٹن بہادر کا گرامی نامہ ڈاک سے آیا، لکھا تھا کہ جو قصیدہ لارڈ الن برا بہادر کے واسطے سے ہمارے پاس پہنچا تھا، اُس کے بارے میں یہ حکم ہے کہ سائل ضابطے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی گزارشات فرماں روائے ہندوستان کے وسیلے سے ہماری بارگاہ میں پیش کرے۔

غالبؔ کے تین مطالبات

حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ایک معروضہ شہنشاہِ انگلینڈ کے نام (لکھ کر) سکندر جاہ فریدوں حشم لارڈ کیننگ نواب گورنر جنرل بہادر کے حضور میں بھیجا۔ اس گزارش نامے میں التماس و آرزو کو اس طرح پیش کیا گیا کہ روم، ایران اور دوسرے ممالک کے بادشاہوں نے شاعروں اور مدّاحوں کو طرح طرح سے نوازا ہے۔ موتیوں سے منھ بھر دینا، سونے میں تلوانا، گانو، عطا کرنا، اور انعام دینا، غرض مختلف انداز رہے ہیں۔ اس مدّاح کی یہ خواہش ہے کہ ملکۂ معظّمہ اپنی زبانِ (مبارک) سے مہر خواں (خطاب) ارشاد فرمائیں۔ اپنے حکم سے سراپا (خلعت) بخشیں اور اپنے خوان سے چند نان ریزہ (روٹی کے ٹکڑے عنایت فرمائیں۔ مہر خواں اور سراپا کا ترجمہ عربی میں خطاب اور خلعت کا ہو سکتا ہے اور نان ریزہ کو انگریزی میں پنشن کہہ سکتے ہیں۔

حاکمِ بلند مرتبہ نواب گورنر جنرل بہادر نے جواب میں میرے دلِ غم زدہ کو بشارتِ مداوا سے شاد فرمایا (موصوف) نے لکھا کہ (وہ) ستایش نامہ انگلستان روانہ کر دیا گیا۔ اس خبرِ مسرّت اثر سے میں ایسا مسرور ہوا کہ جامے میں پھولا نہیں سماتا تھا۔

مایوس کُن جواب

چار ماہ کے بعد میرے خط کے جواب میں فرخ شمائل، عالی نسب مسٹر رسل کلرک بہادر اور ناشکرے سپاہیوں کے ہاتھوں عدالتیں نہ اُجڑ جاتیں تو گلستانِ انگلستان سے ایسا فرمان صادر ہوتا جس سے مُرادیں پوری ہو جاتیں اور میری آنکھیں اور میرا دل دونوں ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے۔

اب وہ مبارک خطوط جو میری پُر جوش آرزوؤں کی فہرست ہیں اور میرے ہوش وخرد کے بازو کا تعویز میرے پاس ہیں اور اور جگر کے چند ٹکڑے جو جوشِ گریہ میں آنکھوں سے ٹپکے ہیں، جگر خراشی وخون فشانی کے نام کے طور پر میرے دامن میں ہیں:

''میں تیر یا تلوار کا زخمی نہیں ہوں۔ نہ پلنگ وشیر نے مجھے مجروح کیا ہے۔ میں (شدّتِ غم میں) اپنے ہونٹ کاٹتا ہوں اور زبان کو خون آلود کر لیتا ہوں، خونِ جگر کھاتا ہوں اور زندگی سے بیزار ہوں۔''

مرزا یوسف کے گھر کی تاراجی

ستمبر کی اکتیسویں تاریخ کو بُدھ کے روز شہر فتح اور گلی کا دروازہ بند کرنے کے سترہویں دن لوگ خبر لائے کہ لوٹ مار کرنے والے، بھائی (مرزا یوسف) کے گھر چڑھ دوڑے گلی اور گھر میں لوٹ مار کی۔ دیوانے مرزا یوسف خاں اور دونوں بُڑھیا بڈھوں کو زندہ چھوڑ دیا اس بھاگ دوڑ میں دو ہندو کہیں سے آکر (گھر) میں پناہ گزیں ہوگئے۔ بوڑھے دربان اور بڑھیا کنیز (ماما) دونوں نے ان ہندوؤں کی مدد سے کھانے پینے کا انتظام کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھّی۔

واضح ہو کہ اس پکڑ دھکڑ اور قیامت کے عالم میں جس طرح ہر کوچے اور بازار میں اس مصیبت کی صورت یکساں نہیں ہے، اسی طرح قتل کرنے اور لوٹ مار میں سب سپاہیوں کا انداز ایک نہیں ہے۔ اگر کوئی (سپاہی) رحم کرتا ہے یا دوسرا سختی کرتا ہے تو یہ ذاتی رحم دلی، اور سنگ دلی کا نتیجہ ہے۔

انگریزی سپاھیوں کی معقولیت اور امن پسندی کا اعتراف

میں جانتا ہوں کہ اس یلغار میں حکم یہ ہے کہ جو شخص اظہارِ اطاعت کرے اس کو قتل نہ کیا جائے، مال چھین لیا جائے اور جو شخص مقابلہ کرے، مال کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی بھی چھین لی جائے۔ مقتولین کے متعلق یہ خیال ہے کہ انھوں نے یقیناً اطاعت نہیں کی، اسی درجہ سے ان کو قتل کر دیا گیا۔ مشہور بھی یہی ہے کہ عموماً سامان لوٹ لیتے ہیں، قتل نہیں کرتے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے اور وہ بھی صرف دو تین کوچوں میں کہ پہلے قتل کر دیا پھر سامان لوٹ لیا (البتہ) بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کا قتل روا نہیں رکھا ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر توسنِ خامہ رُک گیا۔ اب میں ایک پُر زور آواز بلند کروں کہ سمندرِ قلم قدم آگے بڑھائے۔ اے انصاف کی تعریف کرنے والے اور ظلم کو بُرا کہنے والے حق پرستو! اگر ظلم کی مذمّت اور

انصاف کی تعریف میں تمہاری زبان اور تمھارا دل ایک ہے تو خدا کے واسطے ہندوستانیوں کا طرزِ عمل یاد کرو۔اس کے بغیر کہ پہلے سے دشمنی کی کوئی بنیاد اور عداوت کا کوئی سبب ہو(ان ہندوستانیوں نے)اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اُٹھائی۔

بے چاری عورتوں اور گھوارے میں کھیلتے ہوئے بچّوں کو قتل کیا(حالاں کہ) سب جانتے ہیں کہ اپنے آقا سے بےوفائی کرنا گناہ ہے(اس کے مقابلے میں)ان انگریزوں کو دیکھو کہ جب دشمنی (کا بدلہ لینے) کے لیے لڑنے اُٹھے اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے لیے لشکر آراستہ کیا، چوں کہ(وہ)شہر والوں سے بھی برہم تھے تو موقع تو اس کا تھا کہ (شہر پر) قابض ہونے کے بعد کتّے بلّی (تک کو) زندہ نہ چھوڑ تے (لیکن انھوں نے) ضبط کیا۔(اگر چہ)ان کے سینے میں غصّے کی آگ بھڑک رہی تھی۔عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔یہ جو گھربار اور جان مال محفوظ رہنے کی ذمّے داری نہیں لی گئی ہے،اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بے گناہوں اور گناہ گاروں میں امتیاز ہے۔جن لوگوں کو باز پرس کے لیے بلایا گیا ہے،ان کے سوا اور کسی کو حاضر ہونے کی اجازت نہیں دی ہے۔

شہر کے پیش تر لوگوں کو باہر نکال دیا ہے۔کچھ لوگ بہ دستور اُمید و بیم میں گرفتار (شہر کے اندر) موجود ہیں۔جو لوگ (شہر سے نکل کر) ویرانوں اور گوشوں میں مقیم ہوئے ہیں،اُن کے بارے میں ابھی کوئی حکم (صادر) نہیں ہوا جو لوگ (شہر سے) باہر نکل گئے ہیں یو جو شہر کے اندر مبتلا پریشانی ہیں،اُن کے درد کا کوئی مداوا نہیں ہے۔کاش (شہر کے) (اندر رہنے والے اور (شہر کے) باہر بسنے والے ایک دوسرے کی زندگی و موت سے واقف ہوتے کہ بے تابی و پریشانی نہ ہوتیں۔بس یہ جاننا کافی ہے کہ جو جس جگہ ہے، پریشان ہے۔شہر کے اندر رہنے والے مجبور لوگ ہوں یا باہر کے پریشان حال، سب کے دن درد سے بھرے ہوئے ہیں اور سب قتلِ عام کے خوف سے ہراساں ہیں۔

کرنل براؤن کے سامنے پیشی

5/ اکتوبر کو پیر کا مصیبت آفریں دن (تھا) دو پہر کے وقت اچانک چند گورے اُس دیوار پر چڑھ گئے جو بند کردہ دروازے سے ملی ہوئی ہے۔(وہاں سے) ایک چھت پر (اور چھت سے) کود کر گلی میں آ گئے۔راجا نرندر سنگھ کے سپاہیوں کا روکنا (کچھ) مفید نہیں ہوا (نہیں روک سکے) دوسرے چھوٹے چھوٹے مکانات کو نظر انداز کر کے راقم الحروف کے گھر میں (گھُس) آئے۔(ان گوروں نے) بھل

منسی سے سامان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مجھ کوان دونوں بچّوں، دوتین ملازمین اور چند نیک کردار پڑوسیوں کے ساتھ گلی سے دوفرلانگ سے کچھ زیادہ فاصلے پر حقیقت پسند، دانش ور کرنل براؤن کے پاس لے گئے، جو چوک سے اسی طرح قطب الدین سوداگر کی حویلی میں مقیم ہے(کرنل براؤن نے) مجھ سے بہت نرمی و انسانیت سے بات چیت کی۔ مجھ سے نام اور دوسروں سے پیشہ پوچھا۔ خوش اسلوبی کے ساتھ اُسی وقت رخصت کر دیا۔ میں نے خدا کا شکرادا کیا، اس خوش (اخلاق (کرنل براؤن) کی تعریف کی اور چلا آیا۔

17اکتوبر

7/اکتوبر کوشام کے وقت 21/توپوں کی آواز نے (قوتِ) سامعہ کونوازا اور آگہی کوغرقِ حیرت کر دیا(میں سوچنے لگا کہ) لیفٹیننٹ گورنر بہادر کے آنے پر سترّہ توپوں کی سلامی دی جاتی ہے اور نواب گورنر جنرل بہادر کے آنے پر اُنیس توپوں کی ہوش افزا سلامی کی کیا وجہ ہے۔ دوسرے دن بھی نہ اس نا واقفیت میں کوئی کمی ہوئی، نہ معلومات میں کچھ اضافہ ہوا۔ میرا خیال ہے کہ ملک کے پست و بلند کو ہم وار کرنے والے (انگریزوں) کوکسی دوسری جگہ باغیوں پر فتح حاصل ہوئی ہے۔

واضح رہے کہ ابھی باغیوں کے بہت سے گروہ بریلی ،فرخ آباد اور لکھنؤ میں جگہ جگہ شورش پھیلانے اور بے فائدہ مقابلہ کرنے میں مصروف ہیں اوران کے دل، کہ خدا کرے خون ہو جائیں، اور ان کے ہاتھ کہ خدا کرے بے کار ہو جائیں، اسی کام (لڑائی) کے لیے کھُلے ہوئے ہیں۔

میواتیوں کی شورش

ادھر سونہہ اور نوح کے علاقے میں میواتیوں نے بے طرح شورش پھیلا رکھی ہے، جیسے دیوانے زنجیروں سے آزاد ہو گئے۔ تلا رام نامی ایک شورش پسند کچھ دن تک ریواڑی میں ہنگامہ آرا رہا۔ پھر شیطان کی رہنمائی سے میواتیوں سے مل گیا۔ یہ گروہ میدانوں، اور پہاڑیوں میں (انگریز) حاکموں سے برسرِ جنگ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر ہر طرف تیز آندھیوں اور بھڑکتی ہوئی آگ کے ہنگامے بپا ہیں۔

ان غم انگیز حالات میں، جن کا آغاز یادنہیں ہے اور جن کا انجام معلوم نہیں ہے، رونے کے علاوہ کچھ دیکھا ہوا تو آنکھوں کے روزن خاک سے بھر جائیں۔ روزِ سیاہ (بدنصیبی) کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں، جس کے متعلق کہوں کہ آنکھوں نے اس کو دیکھا۔ اس سے قطعِ نظر کرتے ہوئے (کہاوتوں) کہ

روزِ سیاہ (بدنصیبی) تو وہ چیز ہے جس کی تاریکی میں کچھ دیکھا ہی نہیں جاسکتا۔

خانہ نشینی

جس دن گورے مجھ کو پکڑ کر لے گئے تھے، اس دن کے علاوہ چوکھٹ پر قدم رکھنا گھر سے باہر نکلنا، گلی یا بازار میں چلنا، یا دور سے چوک کو دیکھ لینا نصیب نہیں ہوا ہے۔ گویا گنجہ کے دانش ور (نظامی گنجوی) نے میری ہی زبان سے کہا ہے:

"میں نہیں جانتا ہوں دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ کیا اچھائی ہو رہی ہے کیا بُرائی۔"

ان لاعلاج غموں اور مرہم بیزار زخموں (کے ہوتے ہوئے تو) مجھ کو یہ سوچنا چاہیے کہ میں مر چکا ہوں۔ مجھ کو باز پُرس کے لیے اُٹھایا گیا اور جزاے اعمالِ بد کے نتیجے میں دوزخ کے کنویں میں لٹکا دیا گیا ہے۔ مجبوراً اس قید میں بے چارگی و پریشانی کے ساتھ ہمیشہ جینا پڑے گا:

"مجھ پر جو کچھ گزری ہے، اگر کل بھی گزری (تو) آہ (کیا ہوگا)!"

کیفیت روزنامچہ نگاری

اس کتاب میں شروع سے آخر تک یا اُن حالات کا ذکر ہے جو مجھ پر گزر رہے ہیں یا اُن واقعات کا ذکر ہوگا جو سُننے میں آئے ہیں۔ میں نے جو شنیدہ حالات لکھے ہیں تو کوئی یہ خیال نہ کرے کہ میں نے جھوٹ باتیں سُنی ہوں گی، یا کچھ کم کر کے لکھی ہوں گی۔ میں دارو گیر سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں اور سچائی میں نجات ڈھونڈتا ہوں۔ آنکھیں بے کار ہیں، دل قیدِ (غم) میں ہے اور لب ساکت ہیں۔ لوگوں کی زبانوں سے میرے کانوں کو معلومات کی بھیک ملتی ہے۔ کیسی بُری ہے یہ گدائی! اور وہ بھی اس بے سرو پائی کے ساتھ۔

اور یہ جو بادشاہ اور شاہ زادوں کے انجام کے متعلق میں نے کچھ نہیں لکھا (حالاں کہ ان واقعات کو) فتح شہر کی داستان کے دیباچے کے طور پر (آغاز ہی میں) لکھنا چاہیے تھا اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس تحریر کے سلسلے میں میرا سارا سرمایہ سخن ہائے شنیدہ میں اور ابھی بغیر سُنی ہوئی باتیں بہت ہیں۔ یقیناً جب میں اس جاے تنگ سے باہر نکلوں گا جو باتیں اب تک نہیں سُنی ہیں اِدھر اُدھر سے جمع کروں گا اور تب واقف کاروں کی طرح یہ راز کی باتیں لکھوں گا۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اس تحریر کے پڑھنے والے (واقعاتِ) داستان کی تقدیم و تاخیر پر از روے انصاف اعتراض نہیں کریں گے۔

19اکتوبر

19/اکتوبر کو پیر کے دن نے، جس کا نام ہفتے کے رجسٹر سے کاٹ دینا چاہیے، آتش فشاں اژدہے کی طرح دنیا کو نگل لیا۔ اسی دن صبح کے وقت وہ کم بخت دربان بھائی کے مرنے کی خوش خبری لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتارِ فنا (یوسف مرزا) پانچ دن تیز بخار میں مبتلا رہا اور آدھی رات کے قریب اس دنیا سے رُخصت ہو گیا۔ پانی، رومال، غسال، گورکن، چونے، گارے وغیرہ کا ذکر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ میں کیسے جاؤں اور (میّت) کہاں لے جاؤں؟ کس قبرستان میں سپردِ خاک کروں؟ اچھا، بُرا کسی قسم کا کپڑا نہیں ملتا ہے۔ زمین کھودنے والے مزدور گویا کبھی شہر میں تھے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مردوں کو دریا کے کنارے لے جا کر جلا سکتے ہیں (لیکن) مسلمانوں کی مجال ہے کہ دو تین شخص ساتھ ساتھ راستے سے گزریں۔ چہ جائے کہ میّت کو شہر سے باہر لے جائیں۔

مرزا یوسف کے کفن دفن کا انتظام

پڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور (اس) کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہوئے۔ پٹیالے کے ایک سپاہی کو آگے کیا۔ میرے دو نوکروں کو ساتھ لیا اور چل دیے۔ میّت کو غسل دیا۔ دو تین سفید چادریں یہاں سے (گھر) لے گئے تھے، اُن میں لپیٹا اور اس مسجد میں جو مکان کے برابر تھی، زمین کھودی (قبر بنائی) میّت کو اس میں رکھ دیا اور اس گڑھے کو پاٹ کر لوٹ آئے:

> ''افسوس کہ ساٹھ سال کی عمر میں (وہ) تیس سال شاد رہا اور تیس سال ناشاد۔ قبر میں اس کو بالینِ خشت بھی نہ ملا۔ خاک کے علاوہ اور کچھ اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ اے خدا! اس مرنے والے پر رحم کر کہ اُس نے زندگی میں آرام کی صورت نہیں دیکھی۔ اس کی دل جوئی کے لیے کسی فرشتے کو بھیج اور اس کی روح کو بہشت میں داخل کر۔''

یہ نیک سرشت لیکن بدقسمت شخص جس نے زندگی کے ساٹھ سال خوش و ناخوش گزارے، تیس سال ہوش مندی کے ساتھ اور تیس سال بے ہوشی (دیوانگی) کے عالم میں۔ زمانۂ ہوش مندی میں غصہ ضبط کرنا اور عالمِ دیوانگی میں کسی کو تکلیف نہ پہنچانا جس کا شعار تھا، 29/صفر 1274ھ کی شب میں مر گیا ہے:

> ''ایک شخص نے مجھ سے ستم نصیب میرزا یوسف کی تاریخِ (وفات) پوچھی، جس

نے اس دنیا میں اپنے سے بیگانہ ہو کر زندگی گزاری۔ میں نے ایک آہ کھینچی اور
کہا ”دریغ دیوانہ“۔

تاریخ وفات مرزا یوسف

واضح ہو کہ ”دریغ دیوانہ“ سے 1290 عدد حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے ”آہ“ کے 16 عدد نکال دیے جائیں 1274 رہتے ہیں جو مطلوب ہیں:

”اُس خدا کے نام کہ جس کے حضور میں معذرت کرنا ہی مناسب ہے۔ تم جہاں
سر جھکاؤ گے، اُسی کا آستانہ ہوگا۔“

فرماں روائے لوھارو کی تباھی

جس ہفتے انگریزی فوج نے شہر کو فتح کیا، اسی ہفتے نامورانِ دانش مند امین الدین احمد خان بہادر، اور محمد ضیاء الدین خان بہادر نے حفظِ وضع کی خاطر اور اُمیدِ بہتری پر شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ بیوی بچوں کے علاوہ تین ہاتھی اور چالیس گھوڑے ساتھ تھے۔ پرگنۂ لوہارو کا رُخ کیا، جو اُن کی آبائی جاگیر ہے۔ پہلے مہرولی گئے اور اس گورستانِ پُر انوار (مقبرہ) میں قیام کیا۔ دو تین روز آرام کیا۔ اس دوران میں لُٹیرے سپاہیوں نے قیام گاہ کو گھیر لیا۔ جو کپڑے پہنے ہوئے تھے، ان کے علاوہ سارا سامان چھین لیا اور چلے گئے۔ البتہ تینوں ہاتھی جن کو وفادار اور خیر خواہ ہم راہی اس لوٹ مار کے شروع ہوتے ہی نکال لے گئے تھے، تباہی و نقصان کے نشان کی حیثیت سے باقی رہ گئے جیسے تین جلے ہوئے خرمن ہوں۔

(یہ لوگ) لوٹ مار کی مصیبت اُٹھا کر (اس) بے سروسامانی کے ساتھ جس کو تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو (ریاست) دوجانہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ (دوجانہ) کے نامور اور نیک کردار (فرماں روا) حسن علی خاں بہادر نے ازراہِ انسانیت و فیاضی (ان کا) استقبال کیا۔ یہ کہہ کر کہ ”میرا گھر بھی آپ ہی کا گھر ہے“ ان سب کو دوجانہ لے گئے۔

قصہ مختصر سردارِ خوش خصال (حسن علی خان) نے اپنے ہمسر (مہمانوں) کے ساتھ وہی سلوک کیا جو شاہِ ایران نے ہمایوں کے ساتھ کیا تھا۔ صاحب کمشنر بہادر نے (ان حالات) سے واقف ہو کر اپنے پاس بُلایا۔ (یہ لوگ) شہر میں آئے اور حاکم سے ملاقات کی۔ صاحبِ کمشنر) نے کچھ دیر طعن و تشنیع کی (لیکن) جب

نرم جواب سُنا تو پھر کچھ نہیں کہا۔قلعہ کے اندر ایوانِ خان سامانی کے پہلو میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔

تسلسلِ کلام کی رعایت کی وجہ سے میں اس خاندان کی تباہی کی داستان نہیں لکھ سکا۔یوں سمجھو کہ مہرولی میں ان لوگوں کو لوٹا گیا اور دہلی میں ان کے مکانات جو مالکوں سے خالی تھے،نذرِ غارت گری ہوئے جو سامان یہ لوگ وہاں (مہرولی) اپنے ساتھ لے گئے تھے،لوٹ مار کرنے والوں کے حصے میں آیا۔بس متعلقین زندہ دوجانہ پہنچے،اور جو سامان یہاں محلات میں تھا،سب لُٹ گیا۔بس اینٹیں،پتّھر باقی رہ گئے۔نہ سیم و زر محفوظ رہا،نہ لباس و بستر کا ایک تار بچا۔خدا (ان) بے گناہ ہوں پر رحم کرے اس آغازِ ساز گار کا انجام بہ خیر ہو،اور (ان) کو اس مصیبت کے بعد آرام نصیب ہوا۔

حاکم جھجر اور حاکم فرخ نگر کی گرفتاری

یقیناً اکتوبر کی 17/تاریخ تھی اور سنیچر کا دن کہ یہ دونوں دانش مندانِ یگانہ شہر میں آئے اور جیسا کہ میں نے (پہلے) کہا ہے،قلعہ میں قیام کیا۔اس واقعے کے دو،تین دن کے بعد فوج کو حکم دیا گیا۔فوج گئی اور جھجر کے حاکم عبدالرحمٰن کو مجرموں کی طرح لائی۔ قلعے کے اندر ایک ایوان کے گوشے میں جس کو دیوانِ عام کہتے ہیں (ٹھہرنے کے لیے) جگہ دی گئی اور ان کی ساری جاگیر انگریزی حکومت نے ضبط کرلی۔

31/اکتوبر کو جمعہ کے دن فرخ نگر کے حاکم احمد علی خان کو اسی طرح (گرفتار کر کے) لائے،جیسے عبدالرحمٰن خاں کو لائے تھے اور قلعۂ دہلی میں ایک الگ جگہ اُن کو ٹھہرایا گیا۔فرخ نگر بھی تیز دست تباہ کاروں کا نشانہ بنا اور شہر والوں کا مال واسباب لُٹ گیا۔

حاکم بہادر گڑھ اور بلّب گڑھ کی گرفتاری

2/نومبر کو پیر کے دن دادری اور بہادر گڑھ کے حاکم بہادر جنگ خان گرفتار ہو کر آ گئے اور قلعہ میں جہاں ٹھہرایا گیا،ٹھہرے۔7/نومبر کو سنیچر کے دن راجا ناہر سنگھ حاکمِ بلّب گڑھ کے آ جانے سے قلعہ میں جو سردار مختلف مقامات پر ایک دوسرے سے دور مقیم تھے ان میں ایک کا اور اضافہ ہوا۔

واضح ہو کہ دہلی کی اجنٹی کے ماتحت جو جاگیریں ہیں،وہ شمار میں ہفتے کے دنوں سے کم یا زیادہ نہیں ہیں (دہلی کے ماتحت سات جاگیریں ہیں) جھجر،بہادر گڑھ،بلّب گڑھ لوہارو،فرخ نگر،دوجانہ،پاٹودی،ان میں سے پانچ جاگیروں کے حاکم جیسا کہ میں نے کہا،قلعہ میں موجود ہیں اور بقیہ دو جاگیر دار پاٹودی اور دوجانہ میں خوف کے تیر کا نشانہ ہیں۔دیکھو!ان کی جہاں میں آنکھیں دنیا میں کیا دیکھتی ہیں اور کیا انجام ہوتا ہے۔

یہ بات پوشیدہ نہیں رہے گی کہ مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں ....اور ذوالفقار الدین حیدر خاں، جن کا لقب حسین مرزا ہے، اس ہنگامے میں دوسرے باعزّت لوگوں کی طرح بیوی بچوں کے ساتھ شہر سے باہر چلے گئے۔ قیمتی سامان سے بھرے ہوئے گھر چھوڑ دیے اور صحرا انوردی اختیار کی۔ ان لوگوں کے کئی مکانات محل اور ایوان ہیں باہم متصل۔ اتنے وسیع کہ اگر (ان محلات و ایوانات کی) زمین کی پیمایش کی جائے تو شہر نہ سہی، ایک گانو کے برابر تو (رقبہ) ہوگا۔ اتنے بڑے بڑے محل، اس عالم میں کہ ایک ان میں کوئی آدمی تھا ہی نہیں، لوٹ مار (کرنے والوں کے ہاتھو) صاف اور ویران ہو گئے۔

کچھ کم قیمت اور بھاری سامان جیسے ایوان کے پردے، شامیانے، سائبان شطرنجیاں اور دوسرا فرش ان قیام گاہوں میں باقی رہ گیا تھا۔ اچانک ایک رات جس کی صبح کو راجا ناہر سنگھ گرفتار ہوئے، اس سامان میں آگ لگ گئی۔ لپٹیں اُٹھنے لگیں، لکڑی، پتھّر، دیواریں سب جل گئیں۔ یہ عمارت میرے مکان سے جانبِ مغرب اتنی قریب ہے کہ میں آدھی رات کو بھڑکتی ہوئی آگ کی روشنی چھت پر سے دیکھ رہا تھا اور دھوئیں کی گرمی میرے چہرے اور آنکھوں تک پہنچ رہی تھی، کیوں کہ اس وقت پچھیاو چل رہا تھا، راکھ میرے اوپر آ رہی تھی۔ ہاں پڑوسی کے گھر سے (بلند ہونے والے) نغمے سوغات کی حیثیت رکھتے ہیں، پھر پڑوسی کے گھر کی آگ راکھ کیوں نہ برسائے۔

شاہ زادوں کی سر گزشت

راقمِ حالات کے قلم کی جنبش (اس واقعے کے اثر سے) جو نیم مردہ چیونٹی کی رفتار کے برابر ہے (سُست ہے) (صفحۂ) کاغذ پر (اس حالت کی) کیا عکاسی کر سکتی ہے کہ نگاہیں اس کو دیکھ سکیں۔ شاہ زادوں کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بعض کو گولی ماردی گئی (اس طرح) موت کے اژدہے نے ان کو نگل لیا۔ کچھ کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا گیا۔ (اس طرح) رسنِ دار کی کشاکش سے ان کی روح ٹھٹھر کر رہ گئی۔ چند افسردہ دل قید خانے میں ہیں اور بعض (عالمِ غربت میں) آوارہ و پریشان پھر رہے ہیں۔ کمزور وضعیف بادشاہ پر مقدمہ چل رہا ہے۔

جاگیر داروں کا قتل

جھجر، بلّب گڑھ اور فرخ نگر کے جاگیر داروں کے علاحدہ علاحدہ مختلف دنوں میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس طرح (ان لوگوں کو) ہلاک کیا کہ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ خون بہایا گیا۔

جنوری1858

جنوری1858 کے آغاز میں ہندوؤں کو فرمانِ آزادی مل گیا،اور(شہر میں) آباد ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ لوگ (ہندو) جہاں جہاں تھے،شہر کی طرف چل پڑے۔خانماں برباد مسلمانوں کے گھروں میں (خالی پڑے رہنے کے سبب سے) سبزہ اس قدر اُگ گیا کہ درودیوار سبز ہیں۔ ہرلحہ سبزۂ سرِ دیوار کی زبان سے یہ صدا آتی ہے کہ مسلمانوں کی جگہ (بہ دستور) خالی ہے۔

حکیم محمود خاں کے متعلقین کی گرفتاری

شاید بدخصلت مخبروں کے کہنے سے حاکمِ شہر کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ راجا نرندر سنگھ بہادر کے طبیبوں کا مکان مسلمانوں کی جاے پناہ اور جمع ہونے کی جگہ ہے۔کوئی تعجب نہیں کہ ان بے ہودہ گو ہنگامہ ساز (مخبروں) میں سے ایک دو شخص اس محفل میں (موجود) بھی ہوں ۔اس خیال سے 2رفروری کو منگل کے دن (حاکمِ شہر) کچھ سپاہیوں کے ساتھ اس جگہ آیا اور مکان کے مالکوں کو ساٹھ دوسرے پناہ گزینوں کے ساتھ اپنے ہم راہ لے گیا۔اگرچہ کئی رات دن سب کو حوالات میں رکھا،لیکن باعزت لوگوں کی عزت کا بھی خیال رکھا۔

5فروری

5فروری کو جمعہ کے دن حکیم مرتضٰی خاں اور اُن ے بھتیجے عبدالحکیم خان عرف حکیم کالے کو واپسی کی اجازت مل گئی۔12فروری کو جمعہ کے دن چند دوسرے اشخاص اور 13 فروری کو سنیچر کے دن تین شخص اور واپس آگئے (لیکن) نصف سے زیادہ حوالات میں رہ گئے ۔یہ مصیبت جو پڑوسیوں پر نازل ہوئی اور یہ ہنگامہ جو گلی میں برپا ہوگیا (اس کی وجہ سے) مجھ درویشِ غم زدہ کا دل بھی قابو میں نہیں۔اس کے باوجود کہ اس داروگیر میں مجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا، ابھی تک (یہ عالم ہے) کہ دن بھر متفکر رہتا ہوں اور رات میں آرام کی نیند نہیں سو پاتا ہوں۔

قصیدہ در مدح سر جان لارنس

فروری کے پُر شوکت مہینے میں اس زمانے سے ماہِ فرورین تک (جو موسمِ بہار کا پہلا مہینہ ہے) جس میں آفتاب کی رونق وروشنی بڑھ جاتی ہے،سورج کو ابھی (برج حمل تک پہنچنے کے لیے)ایک مہینے کا سفر طے کرنا ہے۔حاکمِ مہربان،خورشید طلعت ستارہ چشم سر جان لارنس صاحب چیف کمشنر بہادر

کے آنے کی خبر مشہور ہوئی۔ چوں کہ میرا یہ طریقہ رہا ہے کہ جو حاکم، ہندوستان، خصوصاً اس شہر (دہلی) میں آئیں اُن کی مدح میں قصیدہ لکھا جو تہنیتِ فتح اور خیر مقدمِ نوروز پر مشتمل تھا اور 19 فروری کو جمعہ کے دن بہ ذریعہ ڈاک بھیجا۔

20 فروری: خبر فتح لکھنؤ

20 فروری کو شام کے وقت 21 دیو آواز، نہنگ توپوں کی آواز آئی اور اتوار کی صبح کو شہر لکھنؤ کی فتح کی خوش خبری اس تفصیل کے ساتھ سننے میں آئی، کہ 16 فروری کو آسمانِ سروری کے اخترِ تابندہ، سپہ سالار (مریخ) نے سلامتِ دست و بازو کی اتنی دعائیں دیں اور اس قدر تعریف کی کہ اس کے ہونٹوں پر چھالے پڑ گئے اور زبان تھک گئی۔

دنیا کو آبادی کا مژدہ اور اہل دنیا کو نویدِ آزادی اور نیک ذات لوگوں (انگریزوں) کی آرزو پوری ہو گئی اور بُرے اور بد ذات لوگوں کا دور دورہ وہاں بھی ختم ہو گیا۔ پھر سننے میں آیا کہ توپوں (کی گرج) اور شہنائیوں کے نغمے (صرف) حصولِ طاقت کے شادیانے تھے۔ فتح نصیب فوج کے بہادر اس جنگ کے دوران میں شہر پر قابض نہیں ہوئے (بلکہ) دلیروں کی طرح دشمنوں کو قتل کرنے کے لیے دوڑ پڑے (دشمنوں کو) زخمی اور قتل کرنے کے بعد (اپنے) پڑاو کی طرف لوٹ آئے۔

24 فروری: آمد چیف کمشنر

24 فروری کو بدھ کے دن ایک پہر دن چڑھے مبارک وقت میں، باغِ انصاف کے سروِ آزاد آسمانِ رفعت کے ماہِ تابندہ، فرخ طلعت، فرخندہ سیرت، ستارہ حشم چیف کمشنر بہادر نے اپنے توسن کے سموں کے نشانات سے دہلی کی سر زمین کو آسمان کی طرح ستارہ زار بنا دیا اور تیرہ توپوں کی (سلامی کی) آواز نے خستہ دلوں کو مرہم، مہر و محبت کی بشارت دی:

> ''حاکمِ شاہ نشان (کیا) آئے کہ شہر کے (مردہ) جسم میں روح واپس آ گئی۔ شہر میں مسرّت کی ایسی لہر دوڑ گئی ہے جیسے شہنشاہ شاہ جہاں آ گئے ہوں۔''

27 فروری

27 فروری کو جب سنیچر کا دن ختم ہوا اور رات آئی، رات کے تین پہر گذر گئے (اس وقت) مظلوموں کے دل کا دھواں چاند پر اس طرح چھا گیا کہ دیکھنے والے بے اختیار چلّا اُٹھے کہ چاند گہن میں آ گیا۔ اسی سنیچر

کو حکمِ دور باش ختم ہو گیا۔ انصاف چاہنے والے اور پریشان حال لوگوں کو حاضر ہونے کی اجازت اور خواہش مندوں کو پناہ دے دی گئی۔

بے شمار لوگوں کو پھانسی

اس شہر میں قید خانہ شہر سے باہر ہے اور حوالات اندرونِ شہر، ان دونوں میں بے شمار لوگوں کو بھر دیا گیا ہے (ان محدود مقامات میں کثرتِ تعداد کو دیکھ کر) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی میں آدمی سمویا جا رہا ہے۔ ان دونوں قید خانوں کے جن قیدیوں کو مختلف دنوں میں پھانسی دے دی گئی ہے، اُن کی تعداد اور فرشتۂ موت ہی جانتا ہے۔ شہر میں ایک ہزار سے زیادہ مسلمان نہیں پاؤ گے، میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ جو لوگ شہر سے نکل کر چلے گئے ہیں، اُن میں سے کچھ لوگ اس قدر دور نکل گئے ہیں گویا وہ اس سرزمین (دہلی) کے باشندے تھے ہی نہیں۔ بہت سے عالی مرتبہ لوگ شہر کے ارد گرد دو دو، چار چار کوس پر ٹیلوں، گڑھوں، چھپّروں اور کچّے مکانوں میں اپنے نصیب کی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے پڑے ہیں۔ اس ویرانہ نشیں گروہ میں یا تو وہ لوگ ہیں جو شہر میں رہنے کے خواہش مند ہیں یا گرفتار شدہ لوگوں کے رشتے دار ہیں یا خیرات خوار یعنی پنشن دار ہیں۔ لوگوں کی درخواستوں میں رہائی، آبادی اور اجزاے پنشن کے علاوہ اور کوئی (مضمون) نہیں پاؤ گے۔ دادخواہوں کی دو تین ہزار درخواستیں عدالت میں پہنچ چکی ہیں۔ انصاف طلب، چشم براہ اور گوش برآواز ہیں کہ کیا سُننے اور دیکھنے میں آتا ہے۔

8 مارچ

میں بھی اس نیاز نامے اور ستائش نامے کے جواب کا منتظر ہوں، جس کو میں نے بہ ذریعۂ ڈاک بھیجا تھا۔ مختلف خیالاتِ پریشاں کے سبب سے حاکمِ (شہر) کی ''جائے قیام'' پر جانے اور ملاقات کرنے کی کوئی صورت نہیں نکلی ہے۔ مختصر یہ کہ (ہر اعتبار سے) ایسی مصیبتیں ہیں گویا (ہر طرف) کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ اگر باہر نکلو گے تو راستے میں (بچھے ہوئے) دیکھو گے۔ اگر گھر (ہی) میں بیٹھے رہو گے (تو معلوم ہوگا) کہ کپڑوں میں چھپے ہوئے ہیں (کسی طرح سکون نہیں ہے) ابھی تک صبر، بے تابی پر غالب تھا کہ 8 مارچ کو پیر کے دن وہ خط ایک تحریر کے ساتھ میرے پاس واپس آ گیا۔ خط کی پیشانی حاکمِ دانش ور کے اس فرمان سے منوّر تھی کہ خط، فریسندہ کو واپس کر دیا جائے تا کہ وہ حاکمِ شہر کے توسّط سے ہمارے پاس بھیجے۔ سب نے کہا اور میں نے بھی سوچا کہ یہ پُر فائدہ جواب اُمید افزا علامت ہے اور اس

سے معلوم ہوتا ہے کہ میری گزارشات منظور ہو جائیں گی وہ خط جس پر فرمان مسطور تھا، مناسب عبارت کے اضافے کے ساتھ سرورِ عادل رعایا پرور دانش مند، چارلس سانڈرس صاحب چیف کمشنر بہادر کے حضور میں بھیجا اور ایک خط، خاص طور پر ناموِر موصوف (چارلس سانڈرس) کے نام منسلک کر دیا، جو خواہشِ دیرینہ یعنی اجرائے پنشن سے متعلق تھا۔

17مارچ

17 مارچ کو بُدھ کے دن فرماں روا کے حضور سے پہلی خواہش کے بارے میں یہ حکم صادر ہوا کہ یہ خط جس میں تہنیت کے سوا کچھ نہیں ہے اس کے بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے بھی سوچا کہ ایسے پُر آشوب حالات میں مہر و محبت اور مسرّت و انبساط کی کیا گنجایش، میں تو بندۂ شکم ہوں، مجھ کو تو روٹی چاہیے۔ دیکھوں اس دوسری خواہش کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے۔

18مارچ فتح لکھنؤ

18 مارچ کو جمعہ کے دن شام کے وقت روح کو توانائی بخشنے والی آوازِ توپ آسمان کو نیلے گنبد میں گونج اُٹھی۔ (جس سے) لکھنؤ کا فتح ہونا اور اُس شہر میں کینہ خواہ انگریزی فوج کا حسبِ دل خواہ پھیل جانا معلوم ہوا۔ اس شہر میں قلعہ، فصیل، دروازہ کچھ نہیں ہے۔ یقیناً وہاں کے باغیوں کی فوج کی دیوار اس طرف کے بہادروں (انگریزوں) کا راستہ روکے ہوئے ہوگی۔ جب وہ کمزور دیوار بہادروں کی کوشش کی آندھی سے گر گئی ہوگی تو بالیقین سواروں اور پیادوں کے چلنے سے ہر راستے سے گرد و غبار بلند ہوا ہوگا۔ ہاں خدا اپنے فضل سے جس کو بادشاہت عطا کرتا ہے اس کو فتح کرنے کی طاقت اور شان و شوکت بھی عطا کرتا ہے۔ اسی بنا پر جو شخص فرماں رواؤں کی، نافرمانی کرتا ہے، وہ اس قابل ہے کہ اس کے سر پر جوتے لگیں۔ محکوم کا حاکم سے لڑنا (ستالی) پر ہاتھ مارنا (اپنے آپ کو تباہ کرنا) ہے۔ دُنیا والوں کے لیے مناسب ہے کہ جن لوگوں کو خدا نے خوش بختی عطا کی ہے، ان کے سامنے سر جھکا دیں اور فرماں رواؤں کے حکم کی تعمیل سمجھیں۔ جب ہم کو یہ معلوم ہو گیا کہ خوش نصیبی حکومت اور طاقت کس کی بخشی ہوئی ہے تو پھر سرکشی اور بیزاری کیوں۔ نغمہ طرازِ شیراز (سعدی) نے اس بات کو کیسے اچھے انداز سے ادا کیا ہے:

> ''غلام (آقا کے) حکم کے سامنے سر نہیں جھکائے گا تو کیا کرے گا۔ گیند چوگان کی اطاعت کے علاوہ کر بھی کیا سکتی ہے؟۔''

22مارچ سے مجھ دیوانے کے دل میں یہ بات کھٹک رہی ہے کہ دنیا میں فروری کا مہینہ اور نوروز کا دن بھی آتا ہے اور وہ روزِ جہاں افروز (نوروز) انھیں دو چار تاریخوں میں ہوتا تھا۔امسال شاید یہ شہر مُردوں کا مسکن ہے کہ بہار کی آمد آمد پر نعرہ ہائے مسرّت سننے میں نہیں آتے ہیں۔کوئی نہیں کہتا کہ یہ سال ترکوں کے ''سالِ دوازدہ گانہ'' میں سے کون سا سال ہے اور رات دن کے برابر ہونے کی ساعت کب آئے گی۔اگر منجّم مر گئے ہیں اور دن کے بادشاہ (آفتاب) کے سفر کا روزنامچہ تحریر (پیش گوئیِ آثار) سے خالی رہ گیا تو یہ سمجھو کہ چند جھوٹ بولنے والے کم ہو گئے اور یہ فرض کرلو کہ چند جھوٹی باتیں سُنی ہی نہیں۔آفتاب برجِ حمل میں قیام (تحویل) کو بھولا نہیں ہے کہ سبزہ اُگے اور پھول نہ کھلیں۔اصولِ آفرینش بدلتے نہیں ہیں۔آسمان مقررہ اصول گردش کے خلاف عمل نہیں کرسکتا۔

میں باغ پر نہیں، اپنے اوپر آنسو بہار رہا ہوں۔مجھے موسمِ بہار کی کوئی شکایت نہیں ہے، اپنی بدقسمتی کا شکوہ کرر ہا ہوں:

> ''دنیا لالہ کے پھولوں سے رنگین اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو سے مُعطر ہے (لیکن) میں ایک گوشے میں مجبورو بے سروساماں بیٹھا ہوا ہوں۔بہار کا موسم ہے اور میں بالکل بے سروساماں ہوں۔مفلسی کے سبب سے گھر کا دروازہ بند ہے۔''

روانگی حکیم محمود خاں

میں روتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ زمانہ بہت بے پرواہے۔میں زاویہ نشینِ غم و آلام اگر سبزہ و گل کو نہیں دیکھوں گا اور دماغ کو پھولوں کو خوشبو سے معطر نہیں کروں گا تو بہار میں کیا کمی آجائے گی اور ہوا سے کون تاوان لے گا؟

اپریل کے مہینے میں جس میں دو مثلث ماہِ فروردین کی اور ایک ثلث ماہِ اردی کا ہے حکیم محمود خاں کے ساتھ جو لوگ قید خانے میں باقی تھے، رہا ہو گئے۔ہر ایک نے اپنا راستہ لیا۔وہ ناز پروردہ، صاف طینت (حکیم محمود خاں) سارے رشتہ داروں، بیوی بچوں اور متعلقین کے ساتھ پٹیالے کی طرف چلا گیا۔کہتے ہیں ابھی تک وہ کرنال میں مقیم ہیں۔معلوم نہیں آیندہ کے لیے کیا سوچا ہے۔

فتح مراد آباد

مئی کے شروع میں کانوں کو یہ خبر سننے کا فخر حاصل ہوا کہ سپاہِ کینہ خواہ کے بہادروں نے مراد آباد کو

فتح کرلیا۔ جو بد اندیش (باغیوں) کی گذر گاہ تھا اور اس شہر کو انصاف سے آراستہ کرنے کے لیے عالی نسب سر چشمۂ علم و دانش نواب یوسف علی خاں بہادر کے حوالے کر دیا۔ آج کل (نواب یوسف علی خاں) جو دنیا کو فتح کرنے اور دنیا پر حکومت کرنے کے اہل ہیں، اس علاقے پر تعمیلِ حکم کے طور پر فرماں روائی کر رہے ہیں، (اور مجھ کو) اُمید ہے کہ ہمیشہ فرماں روائی کرتے رہیں گے۔

فتح بریلی

اس کے علاوہ کہتے ہیں کہ کوہ شگاف اور اژدہا شکار فوج نے جب (بریلی اور مراد آباد کے) اس علاقے پر یورش کی، تو بریلی کے گناہ گار (باغیوں)، کو اس طرح نکال باہر کیا، جیسے طاقت ور موجیں خس و خاشاک کو کنارے پر پھینک دیتی ہیں۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے توقع ہے کہ جو گراں جان (باغی) اِدھر اُدھر باقی رہ گئے ہیں، شہروں، گانوں میں لوگوں کو پریشان کرتے ہیں اور راستہ چلنے والوں کو ستاتے ہیں اُن کا دور دورہ بھی جلد ختم ہو جائے گا اور سارا ملک حاکمانِ عادل (انگریز) کے پرچم کے زیر سایہ آجائے گا۔

13جون:احوال بهادر جنگ خاں

13 جون کو اتوار کے دن شام کے وقت حاکمِ شہر نے بہادر جنگ خان کو اپنے پاس بلایا، جو قلعہ میں نظر بند تھے۔ وہ بڑی اُمیدوں کے ساتھ گئے۔ جاں بخشی اور ایک ہزار ماہانہ وظیفہ مقرر کیے جانے کی خوش خبری سُنائی گئی اور حکم ہوا کہ لاہور کی طرف چلے جائیں۔ اس کے بعد آزادی کی زندگی بسر ہوگی اور اسی شہر (لاہور) میں رہنا ہوگا۔ بے شک ان حالت میں مناسب یہی ہے کہ وہ (بہادر جنگ خاں) جاہ و دولت کے غم وافسوس سے آزاد ہو جائیں اور اس آزادی پر مسرور و مطمئن ہوں۔

فتح گوالیر

دن کا شہنشاہ (آفتاب) جس کا سر روزانہ نیزے پر گھمایا جاتا ہے، ابھی اُفق مشرق سے بہ قدرِ یک نیزہ بلند نہیں ہوا تھا کہ ماہ جون کے گزرے ہوئے دنوں کی تعداد کے برابر رعد کی طرح گرجنے والی توپوں کی آواز بلند ہوئی (21 ضرب توپ سے مراد ہے) جس نے دوستوں کے دل کو مسرّت و شادمانی سے معمور کر دیا اور آگ سے زیادہ جلانے والی (غم کی) راکھ دشمنوں کے سر اور چہرے پر ڈال دی۔ گوالیار کا شہر فتح ہو جانے اور اس سنگین قلعہ کے ہاتھ آجانے کی خوش خبری جو زمین کا گوشہ اور پہاڑ کا لختِ جگر

ہے،خدا کے دربار سے سرکشوں کی موت کا پروانہ لائی (اس مژدۂ پُر مسرّت نے) حاکموں اور فرماں رواؤں کو آرزوؤں کے چراغ جل اُٹھنے اور (آرزوئیں پوری ہو جانے) کی بشارت دی۔

یہ داستان یوں ہے کہ باغیوں نے گوالیار پر قبضہ کر لیا۔فرماں روائے گوالیار مہار جا جیا جی راو حکومت اور شہر دونوں کو چھوڑ کر آگرے چلے گئے اور انگریزوں سے مدد چاہی (انگریزوں نے) بھاگم بھاگ ہر طرف سے گوالیار کا رُخ کیا (تھا) یہاں ایسی شکستِ فاش ہوئی۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان گم راہوں کا انجام یہ ہوگا، کہ بدحالی و پژمردی کے ساتھ اِدھر اُدھر لوٹ مار کرتے پھریں گے، اور آخر کار جگہ جگہ ذلّت و خواری کے ساتھ مارے جائیں گے۔ان کے صحرا نورد گھوڑوں کو بے آب وگیاہ میدانوں میں زمین پر پڑا ہوا (مردہ) دیکھو گے اور اس گروہ کے ساز و سامان کو گذر گاہوں میں بکھرا ہوا پاؤ گے۔پھر ہندوستان خس وخار (ظلم وستم) سے ایسا پاک ہو جائے گا کہ جنگل ہر گوشہ باغ کی طرف سر سبز ہوگا اور ہر رہ گذر بازار کی طرح پُر رونق نظر آئے گی۔

راقم الحروف کی زندگی کے تریسٹھ سال گزر چکے ہیں۔ان طرح طرح کے روح فرسا غموں (کے سبب) سے ظاہر ہے کہ اب زمانے سے اور زیادہ فرصت (عمر) کی توقع بے جا ہے۔مجبوراً سحر نگارِ شیراز (سعدیؔ) رحمتہ اللہ علیہ کے اشعار کو دہراتا ہوں، اور جس طرح ایک غم نصیب دوسرے غم زدہ شخص سے نصیحت حاصل کر سکتا ہے، ان اشعار کو (پڑھ کر) اگر دل کو خوش نہیں کر سکتا ہوں تو کم سے کم قیدِ رنج وغم سے آزاد تو کر ہی لوں گا:

> ''افسوس! ہمارے بغیر اس دنیا میں بار ہا بہاریں آئیں گی اور پھول کھلیں گے۔تیر، دے اور اردی بہشت کے مہینے بار بار آئیں گے جب کہ ہم (قبر میں) خاک ہو چکے ہوں گے۔''

فی الحقیقت سچّی بات کو چھپانا اچھے لوگوں کا طریقہ نہیں ہے۔میں نے نیم مسلمان مذہبی پابندیوں سے آزاد ہوں اور بدنامی و رسوائی کے رنج سے بے نیاز، ہمیشہ سے رات میں صرف ولایتی شراب پینے کی عادت تھی۔ولایتی شراب نہیں ملتی تھی تو نیند نہیں آتی تھی آج کل جب کہ انگریزی شراب شہر میں بہت مہنگی ہے اور میں بالکل مفلس ہوں، اگر خدا دوست، خدا شناس، فیّاض، دریا دل، مہیش داس دیسی شرابِ قند جو رنگ میں ولایتی شراب کے برابر اور بو میں اس سے بڑھ کر ہے بھیج کر آتشِ دل کو سرد نہ کرتے تو میں زندہ

نہیں رہتا، اسی عالمِ جگر تشنگی میں مر جاتا:

> ''عرصے سے دل چاہتا تھا کہ کسی طرح میری آرزو پوری ہو جائے (آرزو یہ تھی کہ) شرابِ ناب کے ایک دو ساغر مل جائیں۔ دانش مند مہیش داس نے مجھ کو وہ آبِ حیات بخش دیا جس کو سکندر نے اپنے لیے ڈھونڈا تھا۔''

یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس نیکی پسند شخص (مہیش داس) نے (شہر میں) مسلمانوں کی آباد کاری کے متعلق کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ چوں کہ خدا کی مرضی نہیں تھی رہنا مہربان حاکموں کی محبت اور مہربانی کا نتیجہ ہے۔ بہ ہر حال اس نیکی پسند بہی خواہ کے ساتھ نیکی کرتا ہے۔ زندگی عیش و مسرت کے ساتھ گزارتا ہے۔ اگر چہ مجھ سے بہت پُرانی شناسائی نہیں ہے، اتفاقاً کبھی اور بات چیت ہو جاتی ہے اور کبھی کوئی تحفہ بھیج کر مجھ کو ممنون کرتا ہے۔

ھندو شاگردوں اور دوستوں کی امداد کا اعتراف

میرے دوسرے متعلقین اور شاگردوں سے ہیرا سنگھ، جو ایک نیک نام نوجوان اور تعلقات کا بہت خیال رکھنے والا ہے (برابر) آتا رہتا ہے اور میرا غم غلط کرتا ہے۔ اس نصف آباد نصف ویران شہر کے لوگوں میں سے عالی نسب شیو جی رام برہمن جو ایک عقل مند نوجوان ہے اور مجھ کو بیٹے کی طرح عزیز ہے۔ مجھ درویشِ غم زدہ کو بہت کم تنہا چھوڑتا ہے۔ فرماں برداری اور کارسازی کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا لڑکا بال مکند جو ایک پرہیز گار اور خوش اخلاق نوجوان ہے، اپنے والد کی طرح تعمیلِ حکم میں مستعد اور غم گساری میں یکتا ہے۔

دور دراز کے دوستوں میں سے (ایک دوست) آسمانِ محبّت کے ماہِ کامل شیوا بیان، ہرگوپال تفتہؔ (بھی ہیں) جو میرے پُرانے مونس و ہمدم ہیں اور اس بنا پر کہ مجھ کو اپنا استاد کہتے ہیں ان کا کلام ساری خداداد خوبیوں کے ساتھ میرے لیے سرمایۂ ناز ہے۔ مختصر یہ کہ بہت اچھے آدمی ہیں سرتاپا محبت و اخلاص۔ شاعری سے ان کو فروغ (شہرت) حاصل ہے اور ان کے دم سے شاعری کے ہنگامے گرم رہتے ہیں۔ انتہائے محبت سے میں نے ان کو اپنا جز و روح سمجھ لیا ہے اور ''میرزا تفتہؔ'' خطاب دیا ہے۔ انھوں نے میرٹھ سے ایک ہنڈی میرے پاس بھیجی، نیز غزل اور خط برابر بھیجتے رہتے ہیں۔

یہ باتیں جن کا لکھنا لازمی نہیں تھا، صرف اس لیے لکھیں کہ (ان لوگوں کی) فیّاضی اور محبت کا

شکریہ ادا ہو جائے، نیز اس لیے بھی (لکھیں) کہ جب یہ داستان دوستوں کے ہاتھوں میں آئے تو وہ سمجھ لیں کہ شہر مسلمانوں سے خالی ہے۔ راتوں کو ان لوگوں کے گھر چراغ سے محروم رہتے ہیں اور دن میں دیواروں کے روزن دھویں سے۔ غالبؔ جس کے شہر میں ہزاروں دوست تھے ہر گھر میں شناسا اور واقف کار موجود تھے، اس تنہائی میں قلم کے سوا کوئی اس کا ہم زباں اور (اپنے) سایے کے علاوہ کوئی ساتھی نہیں ہے:

> ''اب میرے چہرے پر اس وقت تک آب و رنگ نہیں آتا ہے، جب تک کہ ہزار بار اشکِ خوں سے چہرے کو تر نہ کروں۔ میرے جسم میں غم و افسوس، جان و دل بن گئے ہیں اور میرے بستر کا تانا بانا کانٹوں سے (تیار ہوا) ہے۔''

گھر کی تباہی

اگر شہر میں یہ چاروں شخص نہ ہوتے تو کوئی شخص میری بے کسی کا گواہ بھی نہ ہوتا۔ (گردشِ) روزگار پر رشک آتا ہے کہ اس لوٹ مار میں جب کہ شہر کے کسی گھر میں مٹی بھی نہیں بچی، اگر چہ میرا گھر لوٹ مار کرنے والوں کی دراز دستی سے محفوظ رہا (لیکن، میں قسم کھا سکتا ہوں کہ ستے اور پہننے کے کپڑوں کے علاوہ گھر میں کچھ نہیں رہا۔ اس عقدۂ دشوار کا حل اور اس دروغ نما سچ کی حقیقت یہ ہے کہ جس وقت کالوں (باغیوں) نے شہر پر قبضہ کیا بیگم نے مجھ سے کہے بغیر قیمتی چیزیں زیور، وغیرہ جو کچھ تھا خفیہ طور پر کالے صاحب پیرزادہ کے یہاں بھیج دیا۔ وہاں تہہ خانے میں محفوظ کر دیا گیا اور دروازہ مٹی سے پاٹ دیا گیا۔

جب فاتح (انگریزوں) نے شہر کو فتح کیا اور سپاہیوں کو لوٹ مار کا حکم مل گیا تب بیگم نے یہ راز مجھ سے کہا، وقت نکل چکا تھا۔ وہاں تک جانے اور (سامان) لانے کی کوئی گنجایش نہیں رہی تھی۔ میں خاموش ہو گیا اور دل کو سمجھا لیا کہ یہ چیزیں جانے والی ہی تھیں، اچھا ہوا کہ میرے گھر سے نہیں گئیں۔

تنگ دستی و مجبوری

اب یہ جولائی کا پندرھواں مہینہ ہے۔ قدیم پنشن جو سرکار انگریزی سے (ملتی تھی) اُس کے ملنے کا کوئی ذریعہ نہ نکلا۔ بستر اور کپڑے بیچ بیچ کر زندگی گزار رہا ہوں۔ گویا دوسرے لوگ روٹی کھاتے ہیں، میں کپڑے کھاتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ جب کپڑے سب (بیچ کر) کھالوں گا عالمِ برہنگی میں بھوک سے مر جاؤں گا۔

اس قیامت میں پُرانے نوکروں میں سے دو تین نوکر میرے پاس سے نہیں گئے۔ان کی پرورش کرنا ہے۔انصاف کی بات تو یہ ہے کہ آدمی، آدمی کے بغیر رہ نہیں سکتا۔نوکر کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا،اس گروہِ (ملازمین) کے علاوہ دوسرے ضرورت مند جو ہمیشہ سے مجھ سے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھانے کے عادی ہیں،اس بُرے وقت میں بھی اپنی روح فرسا آواز (سوال) سے مرغ کی صدا ے بے ہنگام سے زیادہ تکلف پہنچاتے ہیں۔

اب جب کہ جسمانی تکلیفوں کے دباؤ اور روحانی اذیتوں کی گداختگی نے جسم و جان کو تباہ کر دیا ہے،یکا یک دل میں خیال آیا کہ اس کھلونے کو آراستہ کرنے میں (جس کا نام تصنیف ہے) کب تک مشغول رہا جا سکتا ہے۔یقیناً اس کشمکش کا انجام یا تو موت ہے،یا بھیک مانگنا۔پہلی صورت میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا کہ یہ داستان ہمیشہ کے لیے انجام و اختتام سے محروم رہے اور پڑھنے والوں کے دلوں کو افسردہ کرے۔

دوسری صورت میں (یہ بات) ظاہر ہے کہ اس ساری داستان میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ فلاں گلی سے سرِ بازار دھتکار دیا گیا اور فلاں دروازے پر کچھ مل گیا۔پھر یہ باتیں کب تک بیان کی جا سکتی ہیں اور اپنے آپ کو (کہاں تک) رُسوا کیا جا سکتا ہے۔باقی پنشن اگر مل گئی،تب بھی آئینۂ (دل) سے زنگِ (غم) صاف نہیں ہو سکے گا۔(فرض ادا نہیں ہوگا) اگر نہیں ملی،اس صورت میں شیشۂ پتھر سے چور چور ہو جائے گا (تباہی یقینی ہے) اور سب سے زیادہ لوگوں کو ساز گار نہیں آتی ہے،یقیناً شہر سے بھاگنا ہوگا اور کسی دوسرے شہر میں رہنا ہوگا۔

تفصیل وقائع دستنبو

مئی سالِ گذشتہ سے لے کر جولائی 1857 تک کی روداد میں نے لکھی ہے۔یکم اگست سے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔کاش میری ان تینوں خواہشوں یعنی خطاب،خلعت اور پنشن کے اجرا کا حکم شہنشاہِ فیروز بخت کے حضور آ جائے جن کے متعلق میں نے اس تحریر میں بھی (کچھ) لکھا ہے۔میری آنکھیں اور میرا دل انھیں کی طرف لگا ہوا ہے وہ شہنشاہ کہ چاند جس کے سر کا تاج ہے۔آسمان جس کا تخت ہے،جمشید نشان،فریدوں فر کاؤس مرتبہ،سنجر شکوہ،سکندر حشم،وہ شہنشاہ کہ شاہِ روم اس بات کے لیے اس کا شکر گزار رہے کہ اس کے تخت و تاج کی عزّت رہ گئی۔فرماں روا ے روس کا دل اُس کی لشکر کشی کے خوف سے دو

نیم ہے۔آفتاب اس خیال سے کہ (یہ) جہاں سوزی اس کی ناراضی کا سبب ہے اگر ڈرتا نہیں ہے تو پھر وہ کیوں ہر لحہ کانپتا رہتا ہے اور ماہِ کامل اس اندیشے سے کہ دنیا کو منور کرنے میں اس کی برابری کا احتمال ہے اگر اپنی گستاخی کی معافی نہیں چاہتا ہے تو پھر کیوں ہر رات خوف سے گھٹتا رہتا ہے:

''وہ مالکِ تیغ ونگیں وعلم ہے۔وہ شہنشاہ سلطنت بخش اور بادشاہ ساز ہے صاحبِ دانش،فرخ طلعت اور نیک خو ہے۔اس کا مرتبہ انصاف میں نوشیرواں سے بلند تر ہے۔جمشید کے پاس جو درخشاں علم تھا وہ اس لیے اس کو حفاظت سے رکھتا تھا کہ اس ملکۂ نامور کے سپرد کر دے۔''

خسرو کی طرف سے ترنجِ زر اور اس کے ساتوں خزانے بغیر رحمت اُٹھائے ہو ملکہ کو بہ طورِ تحفہ ملے ہیں۔

وہ تختِ (سلیمانؑ) جس کو ہوا اپنے کاندھوں پر لے جاتی تھی فرشتۂ غیب نے ملکہ کے سامنے بہ طور پیش کش پیش کیا ہے۔

تم نہیں دیکھتے ہو کہ پہاڑوں پتھروں کے جگر سے گوہرِ رنگا رنگ برآمد ہوتے ہیں،سورج کو اس کے تاج کا خیال رہتا ہے،ورنہ اُسے موتیوں سے کیا کام۔

اگر وہ (ملکہ وکٹوریہ) موتی لٹانے کا ارادہ کریں اور لٹائیں تو (کثرتِ بخشش سے یہ حالت ہوگی کہ) اگر کوئی شخص ان موتیوں کو شمار کرنا چاہے گا تو شمار کرتے کرتے اس کی انگلیاں گھِس جائیں گی۔

اس کی فوج کے خوف سے جو لڑائی کے وقت دریاؤں اور پہاڑوں کو تباہ کر دیتی ہیم،پہاڑوں میں اژدہے اور دریاؤں میں نہنگ سر پٹک کر مر جائیں گے۔

اس کی شان وشوکت کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے بادشاہ (اس کے در کے) گدا ہیں۔

اس کی ضیا بخشی اور کرمِ بے دریغ کا یہ فیض ہے کہ یہ سورج روشن ہے اور بادل میں برسنے کی صلاحیت ہے۔

وہ کرم وفیاضی سے اہلِ علم ودانش کو نوازتی ہیں اور ان کی دانش مندی کی برکت سے دوسرے لوگ صاحبِ خرد ہو جاتے ہیں۔ان کی سخاوت حیرت آفریں ہے اور

ان کی عقل رسا،ان کا نام ملکۂ عالم وکٹوریہ ہے۔خداے پاک ان کا نگہبان
رہے(خدا کرے)اس محفلِ (ہستی) میں اُن کا قیام دیر تک رہے۔"

اگر ملکۂ عالم کی بخشش سے میں کچھ حاصل کرلوں گا تو اس دنیا سے نا کام نہیں جاؤں گا:

"جب بات یہاں تک آپہنچی تو میں خاموش ہوگیا، میں داستان کہنا نہیں چاہتا ہوں۔"

مکمل ہونے کے بعد اس کتاب کا نام "دستنبو" رکھا گیا (یہ کتاب) لوگوں کو دی گئی، اور اِدھر اُدھر بھیجی گئی تا کہ صاحبانِ علم و دانش کی روح کو تسکین بخشے، اور انشا پرداز (اندازِ نگارش پر) فریفتہ ہو جائیں۔اُمید ہے کہ یہ مجموعۂ دانش (دستنبو) انصاف پسند لوگوں کے ہاتھوں میں گلدستۂ پُر رنگ و بو ہوگا اور شیطان فطرت لوگوں کی نگاہوں میں آتشیں گیند، آمین:

"ہماری طبیعت جو ہمیشہ رواں رہتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم رازہاے آسانی کا
سر چشمہ ہیں۔یہ کتاب دساتیر ہی کا ایک حصہ ہے اس کا ردانی کے لحاظ
سے (گویا) ہم ساسانِ ششم ہیں۔"

(دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کا تحقیقی رسالہ اُردوے معلٰی، غالب نمبر حصہ دوم، جلد دوم، شمارہ 2و 3، مرتب خواجہ احمد فاروقی، اشاعت فروری 1961، ص 177 تا 232)

نوٹ: رشید حسن خاں نے غالب کے فارسی روزنامچہ "دستنبو" کے کُل صفحات "79" کا اُردو میں ترجمہ کیا۔

☆۔"دستنبو" پہلی بار نومبر 1858 میں شائع ہوئی۔یہ فارسی قدیم میں تھی اور فارسی بھی وہ فارسیِ قدیم جس کا اُس زمانے میں پارس کے بلاد میں بھی نشان نہیں رہا تھا۔ہندوستان کا تو کیا مذکور۔غالب نے بہ طریقِ لزومِ مالا یلزم اس کا التزام کیا تھا کہ یہ زبانِ فارسیِ قدیم جو دساتیر کی زبان ہے۔اُس میں یہ نسخہ لکھا جاوے اور سواے اسما کے وہ نہیں بدلے جاتے، کوئی لغت عربی اس میں نہ آوے۔اس لیے "دستنبو" کا اُردو ترجمہ کرنا بڑا کٹھن اور دشوار گذار کام تھا۔یہی وجہ ہے کہ کتاب کی اشاعت اور غالبؔ کے انتقال کے پچاس برس بعد تک کسی کو اِس 'جرِ ثقیل" کتاب کا اُردو ترجمہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔اب نصف صدی پہلے خواجہ حسن نظامی کی فرمایش پر میرزا محمد یعقوب بیگ نامی ایم.اے نے پہلی بار اس مشکل کام کو ہاتھ میں لیا۔اُن کا ترجمہ 1920 میں خواجہ حسن نظامی کی تالیف "میرزا غالبؔ کا روزنامچہ" کے ساتھ شائع ہوا۔خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ:

"دستنبو" کا ترجمہ آسان نہ تھا کیوں کہ وہ نہایت سخت فارسی میں ہے، مگر نامی

صاحب نے دو دن کے اندر اتنے مشکل کام کو آسان کر کے دے دیا۔'' روز نامچہ طبع سوم، ص 59) ''غالب کی سخت اور مشکل فارسی عبارت جس کو عربی الفاظ سے دانستہ محفوظ لکھنے کی کوشش کی گئی تھی، ایسا عام فہم اور صحیح ترجمہ کیا گیا ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔'' (روز نامچہ طبع سوم، ص 72)

میرزا محمد یعقوب بیگ نامی کا ترجمہ، اس میں شبہہ نہیں کہ بہت عمدہ ہے لیکن یہ پوری کتاب کا نہیں، اس کے صرف جستہ جستہ حصوں کا اُردو ترجمہ ہے، اسی لیے یہ صرف گیارہ صفحات کو محیط ہے۔ (طبع سوم، ص 60۔71)

1961 میں دستنبو کے دو الگ کلّی تراجم سامنے آئے۔ ایک ترجمہ رسالہ تحریک دہلی، اپریل مئی 1961 (ص 53۔73) میں چھپا تھا۔ یہ ترجمہ مخمور سعیدی کا ہے۔ دوسرا ترجمہ رسالہ اُردوے معلّٰی دہلی جلد دوم، شمارہ، 3 بابت فروری 1961 (ص 177۔232) شائع ہوا۔ یہ ترجمہ رشید حسن خاں کا کیا ہوا ہے۔ یہی ترجمہ رسالہ افکار (کراچی) کے غالب نمبر میں، اُردوے معلّٰی سے نقل کیا گیا تھا۔ (غالب اور انقلابِ ستاون، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2007، ص 95)

OOO

دیوانِ غالب — صدی اڈیشن، دہلی

یہ کہا گیا ہے کہ حیدرآباد کی آصفیہ لائبریری میں، دہلی کے مطبعِ احمدی کا چھپا ہوا دیوانِ غالب (اُردو) کا وہ نسخہ محفوظ ہے، جس کی غلطیوں کی تصحیح غالب نے اپنے قلم سے کی تھی۔ اور اسی تصحیح شدہ نسخے سے، مطبعِ نظامی کان پور والا نسخہ چھپا ہے، جو ''دیوانِ غالب صدی اڈیشن'' کے مرتّب جناب مالک رام کی نظر میں، کلامِ غالب کا مستندترین اڈیشن ہے۔

مختصر الفاظ میں اِس کی داستان یہ ہے کہ غالب کے اُردو دیوان کا تیسرا اڈیشن جولائی ۱۸۶۱ء میں، مطبعِ احمدی (دہلی) سے شائع ہوا تھا۔ یہ نسخہ بہت بدنما اور غلط چھپا تھا۔ غالب اِس کو دیکھ کر بہت جز بز ہوئے۔ میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں، اسی دیوان کے سلسلے میں اُنھوں نے یہاں تک لکھا ہے: ''دلّی پر اور اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت''۔ مالک رام صاحب کے الفاظ میں: ''اب اور کچھ تو ہو نہیں سکتا تھا، فوراً ایک نسخے کی تصحیح کر کے اسے پھر چھاپنے کے لیے، اسی مطبعِ احمدی کے مالک مولوی محمد حسین خاں ہی کے حوالے کیا کہ اِس کی دوبارہ اشاعت کا انتظام کریں'' (مقدّمہ دیوانِ غالب، آزاد کتاب گھر، دہلی)۔ غالب نے اسی مطبوعہ نسخے کے آخری صفحے کے حاشیے پر یہ خط اپنے قلم سے لکھا تھا:

> ''جناب محمد حسین خاں کو میرا اسلام پہنچے۔ دو رات دن کی محنت میں، مَیں نے اِس نسخے کو صحیح کیا ہے۔ غلط نامہ بھی اِسی میں درج کر دیا ہے۔ گویا اب غلط نامہ بے کارِ محض ہو گیا ہے، خاتمے کی عبارت، کیا میرا بیان، کیا میر قمرالدین کا

اظہار، اب کچھ ضرور نہیں، کس واسطے کہ اب یہ کتاب اور مطبع میں چھاپی جائے گی۔ یہ مجلّد گویا مسوّدہ ہے، اسی کو بھیج دیجیے۔ غالبؔ''۔

''مولوی محمد حسین خاں نے یہ تصحیح شدہ نسخہ (مسوّدہ) جناب محمد عبدالرحمٰن (بن حاجی محمد روشن خاں) مالک مطبعِ نظامی کان پور کے پاس چھپنے کو بھیج دیا...اور یہ نادر نسخہ آج کل کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے'' (مالک رام صاحب، مقدّمۂ دیوانِ غالب، آزاد کتاب گھر، دہلی) — یہ کہا گیا ہے کہ غالبؔ کے صحیح کیے ہوئے اسی نادر نسخے سے ۱۸۶۲ء میں مطبعِ نظامی والا نسخہ چھپا تھا۔

اِس زمانے میں، قابلِ ذکر حضرات میں سے مخدومی عرشی صاحب اور محترمی مالک رام صاحب نے غالبؔ کے اُردو دیوان کو مرتّب کیا ہے۔ مالک رام صاحب نے نسخۂ نظامی کو متن کی بنیاد بنایا ہے، اس لیے کہ ان کی راے میں مطبعِ نظامی کان پور کا چھپا ہوا دیوان، غالبؔ کے اُردو کلام کا آخری مستند اڈیشن ہے، اور اب اِسی کو متن کی بنیاد بنایا جانا چاہیے، کیوں کہ ''جب غالبؔ نے مطبعِ احمدی کا متن دیکھ کر اور اُسے درست کر کے، دیوان مطبعِ نظامی میں چھپوایا، تو اِس کا یہ مطلب ہوا کہ اُنھوں نے متن ہمیشہ کے لیے خود طے کر دیا۔ اب اِس سے پہلے کے اڈیشنوں کو، ہم نہ صرف متن میں استعمال نہیں کر سکتے بلکہ وہ شاید اختلافِ نسخ کے تحت بھی نہیں آئیں گے'' (مقدّمۂ دیوانِ غالب، آزاد کتاب گھر، دہلی، ص ۳۱)۔

اِس کے برخلاف، عرشی صاحب نے مطبعِ نظامی والے اڈیشن کو آخری مستند اڈیشن کا درجہ نہیں دیا۔ اِس کے بجاے اُنھوں نے متعدّد خطّی اور مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھا ہے۔ گویا صرف مالک رام صاحب، مطبعِ نظامی کے نسخے کو درست ترین اور مستند ترین مانتے ہیں اور اِس اعتبار کی وجہ اُن کے نزدیک یہ ہے کہ مطبعِ نظامی کا چھاپا، اُس نسخے پر مبنی ہے جس کی تصحیح غالبؔ نے ''دوراتِ دن کی محنت میں'' کی تھی، جس کے آخری صفحے کے حاشیے پر اپنے ہاتھ سے خط لکھا تھا، اور جو اتّفاق سے حیدرآباد میں محفوظ ہے — مگر یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اِس اہمیّت کے باوجود، اُس نسخے کا مفصّل تعارف نہیں کرایا گیا۔ مالک رام صاحب کی تحریر سے قطعیّت کے ساتھ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ موصوف نے اُس نسخے کو بہ چشمِ خود دیکھا ہے، یا کسی روایت پر بھروسا کیا ہے؛ البتہ بعض قرائن اِس پر دلالت ضرور کرتے ہیں کہ موصوف نے اُس نسخے کو خود نہیں دیکھا، محض روایت پر بھروسا کیا ہے[۱]۔ اور اِس سے جو صورتِ حال پیدا ہونا چاہیے تھی، وہ پیدا ہوئی ہے۔

اب سے چند سال پہلے ایک کام کے سلسلے میں حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا تھا، میں نے پہلی فرصت میں اِس نسخے کی زیارت کی۔ اِس نسخے کے آخری صفحے کے حاشیے پر غالبؔ کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ خط ملتا ہے جس کو اوپر نقل کیا جا چکا ہے، اور اِس میں کسی طرح کے شک کی گنجایش نہیں۔ اِس سے یہ تو مسلّم ہو جاتا ہے کہ یہ نسخہ وہی ہے جس کے آخری صفحے پر، غالبؔ نے محمد حسین خاں کے نام خط لکھا تھا۔ مگر اِس نسخے کے مطالعے سے اِس بات کی تصدیق نہیں ہو پاتی کہ یہ وہی نسخہ ہے جس کو غالبؔ نے بہ قولِ خود ''دو رات دن کی محنت میں'' صحیح کیا تھا۔ اِس میں شک نہیں کہ اِس نسخے کے متعدّد صفحات پر جا بہ جا تصحیحات ملتی ہیں، مگر دو چار مقامات کے سوا، یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ سب بہ خطِّ غالبؔ ہیں۔ اِس کے برخلاف بعض مقامات پر یقین کے ساتھ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ تصحیحات کسی اور شخص کی کارگزاری کا نتیجہ ہیں۔ اِن دو چار مقامات کو بھی تصدیقِ مزید کے بغیر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اور خاص بات یہ بھی ہے کہ اکثر مقامات پر اغلاطِ کتابت جوں کی توں موجود ہیں، یعنی کسی طرح کی تصحیح نہیں کی گئی— ذیل میں کچھ تفصیلات پیش کی جاتی ہیں، اِن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ایک دو جگہ مقطع پہلے چھپ گیا ہے اور مقطعے سے پہلے والا شعر بعد کو چھپا ہے؛ وہاں سیاہی سے ''م'' اور ''ح'' لکھا گیا ہے، اور اِن مقامات پر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ حروف شاید بہ خطِّ غالبؔ ہیں۔

ص ۴ پر ایک شعر اِس طرح چھپا ہے:

''احباب چارہ سازی وحشت نہ کرسکے

''زندانمیں بھی خیال تہا رہتا نبرد تھا''

دوسرے مصرعے میں تصحیح کی ضرورت تھی، مگر تصحیح نظر نہیں آتی، البتہ ''تہا رہتا نبردن کے'' ایک لکیر کھنچی ہوئی ہے۔ ص ۷ پر ایک مصرع یوں چھپا ہوا ہے، ع: ''انتظارِ صید میں، ایک دیدۂ بیخواب تہا''۔ اِس میں ''دیدہ'' کی ی نقطوں کے بغیر ہے۔ یہاں اِس لفظ کے گرد پنسل سے ایک دائرہ کھینچ دیا گیا ہے۔ اِسی طرح ص ۱۱ پر اِس مصرعے میں، ع: جمع کرتی ہو کیوں رقیبوں کو'' فعل ''کرتی ہو'' پر پنسل سے ایک لمبوترا حلقہ بنا ہوا ملتا ہے، مگر ایسے اور بہت سے مقامات پر یہ صورت نہیں ملتی۔ خود غالبؔ یاے معروف و مجہول کے لکھنے میں کسی طرح کا امتیاز نہیں کیا کرتے تھے، اور یہ اُس زمانے کی عام روش تھی؛ پھر اِسی ایک جگہ یہ حلقہ کیوں بنایا گیا اور وہ بھی پنسل سے!! غالبؔ کی نظر میں ''کرتی ہو'' غلط ہو یا تصحیح طلب ہو، یہ بات ماننے کے

قابل نہیں، پھر یہ کس کی کارگزاری ہے؟ لازماً یہ کسی اور شخص کا کام ہے۔ پنسل کے نشانات کئی جگہ ہیں۔ مثلاً ص ۷ پر اس مصرعے میں: ''دل کہ ذوق کاوش ناخن سے لذت یاب تھا'' لفظ ''کاوش'' نقطوں کے بغیر چھپا ہوا ہے اور یہاں ''س'' پر پنسل سے تین نقطے رکھے گئے ہیں۔ میرے نزدیک ایسے سب نشانات، بہت بعد کے کسی شخص کی کارفرمائی سے تعلّق رکھتے ہیں۔

بعض مقامات پر سرخ روشنائی سے تصحیح کی گئی ہے اس کے متعلّق بھی میرا خیال ہے کہ یہ کسی اور شخص کا کام ہے۔ اِس سلسلے میں ایک دل چسپ اور اہم مثال یہ ہے کہ ص ۷ اپر ایک مصرع یوں چھپا ہوا ہے، ع: افسوس کہ دیداں کا کیا رزق فلک نے''۔ اِس میں ''دیداں'' نقطوں کے بغیر چھپا ہوا ہے۔ کسی شخص نے پہلے تو سرخ روشنائی کے نون کا نقطہ رکھّا یعنی اسے ''دنداں'' بنایا، اور پھر (اُسی شخص نے یا کسی اور نے) اِس نقطے کو کاٹ کر، نیچے ی کے دو نقطے رکھّے۔ اب اِس لفظ کی صورت یہ ہوگئی ہے ''دیداں''۔ (یہ خیال رہے کہ کلامِ غالبؔ کے اور سب مصرعوں میں یہاں ''دنداں'' ہے۔ اِس کی بحث آگے آئے گی)۔

ص ۱۳ اپر ایک مصرع یوں چھپا ہوا ہے: ''آہ وہ جرات فریاد گہاں''، اِس میں ''گہاں'' کے ایک مرکز کو سرخ روشنائی سے کاٹ دیا گیا ہے، مگر اس کا التزام نہیں ملتا کہ کاف و گاف کی ہر جگہ تصحیح کی جائے۔ ذیل میں بہ طورِ مثال کچھ مصرعے نقل کیے جاتے ہیں؛ اِن میں خط کشیدہ مقامات تصحیح طلب ہیں، مگر تصحیح نہیں ملتی:

ع : نشوونما ہے اصل سے غالب فروغ کو (ص ۴۰)

ع : تہا گریز اس مژۂ یار سے دل تا دم مرگ (ص ۱۳)

ع : میں سادہ دل ازردگی یار سے خوش ہوں (ص ۱۴)

ع : جو کہ کہایا خومدن بی منت کیموس تھا (ص ۱۴)

اور اِس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ تصحیح طلب مقامات، تصحیحات سے محروم ہیں اور اِس میں سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیش تر اغلاطِ طباعت کی تصحیح نہیں کی گئی۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے، اِس سے بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ (الف) اِس نسخے کی تصحیح مکمّل طور پر نہیں کی گئی۔ (ب) جو تصحیحات ملتی ہیں، اِن کے متعلّق یہ کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہ خطِ غالبؔ

ہیں۔ (ج) بعض تصحیحات کے متعلّق بہ آسانی یہ راے قائم کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی اور شخص سے تعلّق رکھتی ہیں۔

اِس کا امکان ہے کہ غالبؔ نے ''دورات دن کی محنت میں'' تصحیح کسی اور نسخے پر کی ہو، اور جب خط لکھنے بیٹھے ہوں تو بے خیالی میں (یا عالمِ سرخوشی میں) دیوان کا ایک دوسرا نسخہ اِن کے ہاتھ میں آگیا ہو، اور یہ سمجھ کر کہ یہ وہی نسخہ ہے جس کے صفحات پر تصحیح کی گئی ہے؛ مذکورہ خط اس نئے نسخے کے آخری صفحے کے حاشیے پر لکھ دیا ہو۔ یہ امکان کچھ بعید از قیاس نہیں۔ اِس میں تو شک نہیں کہ غالبؔ نے تصحیح کی ضرور تھی، کیوں کہ نسخۂ مطبعِ نظامی کے آخر میں ناشر نے بھی غالبؔ کے تصحیح کیے ہوئے نسخے کا ذکر کیا ہے۔ بعض مثالوں سے بھی اِس کی تصدیق ہوتی ہے، مثلاً نسخۂ احمدی میں ص ۲۹ پر ایک مصرع یوں چھپا ہوا ہے: ''گردش رنگ طرب سے ڈری''، نسخۂ نظامی میں یہ مصرع یوں ملتا ہے: ''گردش رنگ طرب سے ڈر ہی''، اور یہ لازماً نتیجۂ تصحیح ہے، ورنہ ''ڈری''، ''ڈرہی'' کیسے بن جاتا؛ مگر یہ کہنا کہ غالبؔ نے جس نسخے کی تصحیح کی تھی، وہ حیدرآباد کی آصفیہ لائبریری میں موجود ہے، درست نہیں۔ آصفیہ میں صرف وہ نسخہ موجود ہے جس کے آخری صفحے کے حاشیے پر غالبؔ کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط موجود ہے اور بس[2]۔ دورات دن کی محنت میں جس نسخے کی تصحیح کی جائے گی، اُس کا یہ حال نہیں ہوسکتا کہ بیش تر غلطیاں بجنسہٖ دعوتِ نظر دیتی رہیں۔ اور پھر یہ بھی ثابت کرنا پڑے گا کہ غالبؔ پنسل سے بھی لکھا کرتے تھے۔

غالبؔ نے مطبعِ احمدی کے چھپے ہوئے جس نسخے کی تصحیح کی تھی، وہ کہاں ہے؛ اِس کے متعلّق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اب تک تو یہی سمجھا جاتا رہا کہ وہ نسخہ حیدرآباد میں ہے۔ اور نسخۂ نظامی پریس کان پور کا زیادہ بھرم بھی اِسی لیے تھا کہ جس نسخے پر یہ مبنی ہے، وہ اصل نسخہ موجود ہے اور اس کے صفحات پر غالبؔ کے اپنے قلم سے تصحیحات ہیں۔ لیکن جن تفصیلات کو پیش کیا گیا ہے، اُن سے اِس کی تائید نہیں ہوتی کہ آصفیہ میں محفوظ نسخہ وہی ہے جس کے اوراق غالبؔ کی اصلاحوں سے مزیّن ہیں، یا ہونا چاہیے؛ اِس صورت میں یقیناً اِس کی ضرورت محسوس کی جائے گی کہ اِس سوال پر پھر سے غور کیا جائے۔

چوں کہ وہ نسخہ ہمارے سامنے نہیں جس کی غلطیوں کو غالبؔ نے ''دورات دن کی محنت میں'' درست کیا تھا، اِس لیے نسخۂ مطبعِ نظامی کے متعلّق یہ فرض کرلینا تقاضاے احتیاط کے بالکل خلاف ہوگا کہ اِس کا متن، حتماً غالبؔ کا آخری پسندیدہ متن ہے، یا یہ کہ مطبعِ احمدی کے چھپے ہوئے نسخے کی ساری

غلطیاں درست ہوگئی ہیں، اور سب سے زیادہ اہم بات یہ کہ احمدی اور نظامی نسخوں میں جہاں جہاں متن کا اختلاف ہے، وہاں نسخۂ نظامی کا متن لازماً صحیح ہے اور اِس لیے صحیح ہے کہ وہ لازماً غالبؔ کی تصحیح پر مبنی ہے۔ موجودہ صورت میں نسخۂ نظامی کے مقابلے میں، کلامِ غالبؔ کے اُن خطّی نسخوں کو اصل اہمیت حاصل رہے گی جو بہ خطِ غالبؔ ہوں یا غالبؔ کی نظر سے گزرے ہوں اور جن پر اُن کے قلم کی تصحیحات موجود ہوں، مثلاً نسخۂ شیرانی اور نسخہ ہاے رام پور۔ اِن نسخوں کو آج بھی دیکھا جاسکتا ہے اور اطمینان کیا جاسکتا ہے۔ کلامِ غالبؔ کے صحیح متن کی تیاری کے لیے یہ لازم ہوگا کہ اِن خطّی نسخوں سے استفادہ کیا جائے۔ اگر مطبعِ احمدی والا وہ نسخہ موجود ہوتا جس کے متعلّق خود غالبؔ نے یہ لکھا ہے کہ میں نے ''دو رات دن کی محنت میں'' اِس کی تصحیح کی ہے، تو یقیناً وہ نہایت درجہ اہم دستاویز کے برابر ہوتا اور کسی طرح کے شک کے بغیر، بہت سے مقامات پر متن کا تعیّن اُس سے کیا جاسکتا تھا۔ مطبعِ نظامی کان پور کے مطبوعہ نسخے کے متعلّق یہ طے کرلینا کہ یہ لفظ بہ لفظ اور حرف بہ حرف اسی طرح چھپا ہے جس طرح غالبؔ نے تصحیح کی تھی؛ محض فرض کرنے کے برابر ہے اور تدوین یا تحقیق کی بنیاد، مفروضات یا اس کی مرادف تعبیرات پر نہیں رکھی جاسکتی۔ غالبؔ نے کہاں کہاں اور کیا کیا تصحیح کی تھی، اُس کا حال معلوم نہیں، یہ بھی نہیں معلوم کہ کس قدر تصحیح کی گئی تھی، اور فی الوقت یہ معلوم کرنے کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آتی۔ اِس کی پابندی مطبعے میں کس حد تک ہوئی تھی، اِس کا حال بھی کم سے کم معلوم ہے۔ اور یہ محض قیاس آرائی نہیں، اِس کے ثبوت پیش کیے جاسکتے ہیں۔

میں ذیل میں کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں، اِن سے بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مطبعِ نظامی کان پور کے مطبوعہ نسخے کے متن میں متعدّد جگہ ایسی صورتیں پائی جاتی ہیں جن کے متعلّق قطعی طور پر کچھ کہنا یوں مشکل معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ اس کا متن، غالبؔ کے تصحیح کردہ نسخے کے عین مطابق ہے۔ وہ نسخہ تو فی الحال علم میں نہیں جس پر غالبؔ نے تصحیح کی تھی، پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ کون سا اختلاف، کاتب یا مطبعے کے مصحّح کی ذمّے داری ہے اور کون سا اختلاف، غالبؔ کی تصحیح پر مبنی ہے۔ لیکن اِس سے بڑھ کر یہ نہایت اہم بات کہ کیا اُس وقت غالبؔ نے بعض مقامات پر ترمیم تو نہیں کی تھی؟ مصنّفین کی یہ روش ہوتی ہی ہے اور غالبؔ بھی اِس روش سے بے گانہ یا بیزار نہیں تھے۔ یعنی مطبعِ نظامی کے نسخے میں جن مقامات پر اختلافِ متن پایا جاتا ہے اور اس کو غلطیِ کتابت سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ غلطیِ

کتابت ہی ہے، ترمیم نہیں؟ یہ عرض کروں کہ متعدّد مقامات ایسے ہیں جہاں پر قطعیّت کے ساتھ یہ کہا نہیں جاسکتا کہ یہاں لازماً غلطیِ کتابت ہے۔

(۱) نسخۂ نظامی میں ص ۱۱ پر ایک شعر یوں ملتا ہے:

نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

مالک رام صاحب نے اپنے نسخے میں (اور یہاں وہ نسخہ مراد ہے جو صد سالہ یادگارِ غالب کمیٹی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ آیندہ اِس کو ''صدی اڈیشن'' کہا جائے گا) اِس شعر کو یوں لکھا ہے:

نام کا میرے ہے وہ دُکھ کہ، کسی کو نہ ملا
کام کا میرے، ہے وہ فتنہ کہ، برپا نہ ہوا
(ص ۲۷)

چوں کہ مرتّب نے اِس کا اہتمام کیا ہے کہ اختلافِ نسخ کو (غالباً غیر ضروری چیز سمجھ کر) درج نہ کیا جائے، اِس لیے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مرتّب نے دونوں مصرعوں میں ''جو'' کو ''وہ'' سے کیوں بدل دیا؟ کیا اُن کی راے میں ''جو'' غلط الکاتب ہے؟ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا۔ شعر ''جو'' کے ساتھ بھی لفظاً اور معناً بالکل درست قرار پائے گا۔ نسخۂ عرشی کے ضمیمۂ اختلافِ نسخ سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوانِ غالبؔ کے پانچویں اڈیشن (نسخۂ شیونرائن) میں بھی اِس شعر میں دونوں جگہ ''جو'' ہے — نسخۂ عرشی میں دونوں جگہ ''وہ'' ملتا ہے۔ عرشیؔ صاحب نے تو متعدّد نسخوں کی مدد سے اپنا نسخہ مرتّب کیا ہے، اِس لیے ترجیح کا جواز ظاہر ہے، مگر مالک رام صاحب نے تو دوسرے نسخوں کے لیے یہ لکھا ہے کہ نسخۂ مطبعِ نظامی سے پہلے کے ''اڈیشنوں کو ہم نہ صرف متن میں استعمال نہیں کر سکتے، بل کہ وہ شاید اختلافِ نسخ کے تحت بھی نہیں آئیں گے''۔ سوال یہ ہے کہ پھر اِس شعر میں ''جو'' کی جگہ ''وہ'' نے کیسے لے لی؟ مرتّب نے اپنے نسخے کے دو صفحی دیباچے میں یہ لکھا ہے کہ صرف اغلاطِ کتابت کی تصحیح کی گئی ہے، گویا مرتّب نے ''جو'' کو غلط الکاتب مانا ہے، مگر اس کا ثبوت کیا ہے کہ یہ سہوِ کاتب ہے؟ اِس کو کسی ثبوت کے بغیر غلط الکاتب تو ہرگز ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ یہ تو واضح طور پر اختلافِ متن ہے اور اِس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ نسخۂ شیونرائن میں بھی یہی ہے۔ اِس کے علاوہ جب مرتّب یہ کہتے ہیں کہ ''مطبعِ نظامی کے نسخے میں غالبؔ کا سب سے آخری صحیح

کردہ متن ہے،" تو پھر یہ کیوں نہیں مانا جاسکتا کہ غالبؔ نے "جو" کو مرجّح سمجھا ہے اور اِس شعر کا متن غالبؔ کا سب سے آخری تصحیح کردہ متن ہے۔ اِس کا کیا ثبوت یا قرینہ ہے کہ غالبؔ نے یہاں ترمیم نہیں کی تھی۔ وہ نسخہ تو موجود ہی نہیں جس پر غالبؔ کے قلم کی تصحیحات کو ہونا چاہیے تھا؟ اِس کی عدمِ موجودگی میں، یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اِس شعر میں ترمیم نہیں کی گئی تھی، یا یہ کہ ترمیم کی گئی تھی۔ لازماً دوسرے نسخوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، جن کے متعلق مرتّب یہ فتوا دے چکے ہیں کہ نسخۂ نظامی کے ہوتے ہوئے اُن کو متن تو کیا، اختلافِ نسخ کے لیے بھی استعمال نہیں کیا جاسکتا ہے۔

(۲) "رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھکے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں" (نسخۂ نظامی، ص ۳۶)

نسخۂ صدی اڈیشن میں، پہلے مصرعے میں "تھکے" کی جگہ "تھمے" ملتا ہے: "رو میں ہے رخشِ عمر؛ کہاں، دیکھیے، تھمے" (ص ۸۰)۔ یہاں بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ "تھکے" لازماً غلطیِ کتابت ہے۔ اِس کو بھی اختلافِ متن کے ذیل میں رکھا جاسکتا ہے۔ یہاں بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرتّب نے "تھمے" کو کس بنا پر ترجیح دی؟ کیا وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ غالبؔ نے نسخۂ احمدی کی تصحیح کرتے وقت یہاں ترمیم نہیں کی تھی؟ اور اِس کا ثبوت کیا ہوگا؟ نسخۂ عرشی کے اختلافِ نسخ سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف نسخۂ نظامی میں "تھکے" ملتا ہے۔ یہ غالبؔ کی آخری اصلاح بھی ہوسکتی ہے اور اِس کو نہ ماننے کے لیے کیا دلیل دی جائے گی؟ اِس کا بھی تو امکان ہے کہ غالبؔ نے "تھمے" کو "تھکے" سے بدل دیا ہو۔ بہ ہرصورت یہ ماننے کے لیے کہ اِس مصرعے میں "تھکے" سہوِ کاتب ہے؛ مرتّب کے قائم کردہ اصول کے تحت، کوئی دلیل موجود نہیں۔

(۳) "کیا وہ بھی بیگنہ، کش و حق ناسپاس ہیں
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو" (نسخۂ نظامی، ص ۴۶)

صدی اڈیشن میں بھی یہ شعر اِسی طرح ہے۔ نسخۂ عرشی کے مصرعِ اوّل میں "حق ناشناس" کو جگہ دی گئی ہے کہ اس کے اختلافِ نسخ سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف نسخۂ نظامی میں "حق ناسپاس" ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ باقی سب نسخوں میں "حق ناشناس" ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہاں پر مرتّب نے، پچھلے دو اشعار کے برخلاف، اِس متن کو کس بنیاد پر قبول کیا؟ کیا وہ یہ مانتے ہیں کہ اِس مصرعے میں، غالبؔ کی اصلاح

ہے؟ پھر یہ بات ایسے ہی اور مقامات پر کیوں نہیں مانی جاسکتی؟ کیا مرتّب کے پاس اِس کا کوئی ثبوت موجود ہے کہ اوپر کے دوشعروں میں تو غلطیِ کتابت تھی، اور اِس شعر میں اختلافِ متن ہے، اور یہ کہ نسخۂ احمدی کی اصلاح کے وقت، غالبؔ نے اِس متن کو مرجّح قرار دیا تھا۔ اگر یہ خیال ہے تو اِس کی بنیاد کیا ہے؟ کیا مرتّب نے نسخۂ احمدی پر غالبؔ کے قلم سے اُس اصلاح کو دیکھا ہے؟ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ کیا اُنھوں نے غالبؔ کا تصحیح کردہ نسخۂ مطبعِ احمدی دیکھا ہے؟ اگر دیکھا ہے تو وہ نسخہ کہاں ہے؟ اِس کے بغیر اِس کا جواز نکل ہی نہیں سکتا کہ اِس شعر میں ''حق ناشناس'' کی جگہ ''حق ناسپاس'' کو مرجّح سمجھا جائے۔

(۴) ''کبھی شکایت رنجِ گراں نشیں کیجے

کہیں حکایتِ صبر گریز پا کہیے'' (نسخۂ نظامی، ص۷۵)

نسخۂ صدی اڈیشن میں، دوسرے مصرعے میں ''کہیں'' کی جگہ ''کبھی'' ملتا ہے ع: ''کبھی حکایتِ صبر گریز پا کہیے'' (ص۱۶۴)۔ نسخۂ عرشی میں بھی اِس جگہ ''کبھی'' ہے، اور اِس میں اختلافِ نسخ کے تحت ''کہیں'' کو سہوِ کاتب بتایا گیا ہے۔ عرشی صاحب نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اُس کے تحت تو ''کبھی'' کو مرجّح قرار دیے جانے کا جواز نکل سکتا ہے، مگر مرتّب یہ کس طرح فرض کر سکتے ہیں کہ یہ واقعتاً غلط الکاتب ہے۔ آخر کس بنیاد پر؟ یہ کیوں نہ مان لیا جائے کہ نسخۂ احمدی کی اصلاح کے دوران، غالبؔ نے ایک جگہ ''کبھی'' کو برقرار رکھا اور دوسری جگہ ''کہیں'' بنا دیا، اور نسخۂ مطبعِ نظامی میں اِسی اصلاح کی پابندی کی گئی ہے۔ اِس کو نہ ماننے کے لیے کوئی دلیل تو دینا ہی ہوگی، یا کسی قرینے کا تعیّن تو کرنا ہی ہوگا، وہ کیا ہے؟ سوال پھر وہی پیدا ہوتا ہے کہ کیا مرتّب نے غالبؔ کا تصحیح کردہ نسخہ دیکھا ہے؟ پھر جب وہ یہ لکھ چکے کہ نسخۂ نظامی، کلامِ غالبؔ کا آخری مستند اڈیشن ہے، تو پھر یہاں پر نسخۂ نظامی کے متن کو نہ ماننے کی وجہ کیا ہے؟ وجہ ہی نہیں، جواز بھی!

ہاں، کتابت کی غلطی حتمی طور پر اُس کو کہتے ہیں جس سے کلام لفظاً یا معناً صریحی طور پر غلط ہو جائے یا پھر یہ کہ دوسرے نسخے سے تقابل کے بعد یہ ثابت کیا جائے کہ لفظ یا عبارت بدل گئی ہے۔ یہاں پر مصرع ''کہیں'' سے بھی لفظاً اور معناً دونوں طرح صحیح اور بامعنی رہتا ہے۔ اب رہی دوسرے نسخے سے تقابل کی بات، سو وہ نسخہ (یعنی غالبؔ کا تصحیح کردہ نسخہ) ہے کہاں؟ اُس نسخے سے تقابل کے بغیر، اِس کو غلط کیسے کہا جائے گا؟ اِس کے علاوہ یہ ماننے کے لیے بھی دلیل لانا ہوگی کہ یہاں پر غالبؔ نے ترمیم نہیں کی تھی۔

(۵) ''رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے'' (نسخۂ نظامی، ص۷۵)

نسخۂ صدی اڈیشن میں دوسرے مصرعے میں ''اتنے'' کی جگہ ''ایسے'' ہے، یعنی ''دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے'' (ص۱۶۴)۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مرتّب نے یہاں ''ایسے'' کو کس بنا پر مرجّح قرار دیا ہے اور داخلِ متن کیا ہے۔ کیا وہ ''اتنے'' کو سہوِ کاتب سمجھتے ہیں؟ نسخۂ عرشی میں بھی، نسخۂ نظامی کی طرح ''اتنے'' ہے، اس میں ''ایسے'' کو اختلافِ نسخ کے ذیل میں جگہ دی گئی ہے۔ نسخۂ شیرانی کا عکس پیشِ نظر ہے، اس میں بھی نسخۂ نظامی کے مطابق ''اتنے'' ہی ہے (ورق۹۴)۔ کیا مرتّب کا خیال یہ ہے کہ غالبؔ نے آخر میں ''اتنے'' سے اسے بدل دیا تھا؟ اگر ایسا ہے تو اِس کی دلیل کیا ہے؟

(۶) ''دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ امر کی زنبیل
میرے ایہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل'' (نسخۂ نظامی، ص۹۴،۹۵)

نسخۂ صدی اڈیشن میں پہلا شعر تو نسخۂ نظامی کے مطابق ہے، یعنی دوسرے مصرعے میں ''امر کی زنبیل'' ہے (ص۲۰۰)، البتہ دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں ''ایہام'' کی جگہ ''ابہام'' ملتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اِس شعر میں مرتّب نے ''ایہام'' کو سہوِ کاتب مانا ہے اور اِس کی جگہ ''ابہام'' کو صحیح سمجھا ہے۔ نسخۂ عرشی میں بھی ''ایہام'' کو سہوِ کاتب لکھا گیا ہے۔ یہاں پر مرتّب نے دوسرے نسخوں کے متن کو درست سمجھا ہے، سوال یہ ہے کہ پھر پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں ''امر'' کو سہوِ کاتب کیوں نہیں سمجھا گیا۔ نسخۂ عرشی کے اختلافِ نسخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اور نسخوں میں ''عُمَر'' ہی ہے، اور اِس میں ''اَمَر'' کو بھی، ''ایہام'' کی طرح، سہوِ کاتب بتایا گیا ہے۔ یا مرتّب کا خیال یہ ہے کہ نسخۂ احمدی کی تصحیح کرتے ہوئے، غالبؔ نے یہاں ''امر'' بنا دیا تھا؟ اگر ایسا ہے تو اِس کا ثبوت کیا ہے؟ اگر ''ایہام'' سہوِ کاتب ہو سکتا ہے تو ''اَمَر'' تو بہ درجۂ اولا سہوِ کاتب قرار دیے جانے کا مستحق ہے۔ چوں کہ اِس کے خلاف کیا گیا ہے، اِس لیے قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوگا کہ مرتّب کے سامنے کوئی ایسا نسخہ ہوگا جس پر غالبؔ کے قلم سے ''امر'' لکھا ہوا ہوگا۔ وہ نسخہ کون سا ہے اور کہاں ہے؟ آصفیہ لائبریری میں تو وہ نسخہ موجود نہیں[۳]

(۷) دکھ جی کے پسند ہوگیا ہے غالبؔ
دل رک رک کر بند ہوگیا ہے غالبؔ
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہوگیا ہے غالبؔ (نسخۂ نظامی، ص۱۰۲)

صدی اڈیشن میں دوسرا مصرع اِس طرح لکھا گیا ہے: ''دل رُک کر بند ہوگیا ہے غالبؔ'' (ص۲۱۲)۔ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ غالبؔ کے اصل مصرعے کے متعلق یہ کہا جاچکا ہے کہ یہ ساقط الوزن ہے۔ نسخۂ عرشی کے اختلافِ نسخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کلامِ غالبؔ کے سبھی مجموعوں میں ''رک رک کر'' ہے اور نسخۂ نظامی میں بھی اِسی طرح ہے۔ اِس نسخۂ صدی اڈیشن میں تو حواشی موجود نہیں، البتہ آزاد کتاب گھر دہلی سے، مالک رام صاحب ہی کا مرتّب کیا ہوا نسخہ شائع ہوا ہے۔ اِس میں حواشی ہیں (ناتمام سہی)؛ اِس نسخے میں مرتّب نے زیرِ بحث مصرعے پر حاشیہ لکھا ہے: ''اصل میں ''رک'' کی تکرار ہے، جو ظاہراً کتابت کی غلطی ہے'' (ص۲۷۸)۔ لیکن مرتّب کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ کتابت کی غلطی ہے، جب کہ سبھی خطّی و مطبوعہ نسخوں میں ''رک رک کر'' ملتا ہے۔ یہ متعیّن کرنے کے لیے کہ نسخۂ نظامی میں ''رک رک کر'' کتابت کی غلطی ہے، کلامِ غالبؔ کا کوئی ایسا مجموعہ تلاش کرنا پڑے گا جس میں صرف ''رک'' کر ہو، اور ایسے کسی مجموعے کا اب تک کسی کو علم نہیں۔ نسخۂ نظامی میں ''رک'' کی تکرار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ کے صحیح کیے ہوئے نسخۂ مطبعِ احمدی میں بھی ''رک رک کر'' ہوگا۔ اگر مرتّب اِس کو تسلیم نہیں کرتے، اُس صورت میں اُن کو اِس کا ثبوت پیش کرنا ہوگا کہ یہ غالبؔ کا سہو نہیں، بل کہ کاتب کی غلط نگاری ہے۔ مرتّب نے چوں کہ اپنے نسخے میں حواشی، اختلافِ نسخ اور مقدّمے کو شامل نہیں کیا، اِس لیے وہ ایسے نہایت ضروری امور پر بحث کرنے سے محفوظ رہے ہیں۔ اِس سے اُن کو آسانی تو بہت حاصل ہوگئی، مگر دوسروں کے لیے اُلجھنوں کا سرمایہ فراہم ہوگیا اور تدوین کے معیار و انداز اور تحقیق کے مسلّمہ اصولوں پر بھی حرف آگیا۔

دیوانِ غالبؔ کا یہ نسخہ جس کو ''صدی اڈیشن'' کہا گیا ہے، ''صد سالہ یادگارِ غالب کمیٹی'' کی طرف سے، جشنِ صد سالہ یادگار کے موقعے پر شائع کیا گیا تھا۔ خیال یہ تھا کہ اِس یادگار موقعے پر، غالبؔ کے کلامِ نظم و نثر کے، تدوین کے لحاظ سے، اعلا درجے کے اڈیشن بھی شائع کیے جائیں گے، مگر یہ توقع غالبِؔ مرحوم کی ''حسرتِ تعمیر'' بن کر رہ گئی۔ یہ اردو دیوان، جس کو صد سالہ یادگار کمیٹی نے شائع کیا ہے۔

۱۸۶۲ء کے مطبعِ نظامی کان پور کے اُس اڈیشن کی تکرار ہے جو اِس سے پہلے دو بار، دہلی ہی سے شائع ہو چکا تھا۔ اِن سب اشاعتوں کے مرتّب مالک رام صاحب ہیں۔ موصوف نے یہ کیا ہے کہ پہلے تو نسخۂ نظامی کو ایک مقدّمے، حواشی اور اضافۂ کلام کے ساتھ دو بار شائع کرایا اور پھر تیسری بار اِسی اشاعت کو اپنے مقدّمے، حواشی اور اس اضافۂ کلام سے محروم یا معرّا کر کے اور ان سب کی جگہ دو صفحے کا ''تعارف'' شامل کر کے، صد سالہ یادگارِ غالب کمیٹی کے حوالے کر دیا۔ یہ ہے غالب کے اردو دیوان کا وہ نسخہ جس کو ہندستان کی صد سالہ یادگارِ غالب کمیٹی نے، صد سالہ یادگار کے اہم موقعے پر شائع کیا ہے۔

یہ بات بجا طور پر پوچھی جا سکتی ہے کہ اِس اہم موقعے پر اِس اشاعت کا جواز کیا ہے۔ اگر مقصد یہ تھا کہ کان پور کے نسخۂ نظامی کو، جو مرتّب کی نظر میں کلامِ غالب کا مستند ترین اڈیشن ہے، اور جواب نہیں ملتا؛ عام کیا جائے کہ یہ علمی، ادبی اور تحقیقی فریضہ تو دو بار اِس سے پہلے ادا کیا جا چکا تھا۔ ایسے یادگار موقعے پر تو بجا طور پر توقّع کی جانا چاہیے تھی کہ غالب کے اُردو کلام کا ایک مکمّل مجموعہ پیش کیا جائے گا جو مفصّل مقدّمے، حواشی، اختلافِ نسخ اور دوسرے ضروری مباحث کا گنجینہ ہوگا، اور صحیح معنی میں یہ یادگار کہے جانے کا مستحق ہوگا۔ مگر مکمّل مجموعہ مرتّب کرنے کے بجائے، کیا یہ گیا کہ پہلی دو اشاعتوں میں اضافۂ کلام مقدّمے، اور حواشی کے واسطے سے تدوین کا (جیسا بھی سہی) ایک انداز سا آ گیا ہے؛ اِس سے قطعِ تعلّق کو ضروری سمجھا گیا ہے۔ اِس صدی اڈیشن کو، اِن سب ضروری اجزا سے معرّا کر کے معرضِ اشاعت میں لایا گیا۔ اِس نسخے میں نہ تو مفصّل مقدّمہ ہے جس میں اِس پر بحث کی جاتی کہ ترتیبِ متن، اضافۂ کلام، اختلافاتِ قرأت وغیرہ کے سلسلے میں کن اصولوں کو مدِّ نظر رکھا گیا ہے۔ اِسی طرح نہ حواشی ہیں نہ اختلافِ نسخ، جن کی مدد سے یہ معلوم ہو سکے کہ جن مقامات پر دوسرے نسخوں میں اختلاف پائے جاتے ہیں، اُن کے متعلّق مرتّب کی رائے کیا ہے۔ یہی نہیں، خود نسخۂ نظامی میں بہت سے مقامات پر، بہ خیالِ مرتّب، کتابت کی اہم غلطیاں پائی جاتی ہیں اور ایسے مقامات پر مرتّب نے نسخۂ نظامی کے متن کو قبول نہیں کیا؛ مگر یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ اُنھوں نے جس متن کو اختیار کیا ہے، وہ کس نسخے سے ماخوذ ہے اور وجہِ ترجیح کیا ہے۔ اوپر جو مثالیں پیش کی گئی ہیں، ان سے اِس سلسلے میں صورتِ حال واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ بیسیوں مقامات پر اِس طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں، اور بہ قولِ شاعر: ''مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہے جواب''۔

اِس میں شک نہیں کہ اگر اِس قبیل کی اہم کتابوں میں مفصّل مقدّمہ نہ ہو، حواشی نہ ہوں، اختلافِ نسخ کا حصّہ نہ ہو اور اِس طرح کے اور صبر آزما اور دقّت طلب مباحث بھی نہ ہوں؛ تو کام کو نپٹانے میں آسانی بہت ہوتی ہے اور کام جلدی بھی ہو جاتا ہے، اور سب سے بڑھ کر فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی بہت سی ذمّے داریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ گویا ایک جواب میں سارے گلے تمام ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ اندازِ تحقیق یا تدوین کو راس نہیں آ سکتا، کیوں کہ اِس طرح تدوین کا جو معیار سامنے آتا ہے، وہ نہ صرف یہ کہ ناتمامیوں سے گراں بار ہوتا ہے، بل کہ دوسروں کے لیے غلط تقلید کا نمونہ بھی بن سکتا ہے اور اُس کتاب کی تو بُری گت بن ہی جاتی ہے۔

مرتّب نے یہ دعوا کیا ہے کہ: ''مطبعِ نظامی کے نسخے میں غالبؔ کا سب سے آخری صحیح کردہ متن ہے''، اور مطبعِ نظامی کے اِسی نسخے کے لیے وہ اِس سے پہلے یہ بھی لکھ چکے ہیں: ''اب اِس سے پہلے کے اڈیشنوں کو ہم نہ صرف متن میں استعمال نہیں کر سکتے، بل کہ وہ شاید اختلافِ نسخ کے تحت بھی نہیں آئیں گے''۔ اِس طرح کے دعوے، جو قطعیّت سے اِس حد تک محصور ہوں، کلامِ غالبؔ کے سلسلے میں احتیاط کے قطعاً منافی ہیں۔ اوپر جو مثالیں پیش کی گئی ہیں، اُن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرتّب نے جگہ جگہ نسخۂ نظامی کے مقابلے میں، دوسرے نسخوں کے متن کو مرجّح سمجھا ہے؛ اور صرف یہی ایک بات، اُن کے اِس غیر محتاط دعوے کی کم صحتی کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

غالبؔ کے کلام کے ایسے خطّی نسخوں کے علاوہ جن پر غالبؔ کے قلم کی تصحیحات موجود ہیں، غالبؔ کی اور تحریریں خصوصاً مکاتیب خاصی بڑی تعداد میں موجود ہیں، اور یہ سب تحریریں دستیاب بھی ہو سکتی ہیں۔ بہت سے خطوں وغیرہ کے عکس شائع ہو چکے ہیں۔ پرتھوی چند صاحب کی مرتّب کی ہوئی کتاب مرقّعِ غالب اِس سلسلے میں خاص حیثیت رکھتی ہے جس میں غالبؔ کی بہت سی تحریروں کے عکس یک جا کر دیے گئے ہیں۔ اِن تحریروں کی مدد سے املا کے سلسلے میں بہت سی اہم معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ عام لفظوں کو چھوڑیے، مگر بہت سے خاص لفظ ایسے ہیں جن سے متعلق یہ علم ضروری ہے کہ ان کے املا کے سلسلے میں غالبؔ کی رائے یا اُن کا طرزِ عمل کیا تھا۔ کلامِ غالبؔ کی تدوین کے دوران بہت سے مقامات پر ناقل، کاتب اور مصنّف کے املا میں امتیاز کو ملحوظ رکھنا ضروری رکھنا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک املا کے سلسلے میں ضروری تفصیلات کو منضبط نہیں کیا جائے گا اور تعیّنات کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا، اُس

وقت تک تدوین کا حق ادا ہی نہیں ہوسکتا، بل کہ بہت سے مقامات پر غلط نگاری کا ارتکاب ہوگا اور اِس طرح غلط انگاری کی گویا تبلیغ کی جائے۔ مگر یہ سب اہتمام اُسی وقت ضروری قرار پائے گا اور اِس کی پابندی کی ضرورت بھی اُسی وقت محسوس کی جائے گی جب مقدّمے، حواشی اور اختلافِ نسخ جیسے اہم اجزا کو ضروری قرار دیا جائے۔ تدوین کا معیار اور اُس کی حرمت اگر پیشِ نظر ہو تو یہ اہتمام کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن اِن سب سے اگر قطعِ تعلّق کرلیا جائے تو ظاہر ہے کہ کوئی ذمّے داری عائد نہیں ہوگی۔

اِس صدی اڈیشن میں املا کے لحاظ سے یہی صورت پائی جاتی ہے۔ مرتّب نے غضب یہ کیا ہے کہ بہت سے الفاظ کے ذیل میں غالبؔ کے املا کے مقابلے میں نسخۂ نظامی کے کاتب کے املا کو مرجح قرار دیا ہے اور اِس میں اِس حد تک اہتمام کو ملحوظ رکھا ہے کہ اگر اِس نسخے کے کاتب نے ایک ہی لفظ کو دو طرح لکھا ہے تو مرتّب نے بھی حرف بہ حرف اُس کی نقل کی ہے۔ اِس طرزِ عمل سے بیسیوں مقامات پر لفظوں کی صورتیں صحیح معنی میں مسخ ہوگئی ہیں اور جگہ جگہ صریحاً فرمودۂ غالبؔ کے خلاف نقش بنے ہیں۔ اِس لحاظ سے دیوانِ غالبؔ کا یہ نسخہ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اِس مثال کی ضرورت ہو کہ املا کے سلسلے میں کسی مصنّف کے مختارات پر پریس کے کاتب کے طرزِ نگارش کو افضلیت حاصل ہونا چاہیے تو اِس کے لیے اِس کتاب سے بہتر مثال شاید ہی مل سکے۔

اگر کوئی کتاب کسی تجارتی ادارے کی طرف سے محدود مقاصد کے تحت شائع ہو، اُس صورت میں اِس کو اِس نظر سے نہیں دیکھا جائے گا کہ تدوین کے اعلا آداب کی کس قدر پابندی کی گئی ہے۔ لیکن کوئی کتاب اگر کسی ایسے ادارے کی طرف سے، ایسے موقعے پر، اور اِس قدر معروف شخص کے نام کے ساتھ شائع ہو، تو یقیناً اِس کی امید کی جائے گی کہ وہ کتاب تدوین کے مسلّمہ آداب کے ساتھ مرتّب کی گئی ہوگی۔ مجھے واقعتاً تعجب ہے کہ محترم مرتّب نے کس طرح گوارا کیا اِس صورتِ حال کو! اور وہ کیسے راضی کیا اپنی طبیعت کو کہ غالبؔ جیسے شاعر کے کلام کو، ایسے اچھے موقعے پر، اِس طرح پیش کیا جائے!! آخر ہم نوآمدہ لوگوں کے لیے تدوین و تحقیق کا کون سا معیار اور انداز پیش کرنا چاہتے ہیں؟ یہ ساری مصیبت پیدا کی ہوئی ہے عجلت اور آسان پسندی کے اُس انداز کی، جس کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ حواشی اور اختلافِ نسخ کے وجود سے بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ مرتّب کا قلم رُک رُک کر چلتا ہے اور کئی صورتوں میں سے ایک صورت کے انتخاب میں بار بار غور کرنا پڑتا ہے اور اِس کے علاوہ، اہم بات یہ ہے کہ ترجیح کا جواز بھی پیش کرنا پڑتا

ہے۔ مقدّمہ نہ ہو، حواشی نہ ہوں اور اختلافِ نسخ کا حصّہ بھی نہ ہو؛ تو اِس سے یہ جھنجھٹ تو مٹ جاتی ہے، مگر اور بہت سی خامیاں راہ پا جاتی ہیں۔ ذیل میں جو کچھ لکھا جائے گا، اُس سے اِس کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

لفظ ''خورشید'' کو غالبؔ واوؔ کے بغیر (خرشید) لکھا کرتے تھے اور اِس کے مخفف کو مع واوؔ (خور)۔ اُنھوں نے ایک خط میں تفصیل کے ساتھ اپنے مسلک کا ذکر کیا ہے، اُس خط کا ضروری حصّہ پیش کیا جاتا ہے:

> ''وہ پارسیِ قدیم جو ہوشنگ و جمشید و کیخسرو کے عہد میں مروّج تھی، اِس میں ''خُر'' بہ خاے مضموم، ''نورِ قاہر'' کو کہتے ہیں۔ اور چوں کہ پارسیوں کی دید و دانست میں بعد خدا کے آفتاب سے زیادہ کوئی بزرگ نہیں ہے، اِس واسطے آفتاب کو ''خُر'' لکھا اور ''شید'' کا لفظ بڑھا دیا۔ ''شید'' بہ شینِ مکسور و یاے معروف بروزنِ ''عید''، ''روشنی'' کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ اس ''نورِ قاہرِ ایزدی'' کی روشنی ہے... جب عرب و عجم مل گئے تو اکابرِ عرب نے، کہ وہ منبعِ علوم ہوئے، واسطے دفعِ التباس کے ''خُر'' میں واوؔ معدولہ بڑھا کر ''خور'' لکھنا شروع کیا... فقیر ''خُر'' جہاں بے اضافۂ لفظِ ''شید'' لکھتا ہے، موافقِ قاعدۂ عظماے عرب بہ واوِ معدولہ لکھتا ہے، یعنی ''خور''۔ اور جہاں بہ اضافۂ لفظِ ''شید'' لکھتا ہے، وہاں بہ پیروِی بزرگانِ پارسی سر بہ سر لفظ ''خور'' کو بے واوؔ لکھتا ہے، یعنی ''خرشید''۔

(بہ نام میر مہدی مجروحؔ، خطوطِ غالبؔ، مرتّبہٗ منشی مہیش پرشاد مرحوم، ص ۲۸۸)

یہاں غالبؔ کے استدلال سے بحث نہیں، بحث اِس سے ہے کہ غالبؔ خود ''خرشید'' اور ''خور'' لکھا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اِس صراحت کے بعد کلامِ غالبؔ میں اِس لفظ کا املا لازماً ''خرشید'' مانا جائے گا۔ روشِ عام کے مطابق، مطبعِ نظامی کے کاتب نے بھی اِس کو ہر جگہ ''خورشید'' لکھا ہے اور مرتّب نے اپنے نسخے میں، کاتب کی اِس روش کو فرمودۂ غالبؔ پر ترجیح کا مستحق قرار دیا ہے اور اِس میں ہر جگہ ''خورشید'' نظر آتا ہے۔ بعض مثالیں:

ع : کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا (ص ۱٦)

ع : ذرّہ ذرّہ، روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا (ص۲۱)

ع : خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا (ص۳۸)

ع : لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا (ص۵۶)

ع : ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں (ص۷۷)

یاے معروف و مجہول کی کتابت میں اُس زمانے میں کچھ امتیاز ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا اور یہ عام روش تھی، اور اِس میں خطّی اور مطبوعہ عبارتیں برابر تھیں۔ اِسی روش کے مطابق، نسخۂ نظامی میں بھی یاے معروف و مجہول کی کتابت میں امتیاز نہیں پایا جاتا۔ عام لفظوں میں تو کچھ زیادہ پریشانی نہیں ہوتی، مگر جن لفظوں میں تذکیر و تانیث کا جھگڑا ہوتا ہے، اُن میں احتیاط اور دیدہ وری کا امتحان ہوتا ہے۔ مرتّب نے ایسے مقامات پر بھی، تحقیق کے پھیر میں پڑنے کے بجاے، کاتب کی صورت نگاری پر اعتماد کیا ہے اور نقل مطابقِ اصل کی روایت کو برقرار رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے، اور ہونا ہی چاہیے تھا، کہ بات کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ دو تین مثالوں سے اِس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

لفظِ ''رہ گذر'' تذکیر و تانیث کے لحاظ سے، مختلف فیہ الفاظ کے ذیل میں آتا ہے۔ تفصیل نور اللّغات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ نسخۂ نظامی میں درجِ ذیل شعر میں ''تری رہگذر'' چھپا ہوا ہے:

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
ایکاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں (ص۳۷)

مرتّب نے بھی ''تری'' لکھا ہے اور اِس طرح یہ لفظ موٴنث متعیّن ہوتا ہے، حالاں کہ ضروری یہ تھا کہ اِس مختلف فیہ، لفظ کے سلسلے میں یہ معلوم کیا جاتا کہ کیا غالبؔ نے کہیں اس لفظ کو اِس طرح استعمال کیا ہے کہ ان کے کلام کی حد تک، قطعی طور پر ان کی پسندیدگی کا علم ہو سکے۔ مرتّب اگر ذرا سی توجّہ کرتے تو اُن کو بہ آسانی معلوم ہو سکتا تھا کہ غالبؔ نے ایک جگہ اِس لفظ کو اِس طرح نظم کیا ہے کہ قطعیّت کے ساتھ یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ اِس لفظ کو مذکّر مانتے تھے۔ وہ شعر یہ ہے:

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہگزر یاد آیا (نسخۂ عرشی، ص۱۵۲)

اور اِس شعر کے ہوتے ہوئے، کلامِ غالبؔ میں ہر جگہ اِس لفظ کو لازماً بہ تذکیر متعیّن کیا جائے گا۔

لفظِ ''جیب'' بہ فتحِ اوّل، بالاتّفاق مذکّر ہے (فرہنگِ آصفیہ، نور اللّغات) اور ''جیب'' بہ کسرِ اوّل، اِس کی مہنّد صورت ہے اور یہ مونّث ہے (نور اللّغات)۔ ''جیبِ سحر'' یا ''جیب و گریباں'' میں اوّل الذکر لفظ ہے (جَیب) اور ''جِیب'' اِس سے مختلف لفظ ہے، جو مثلاً ''جیب کترا'' میں آتا ہے۔ ''جِیب'' کٹے گی اور ''جَیب'' ادھڑے گا اور رفو ہوگا۔ مرتّب نے اِس لفظ کے ذیل میں بھی تذکیر و تانیث کی صحّت کو نظر انداز کیا ہے۔ صدی ایشن میں یہ دو شعر اِس طرح ملتے ہیں:

دیوانگی سے، دوش پہ زنّار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں (ص۹۱)

چپک رہا ہے بدن پر، لہو سے، پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے (ص۱۴۳)

دونوں جگہ، ''ہمارے جیب'' کا محل ہے، کیوں کہ دونوں جگہ، ''جَیب'' ہے، ''جِیب'' نہیں۔ نسخۂ عرشی میں صحیح طور پر دونوں شعروں میں ''ہمارے جیب'' ملتا ہے۔ مرتّب نے اِن لفظوں کے امتیاز اور اِن سے متعلق تذکیر و تانیث پر غور کرنے کے بجائے، نسخۂ نظامی کے کاتب کے املا پر بھروسا کیا ہے۔ چوں کہ نسخۂ نظامی میں دونوں شعروں میں ''ہماری جیب'' ہے، اِس لیے مرتّب نے بھی صورت نگاری کا حق ادا کرنا ضروری سمجھا ہے۔ ہاں عندلیبؔ شادانی مرحوم نے ایک مضمون میں اِن دونوں لفظوں پر مفصّل بحث کی ہے۔

لفظِ ''مانند'' مذکّر ہے، اور یہ کوئی اختلافی مسئلہ نہیں، (تفصیل کے لیے دیکھیے نور اللّغات)۔ مرتّب نے ''جیب'' اور ''رہ گذر'' کی طرح، اِس لفظ کی تذکیر کو بھی تانیث سے بدل دیا ہے۔ صدی اڈیشن میں دو شعر اِس طرح ملتے ہیں:

دل مرا، سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا (ص۱۳)

چاک کی خواہش، اگر وحشت بہ عریانی کرے
صبح کی مانند، زخمِ دل گریبانی کرے (ص۱۵۱)

دونوں میں ''کے مانند'' ہونا چاہیے تھا۔ نسخۂ عرشی میں دونوں جگہ، صحیح طور پر ''کے مانند'' ہے۔ بات وہی ہے کہ نسخۂ نظامی میں اِن دونوں شعروں میں کاتب نے ''کی مانند'' لکھا ہے (ص۴، ص۶۹)؛ اب

مرتّب بھلا اس سے اعتراض کیسے کرتے!

نسخۂ نظامی کے کاتب نے ''اک'' کے محل پر زیادہ تر ''اک'' ہی لکھا ہے، جیسے یہ مصرع:

''دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس''

اور کہیں ایسے مقامات پر ''ایک'' لکھا ہے، جیسے: ''ایک تماشا ہوا گلا نہ ہوا'' (ص ۱۱)۔ مرتّب نے مطابقِ اصل، کو یہاں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا، حرف بہ حرف نقل کی ہے۔ حالاں کہ اُن کو یہ بات بہ خوبی معلوم ہونا چاہیے کہ آج ایسے سب مصرعوں کو ساقط الوزن قرار دیا جائے گا جن میں ''اک'' کے محل پر ''ایک'' لکھا ہوا ہو[۵]۔ نسخۂ صدی اڈیشن کے ایسے کچھ مصرعے یہ ہیں:

ع: ایک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا (ص ۳۰)

ع: گرمیِ بزم ہے ایک رقصِ شرر ہوتے تک (ص ٦۷)

ع: تھی وہ ایک شخص کے تصوّر سے (ص ۷۰)

ع: جو داغ نظر آیا، ایک چشم نمائی ہے (ص ۱۴۷)

ع: ایک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
ایک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے (ص ۱٦۲)

ع: ایک نگارِ آتشیں رخ، سر کھلا (ص ۱۹۴)

اِس کے برعکس جو صورت ہے، وہ بہت دل چسپ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ حصّہ 'عبرت کدۂ تدوین'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ نسخۂ نظامی کے کاتب نے عموماً ''آیینہ'' کے محل پر ''آیینہ'' ہی لکھا ہے؛ مگر مرتّب نے ایسے مقامات پر، اِس میں سے ایک ی کو حذف کر کے، 'آینہ'' کو ترجیح دی ہے؛ اور اِس غلط اندیشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب اِس صورت میں، ایسے سب مصرعے ساقط الوزن ہو گئے۔ یا یوں کہیے کہ غالبؔ کے اچھے خاصے مصرعوں کو، بالجبر ساقط الوزن بنایا گیا ہے۔ بہ ظاہر اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسے مقامات پر مرتّب نے یہ خیال کیا کہ کاتب نے غلطی سے ''آینہ'' کو ''آیینہ'' لکھ دیا ہے اور اِس کی تصحیح ہونا چاہیے۔ ''اک'' کی جگہ ''ایک'' تو اُن کو بے محل نہیں معلوم ہوا، مگر صحیح لفظ ''آیینہ'' اُن کو غلط نظر آیا! غالبؔ ہی کے الفاظ میں: ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے!! مجھے زیادہ تعجب اِس پر ہے کہ مرتّب کو کسی ایک جگہ پر یہ محسوس نہیں ہوا کہ مصرع، بحر سے خارج ہو گیا ہے! مثلاً صدی اڈیشن کے اِن مصرعوں کو دیکھیے:

ع: ہوائے سیرِ گل، آیینۂ بے مہریِ قاتل (ص ۱۵)

ع: کیا آیینہ خانے کا وہ نقشہ، تیرے جلوہ نے (ص ۱۶)

ع: آیینہ دیکھ، اپنا سا منہ لے کے رہ گئے (ص ۳۹)

ع: بر روئے شش جہت درِ آیینہ باز ہے (ص ۳۹)

ع: میرا زانو مونس اور آیینہ تیرا آشنا (ص ۴۰)

ع: چمن، زنگار ہے آیینۂ بادِ بہاری کا (ص ۴۳)

ع: کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آیینہ میں مرے (ص ۵۴)

ع: صفائے حیرتِ آیینہ، ہے سامانِ زنگ آخر (ص ۵۷)

ع: ہزار آیینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر (ص ۵۷)

ع: لگا دے خانۂ آیینہ میں روئے نگار آتش (ص ۶۳)

ع: تماشا کہ اے محوِ آیینہ داری (ص ۷۸)

ع: آیینہ تا کہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو (ص ۱۰۲)

ع: الجھتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آیینہ (ص ۱۰۴)

ع: خارِ پا ہیں جوہرِ آیینہ زانو مجھے (ص ۱۳۶)

ع: سیماب پشت گرمیِ آیینہ دے ہے، ہم (ص ۱۴۷)

ع: کس قدر خانۂ آیینہ، ہے ویراں مجھ بے (ص ۱۴۹)

ع: آیینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے (ص ۱۷۳)

ع: آیینہ کیوں نہ دوں کہ، تماشا کہیں جسے (ص ۱۷۴)

ع: آیینہ بدستِ بتِ بدمستِ حیا ہے (ص ۱۷۵)

ع: آیینہ بہ اندازِ گل، آغوش کشا ہے (ص ۱۷۵)

ع: تیغِ ستم آیینۂ تصویر نما ہے (ص ۱۷۵)

ع: چشمِ نقشِ قدم، آیینۂ بختِ بیدار (ص ۱۸۵)

ع: ذرّہ اس گرد کا، خورشید کو آیینۂ ناز (ص ۱۸۵)

ع: دیدہ تا دل، اسدؔ! آیینۂ یک پرتوِ شوق (ص۱۸۶)

ع: آستاں پر ہے ترے جوہرِ آیینۂ سنگ (ص۱۸۹)

اِس انداز کے ساقط الوزن مصرعے کچھ اور بھی ہیں۔ اُن مصرعوں کے ساتھ بھی وہی حادثہ پیش آیا ہے، یعنی غلط صورت نگاری نے گل کھلایا ہے، اور املائی بُل عجبی نے، وزن کی جان پر ستم ڈھائی ہے۔ یہاں اور وہاں، مخفف صورت میں ''یاں'' اور ''واں'' لکھے جاتے ہیں، مگر ایک زمانے میں اِن کی صورت ''یھاں'' اور ''وھاں'' (بہ ہائے مخلوط التلفظ) بھی تھی۔ ''املای غالب'' پر بحث کرتے ہوئے مولانا عرشی نے لکھا ہے: ''ہای مخلوط کی کتابت میں شاید فصحای دہلی کے تلفظ کا لحاظ زیادہ رکھا ہے۔ چناں چہ ''تڑپنا'' میں اُن کے نزدیک بائے فارسی اور نون کے درمیان ہائے مخلوط التلفظ ضرور ہے۔ ''یہاں'' کے مخفف ''یاں'' کو دلّی والے ''یھاں'' بولتے تھے۔ میرزا صاحب نے اِس تلفّظ کو افصح قرار دیا ہے'' (مقدمۂ مکاتیبِ غالب، ص۲۲۹)۔ عرشی صاحب کا یہ قول، مرزا غالبؔ کی ایک اصلاح پر مبنی ہے، جس کو وہ اِس سے پہلے درج کر چکے ہیں۔ نواب ناظمؔ کا شعر تھا:

سیّاحِ جہاں گرد ہیں، آ نکلے یہاں بھی
کچھ تیرے پجاری تو نہیں اے بتِ چیں ہم''

اِس کے پہلے مصرعے کو مرزا صاحب نے یوں بنایا تھا: ''سیّاحِ جہاں گرد ہیں، آ نکلے ہیں یھاں بھی''۔ اور اِس طرح وضاحت کی ہے: ''یہاں، بروزنِ دَہاں، فصیح نہیں۔ بے ضرورت ہونا چاہیے۔ ''یہاں'' بہ ہای مخلوط التلفظ افصح ہے''۔ (مقدمۂ مکاتیبِ غالب، ص۱۵۴)

مرقّعِ غالب میں غالبؔ کے ایک قطعے کا (جو بہ خطِّ غالبؔ ہے) عکس چھپا ہے، اُس میں یہ شعر بھی ہیں:

جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں
ہے اُسی طور پہ یہاں دجلہ فشاں ابرِ کرم
مسلکِ شرع کے ہیں راہرو و راہ شناس
خضر بھی یہاں اگر آ جائے تو لے اُن کے قدم (ص۱۸۱)

ظاہر ہے کہ ''یہاں'' کو ''یھاں'' پڑھا جائے گا۔ اِس سے مکمّل طور پر یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ غالبؔ،

''یہاں'' کے مخفف کو''یاں'' کے بجائے ''یھاں'' لکھتے تھے۔

نسخۂ نظامی کے کاتب نے اِن دونوں لفظوں کو مخفف صورت میں کہیں ''وہاں'' اور ''یہاں'' لکھا ہے اور کہیں ''یاں'' اور ''وہاں''۔ یہ بات مسلّمات میں سے ہے کہ عہدِ غالبؔ کے بہت بعد تک ہائے مخلوط کو لازماً دوچشمی صورت میں نہیں لکھا جاتا تھا۔ یائے معروف و مجہول کی طرح ہائے ملفوظ و مخلوط کی کتابت میں کچھ امتیاز نہیں کیا جاتا تھا۔ آج اِس کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اِس کو لازم سمجھا جاتا ہے کہ یائے معروف و مجہول کی طرح، ہائے ملفوظ و مخلوط کی کتابت میں بھی امتیاز کو ملحوظ رکھا جائے۔ اور اِس کے خلاف اگر ہو، تو اِس کو غلط کہا جاتا ہے۔ اِس بنا پر نسخۂ نظامی کے کاتب پر تو اعتراض وارد نہیں ہوتا، اُس زمانے کی روش ہی یہ تھی؛ مگر ظاہر ہے کہ اب نقل مطابقِ اصل کے نام پر، اِس کی تقلید نہیں کی جاسکتی۔ اب کلامِ غالبؔ کو مرتّب کرنے والے کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اِس سلسلے میں صحیح صورت کا تعیّن کرے۔ مگر مرتّب نے عجیب انداز اختیار کیا ہے، یعنی اِس سلسلے میں بھی اکثر مقامات پر نسخۂ نظامی کے کاتب کے املا کی پابندی کی ہے۔ اس نے اگر ''یاں'' لکھا ہے تو موصوف نے بھی ''یاں'' لکھا ہے، اور اس نے ''یہاں'' لکھا ہے تو موصوف نے بھی اِس کی تقلید کی ہے، یہ دیکھے اور سوچے بغیر کہ اِس سے صحتِ متن پر کیا گزر جائے گی۔ اور اِس ذیل میں اِس قدر غلو سے کام لیا ہے کہ اُس کاتب نے اگر ایک ہی مصرعے میں ''یاں'' اور ''یہاں'' لکھا ہے، تو مرتّب نے بھی اپنے نسخے میں اُسے اُسی طرح برقرار رکھا ہے۔ مثلاً نسخۂ نظامی میں ایک مصرع یوں چھپا ہوا ملتا ہے: ''وہاں اس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار'' (ص ۴۵)۔ صدی اڈیشن میں بھی آپ اِس مصرعے کو اسی طرح پائیں گے: ''وہاں اُس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار'' (ص ۱۰۱)۔ ''وہاں'' کو ''واں'' یا ''وھاں'' پڑھنا چاہیے؛ یہ بالکل نئی بات ہے جس کی تبلیغ مرتّب کرنا چاہتے ہیں۔ اِس بات کو کوئی مانے گا نہیں۔ ماننے والی بات ہی نہیں کہ جب ''وہاں'' بروزنِ ''کہاں'' ہو جب بھی اِس کو ''وہاں'' لکھا جائے، اور جب وہ بروزنِ ''جاں'' ہو، تب بھی اُس کو ''وہاں'' لکھا جائے۔ اِس سخنِ مہمل کو کون مانے گا؟ البتہ یہ ضرور ہوا کہ ایسے سب مصرعے، آج ساقط الوزن قرار دیے جائیں گے۔ مرتّب کو یہ بات تو معلوم ہونا ہی چاہیے کہ آج ''یہاں'' اور ''وہاں'' کو ''یاں'' اور ''واں'' یا ''یھاں'' اور ''وھاں'' کوئی نہیں پڑھ سکتا، اِن کو لازماً ''یہاں'' اور ''وہاں'' (بروزنِ اَماں) پڑھا جائے گا، اور ظاہر ہے کہ اِس صورت میں ایسے مصرعے ساقط الوزن ہو جائیں

گے۔ مثلاً صدی اڈیشن کے اِن مصرعوں کو دیکھیے؛ اِن سب کو ساقط الوزن قرار دیا جائے گا:

ع: نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یہاں بھی خانہ آرائی (ص۵۵)

ع: مجبور یہاں تلک ہوئے اے اختیار، حیف! (ص۶۵)

ع: وہاں اس کو ہولِ دل ہے، تو یاں میں ہوں شرمسار (ص۱۰۱)

ع: ہجومِ غم سے یہاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے (ص۱۳۶)

ع: کسے خبر ہے کہ وہاں جنبشِ قلم کیا ہے (ص۱۶۸)

ع: یہاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا (ص۱۹۶)

اِن سب مصرعوں میں، نسخۂ نظامی میں بھی ''یہاں'' اور ''وہاں'' لکھا ہوا ہے۔ نقل مطابقِ اصل کی ستم ظریفی نے اِن سب مصرعوں کا وزن چوپٹ کر دیا ہے۔ اِس سلسلے کا ایک اور مصرع ہے: ''بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یہاں'' (پہلا اڈیشن، ص۹۱)۔ اِس میں عام قاعدے کے مطابق.....بروزنِ فع آ سکتا ہے اور اِس صورت میں ''یہاں'' صحیح ہو سکتا ہے؛ مگر غالبؔ کے جو اقوال اوپر نقل کیے گئے ہیں، ان کی روشنی میں یہاں پر لازماً ''یہاںؔ'' سمجھا جائے گا، اور اِس صورت میں یہ مصرع بھی محلِ نظر قرار پائے گا۔

اب ایسے کچھ مصرعے دیکھیے جن میں ''یاں'' اور ''وہاں'' کو ''یاں'' اور ''واں'' ہی لکھا گیا ہے:

ع: یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں (ص۸۰)

ع: یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں (ص۸۵)

ع: بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی دادیاں (ص۸۶)

ع: مہر گردوں ہے چراغِ رہگزارِ باد، یاں (ص۸۶)

ع: واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب (ص۹۰)

ع: قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں (ص۹۰)

ع: یاں دل میں، ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں (ص۹۲)

مثالیں تو اور بھی پیش کی جا سکتی ہیں، مگر میرا خیال ہے کہ اثباتِ مدعا کے لیے یہی کافی ہیں۔ یہ سب مصرعے نسخۂ نظامی میں بھی اِسی طرح ہیں، یعنی وہاں بھی ''یاں'' اور ''واں'' ہے۔ میں واقعی نہیں سمجھ سکا

کہ تدوین کا یہ کون سا اصول وضع کیا ہے مرتّب نے، اور وہ کہاں سے اِس کی نظیر لائے ہیں کہ مصنّف کے املا اور عام اصولِ املا پر، کسی پریس کے کاتب کے املا کو مرجّح سمجھا جائے گا، خواہ اس نقل سے، اصل بھی تباہ ہو جائے۔ یہ سوال بار بار ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ ان تیس چالیس سے زیادہ مقامات پر، کسی ایک جگہ بھی مرتّب کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ وزنِ شعر پر حرف آ گیا ہے! کیا مرتّب کے نزدیک، ایسی صورتوں میں مصرعے غیر موزوں نہیں ہو جاتے، یا وہ اِس قدر غیر موزونیت کو غیر مناسب نہیں سمجھتے؟

ایک لفظ ہے ''کیوں کر''۔ اِس کی محرّف صورت ہے: ''کیونکے''۔ یہ ''کیونکے''، ''کیوں کہ'' سے مختلف لفظ ہے۔ روشِ عوام سے بحث نہیں، خواص کے لیے ان دو مختلف لفظوں کے املا میں امتیاز کو ملحوظ رکھنا لازم ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے اپنے مقالے ''اردو املا'' میں لکھا ہے:

> ''کیونکر کی جگہ اگلے وقتوں میں ''کیونکے'' بولتے تھے اور یے کے ساتھ لکھتے تھے۔ ایک دوسرا لفظ ہے ''کیونکہ'' (یعنی کیوں کہ، جس میں ''کہ'' بیانیہ ہے)۔ لوگوں نے ''کہ'' اور ''کے'' کے معنوں میں فرق نہ کرکے، ''کیونکے'' کو ''کیونکہ'' بنا دیا اور پرانے استادوں سوداؔ، میرؔ، دردؔ وغیرہ کے دیوانوں میں ''اصلاح'' فرما دی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ اصلاح نہیں، تصحیف ہے... یاد رکھنا چاہیے کہ اگر ''کر'' کا قائم مقام ہو تو ''کے''، اور نہیں تو ''کہ'' لکھا جائے، جیسے: نہ جانوں کیونکے مٹے داغِ طعنِ بدعہدی (غالبؔ)''

صدی اڈیشن میں بھی اِن مصرعوں میں اِس ''تصحیف'' کی کارفرمائی ملتی ہے:

ع: جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی (ص ٦)

ع: نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی (ص ١٦١)

بات وہی ہے کہ نسخۂ نظامی میں اِن دونوں مصرعوں میں ''کیونکہ'' لکھا ہوا ہے (ص ٤٣، ص ٤٧)۔ مرتّب نے اُس کاتب کے املا کو آیت و حدیث کا درجہ تو دے ہی رکھا ہے یہاں بھی اِس سے اختلاف کیسے کرتے! لفظ غلط ہو جائے تو ہو جائے۔ یہ باور کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ فاضل مرتّب اِن دونوں لفظوں کے املا سے واقف نہیں ہوں گے! مگر اِس سلسلے میں ایک مشکل پیش آتی ہے، مالک رام صاحب

ہی کا مرتّب کیا ہوا دیوانِ غالبؔ، آزاد کتاب گھر، دہلی سے شائع ہوا ہے۔ اُس میں نسخۂ نظامی کے مقابلے میں کچھ زیادہ کلام ہے؟ اُس حصے میں بھی اِس لفظ کا یہی املا ملتا ہے:

ع: اُٹھائے کیونکہ یہ رنجورِ خستہ تن تکیہ (ص ۲۸۷)

ع: چھپاؤں کیونکہ غالبؔ! شورشِ داغِ نمایاں کی (ص ۴۸)

یہاں تو نسخۂ نظامی کے کاتب کا قلم درمیان نہیں ہے، پھر یہاں کیا کہا جائے گا؟

غالبؔ فارسی لفظوں میں طؔ لکھنا صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے ایک خط میں لکھا ہے: ’’جس طرح عینؔ فارسی میں نہیں ہے، طویؔ بھی نہیں ہے۔ مثلاً تشت، بلغتِ فارسی الاصل ہے، املا اس کی طوی سے غلط ہے‘‘ (مقدمۂ مکاتیبِ غالبؔ، ص ۲۲۳)۔ اب صدی اڈیشن کے اِن مصرعوں کو دیکھیے:

ع: کہ اندازِ بخوں غلتیدنِ بسمل پسند آیا (ص ۲۵)

ع: بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا (ص ۸)

دو جگہ دو املا ہیں۔ آخری مصرعے میں ’غلطیدہ‘ ...غلط ہے، اور فرمودۂ غالبؔ کے مطابق غلط ہے؛ مگر بات وہی نقل والی ہے۔ نسخۂ نظامی میں اِن دونوں کو اسی طرح لکھا گیا ہے۔ یعنی پہلے مصرعے میں ’غلتیدن‘ میں تؔ ہے (ص ۵) اور دوسرے مصرعے میں ’غلطیدن‘ کو طؔ سے لکھا گیا ہے (ص ۱۱)۔ مرتّب نے غلط صحیح اور فرمودۂ غالبؔ سب سے قطعِ نظر کر کے؛ کاتب کے اندازِ نگارش کو رہبر بنالیا۔ تؔ اور طؔ کا خلطِ مبحث اِن مصرعوں میں بھی ہے:

ع: شوق ہے ساماں ترازِ نازشِ اربابِ عجز (ص ۴۰)

ع: اس رقم کو دیا طرازِ دوام (ص ۱۹۳)

ع: پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال (ص ۱۹۵)

ع: ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت (ص ۲۰۶)

فارسی لفظ ’’تراز‘‘ ہے۔ ’’طراز‘‘ اُس کی معرّب صورت ہے۔ مرتّب نے ایک جگہ تو فارسی کی اصل صورت ’’تراز‘‘ کو مرجّح سمجھا ہے، اور باقی مصرعوں میں ’’طراز‘‘ کو ترجیح دی ہے۔ معاف کیجیے گا، مجھ سے غلطی ہوئی؛ مرتّب نے ترجیح دی ہے صرف نسخۂ نظامی کے کاتب کے املا کو۔ نسخۂ نظامی میں پہلے مصرعے میں ’’تراز‘‘ ہے (ص ۱۷)، اور باقی مصرعوں میں ’’طراز‘‘ اور ’’طرازی‘‘ ہے (صفحات ۹۰، ۹۱،

۹۲)اسی کی نقل کی گئی ہے، اِس سے بے نیاز ہوکر کہ صحیح صورت کیا ہے،اور یہ کہ ایسے الفاظ کے سلسلے میں غالبؔ کی راے اور روش کیا تھی۔

یہ خلطِ مبحث اِسی نسخے تک محدود نہیں۔آزاد کتاب گھر، دہلی سے جو نسخہ شائع ہوا ہے، اُس میں بھی اِس طرح کی بے امتیازی پائی جاتی ہے۔اُس کے آخر میں مرتّب نے نسخۂ نظامی کے کلام کے علاوہ کچھ اور کلام بھی شامل کیا ہے، اُس حصّے میں ایک مصرعہ یوں ملتا ہے:

''صبا لگا وہ طپانچے طرف سے بلبل کی'' (کذا)

(ص ۳۲۵)

اِس میں ''طپانچے'' کو بھی فرمودۂ غالبؔ کے مطابق، غلط قرار دیا جائے گا۔یا پھر یہ ثابت کیا جائے کہ ''طپانچہ'' عربی کا لفظ ہے۔

ع: کیجیے بیاں سرورِ تبِ غم کہاں تلک

(صدی اڈیشن، ص ۱۱۵)

ع: نقش پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز (ایضاً، ص ۶۱)

ع: وہ تپِ عشق تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع (ایضاً، ص ۱۴۶)

یہاں بھی وہی صورت ہے کہ نسخۂ نظامی میں پہلے مصرعے میں ''تب'' (بہ باے موحّدہ) ہے (ص ۵۱) اور باقی دونوں مصرعوں میں ''تپ'' (بہ راے فارسی ہے، ص ۲۷، ص ۶۷)۔فاضل مرتّب نے ترجیح و تعیّن کے پھیر میں پڑنے کے بجاے، نقل پر بھروسا کیا ہے۔صحّتِ متن کے لحاظ سے اور اصولِ تدوین کے لحاظ سے آپ کا جو جی چاہے کہ لیجیے، مگر یہ تو ماننا ہی ہوگا کہ اِس طرح نقل کرنے میں، آسانی بہت ہوتی ہے۔

نسخۂ نظامی میں ایک شعر یوں چھپا ہوا ہے:

افسوس کہ دید ان کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت (ص ۲۰)

صدی اڈیشن میں پہلے مصرعے میں ''دیداں'' ملتا ہے (ص ۴۶)۔نسخۂ عرشی کے اختلافِ نسخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نسخۂ نظامی کے سوا باقی سب نسخوں میں یہاں ''دنداں'' ہے (افسوس کہ دنداں کا کیا رزق

فلک نے) اور عرشی صاحب نے نسخۂ نظامی کے اس ''دیداں'' کو ''سہوِ کاتب'' قرار دیا ہے۔ مرتّب نے اِس کا اعتراف کیا ہے کہ نسخۂ نظامی میں اغلاطِ کتابت ہیں (اور واقعہ یہ ہے کہ اچھی خاصی تعداد میں ہیں)۔ اُنھوں نے جگہ جگہ نسخۂ نظامی کے متن پر، دوسرے نسخوں کے متن کو ترجیح دی ہے۔ میں یہاں پر دو مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ نسخۂ نظامی میں یہ دو شعر اِس طرح پائے جاتے ہیں:

کیونکر نہ کروں قدح کو میں ختم دعا پر
قاصر ہے شکایت میں تری میری عبارت (ص ۹۸)
گدا سمجھ کے وہ خوش تھا مری خوشامد سے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے (ص ۸۳)

صدی اڈیشن میں دوسرے شعر کا پہلا مصرع یوں ملتا ہے:

''گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئے'' (ص ۱۸۱)

اور دوسرے شعر کا مصرعِ ثانی اِس طرح لکھا گیا ہے:

''قاصر ہے ستایش میں تری، میری عبارت'' (ص ۲۰۷)

یعنی دونوں مصرعوں میں تصحیح کی گئی ہے اور نسخۂ نظامی کے الفاظ ''شکایت'' اور ''مری خوشامد سے'' کو غلط کاتب پر محمول کیا گیا ہے (اور بجا طور پر تصحیح کی گئی ہے)۔ اب سوال یہ ہے کہ جب اور مقامات پر بعض لفظوں کو غلط الکاتب مانا گیا ہے، اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دوسرے نسخوں میں وہ متن نہیں پایا جاتا جو نسخۂ نظامی میں ہے؛ تو پھر ''دیداں'' کو غلط الکاتب کیوں نہیں مانا جا سکتا، جب کہ اور سب نسخوں میں ''دنداں'' ملتا ہے۔ یہ سہوِ کاتب ہو سکتا ہے (اور ہے)۔ اگر اِس کو سہوِ کاتب نہ مانا جائے، اُس صورت میں یہ لازم ہوگا کہ اِس کی وجہ بیان کی جائے۔ یہ بات پوچھی جا سکتی ہے کہ یہاں پر مرتّب نے یہ فیصلہ کس طرح کیا کہ ''دیداں'' سہوِ کاتب کا نتیجہ نہیں؟ یہ بات پہلے لکھی جا چکی ہے کہ آصفیہ لائبریری میں مطبعِ احمدی کا جو نسخہ موجود ہے، اُس میں کسی شخص نے پہلے ''دنداں'' بنایا ہے اور پھر اسی شخص نے یا کسی دوسرے شخص نے نون کا نقطہ کاٹ کر ی کے نقطے رکھّے ہیں۔ یا تو یہ ثابت کیا جائے کہ ''دیداں'' کی تصحیح غالب کی کی ہوئی ہے (اور اب تک ایسا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا ہے) یا پھر اس کو سہوِ کاتب مانا جائے، جس طرح کہ متعدّد مقامات پر مرتّب نے نسخۂ نظامی کے متن کو قبول نہیں کیا ہے اور اِس کو غلطیِ

کتابت سمجھ کر ترک کر دیا ہے۔

صدی اڈیشن میں یہ دو شعر اس صورت سے ملتے ہیں:

ہے نوآموزِ وفا، ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا (ص۱۴)
فیض سے تیرے ہے، اے شمعِ شبستانِ بہار!
دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بُلبُل گلنار (ص۱۸۵)

نسخۂ نظامی میں اِن شعروں کی صورت یہ ہے:

ہے نوآموزِ فنا ہمّتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا (ص۴)
فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار
دلِ پروانہ چراغاں پرِ بلبل گلزار (ص۸۵)

خط کشیدہ الفاظ دونوں میں مختلف ہیں (خط میں نے کھینچے ہیں)۔ کتاب میں نہ حواشی ہیں، نہ غلط نامہ؛ اِس لیے یہ معلوم کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ صحیح صورت کیا ہے۔ یہاں پر یہ بات خاص طور پر ذہن میں رہنا چاہیے کہ اشعارِ غالبؔ کی اِس قدر مختلف تعبیریں کی گئی ہیں، اور مختلف الفاظ پر طرح طرح کی تعبیرات سے اِس طرح مرصّع کاری کی گئی ہے کہ جب تک کھلی کھلی غلطی نہ ہو، یعنی تاویل کی کوئی صورت باقی نہ رہے اور کاتب کی غلطی کے سوا اور کچھ نہ کہا جا سکے؛ اُس وقت تک متن کے معمولی اختلاف کو غلطی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اِن دونوں شعروں میں ''وفا'' اور ''گلنار'' ایسے لفظ ہیں کہ شعر کی معنویت برقرار رہتی ہے۔ یہ بہت زیادہ پریشان کن صورت ہے۔

دہر میں، نقشِ وفا، وجہِ تسلّی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا
مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ

ناتوانی سے، حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا (ص۱۶)

مطلعے میں ''تسلّی'' اور ''معنی'' کے قوافی آئے ہیں، اِس لیے اِس غزل کے جملہ قوافی بہ یاے معروف آئیں گے، یعنی باقی دونوں شعروں میں بھی ''تقویٰ'' اور عیسیٰ'' لکھا جائے گا اور اسی طرح پڑھا جائے گا۔ یہ قاعدۂ مسلّمہ ہے کہ ایسے لفظ جن کے آخر میں الف کی جگہ ''ی'' کو لکھا جاتا ہے، جیسے: لیلیٰ اور موسیٰ؛ اُن کو 'لیلاے شب' اور 'لیلیِ شب' دونوں طرح لایا جا سکتا ہے۔ اِسی طرح وہ اُن الفاظ سے بھی ہم قافیہ ہو سکتے ہیں جن کے آخر میں الف لکھا جاتا ہے، یعنی ''جاتا'' کا قافیہ ''لیلا'' یا ''لیلیٰ'' ہوگا اور ''جاتی'' کا قافیہ 'لیلیِ'' ہوگا اور یہ قاعدہ مروّج، متعارف اور مسلّم ہے۔ اِس میں کسی طرح کا اختلاف نہیں۔ اِس لحاظ سے اِس غزل میں ''تقویِ'' اور 'عیسیِ'' کو صحیح کہا جائے گا اور ''تقویٰ'' اور ''عیسیٰ'' کو لازماً غلط قرار دیا جائے گا۔ شاید یہ خیال ہو کہ یِ کے اوپر الف کا نشان یہاں غلطی سے بن گیا ہے، مگر اِس خیال کی تردید یوں ہو جاتی ہے کہ بعض دوسرے مقامات پر بھی یہی صورت ملتی ہے اور اِس بنا پر یہ ماننا قطعاً درست ہوگا کہ یہ غلط صورت، خود مرتّب کی پسندیدہ صورت ہے۔ مثلاً یہ مصرعے:

ع: رکھ لیجو میرے دعویٰ وارستگی کی شرم (ص۷۰)

ع: الفتِ گل سے غلط ہے دعویٰ وارستگی (ص۷۷)

ع: طوبیٰ وسدرہ کا جگر گوشہ (ص۱۹۸)

اِن سب میں وہی صورت ملتی ہے اور اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتّب ''دعویِ وارستگی'' کو ''دعویٰ وارستگی'' لکھنا صحیح سمجھتے ہیں، حالاں کہ یہ بالکل غلط املا ہے۔ اگر ایسے مقامات پر ایسے لفظوں کی ''ی'' پر الف کا نشان بنایا جائے گا تو غلط نگاری کے علاوہ، ایسے مصرعے بحر سے بھی خارج ہو جائیں گے، کیوں کہ ''طوبیِ وسدرہ'' کو جب ''طوباوسدرہ'' پڑھنا پڑے گا، تو مصرع اپنے آپ دائرۂ وزن سے باہر نکل جائے گا۔

آزاد کتاب گھر دہلی سے دیوانِ غالبؔ کا جو نسخہ شائع ہوا ہے (مرتّبۂ مالک رام صاحب) اُس میں بھی یہ صورت پائی جاتی ہے اور بہ تکرار؛ اِس سے خیال یہی ہو سکتا ہے کہ اِس کا تعلّق کتابت کی غلط نگاری سے نہیں۔ آزاد کتاب گھر والے نسخے میں نسخۂ نظامی کے مقابلے میں زیادہ کلام ہے، میں اسی زائد حصّے سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

ع: شمع آسا، چہ سرِ دعویٰ وکو پاے ثبات؟ (ص۳۵۵)

ع: ہنوز دعوے تمکین وبیم رسوائی (ص ۳۵۸)

ع: کہ خارِ خشک کو بھی دعوٰے چمن نسبی ہے (ص ۳۴۷)

گلہ، پردہ، اشارہ؛ اِن سب لفظوں کے آخر میں، کسی اختلاف کے بغیر، ہاے مختفی ہے۔ اگر قافیے کی مجبوری کے علاوہ، اِن کو کوئی شخص ''گلا، شکوا، اشارا'' لکھتا ہے، تو اِس کو غلط املا کہا جائے گا۔ لکھنے والا کوئی بھی ہو۔ غالبؔ کے یہاں بھی، اور لوگوں کی طرح، غلط املا کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً اُنھوں نے ''بالکل'' اور ''بالفعل'' کو کئی جگہ باالفعل'' اور ''باالکل'' لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اِس کو غلط ہی مانا جائے گا اور ایسے لفظوں کو صحیح طور پر لکھا جائے گا۔ غالبؔ نے ''روانہ'' کو عموماً ''روانا'' لکھا ہے، مگر ''گِلا'' کی تصحیح کی ہے۔ عرشی صاحب نے لکھا ہے:

> ''لفظ ''گلہ'' بے معنی شکوہ کو، خوش خط دیوانِ اُردو کے کاتب نے ہر جگہ ''گلا'' لکھا ہے۔ میرزا صاحب نے کسی جگہ اِس کی تصحیح نہیں کی، لیکن ناظم کے مسوّدے میں ''گلہ'' بنادیا ہے۔ اِس سے یہ راے قائم کی جاسکتی ہے کہ آخر عمر میں عربی فاسی کے اُن لفظوں کو بھی، جو اُردو میں گھل مل گئے ہیں، ہاے مختفی سے لکھنا پسند کرتے تھے''۔

(مقدّمۂ مکاتیبِ غالب، ص ۲۲۸)

مرقّعِ غالبؔ (مرتبۂ پرتھوی چند صاحب) میں ص ۱۳ پر غالبؔ کے مکتوب بہ نامِ نوّاب ناظم کا عکس چھاپا گیا ہے، اُس میں دو جگہ یہ لفظ آیا ہے اور دونوں جگہ ''غالبؔ نے ''گلہ'' لکھا ہے۔ ایک جملہ یہ ہے: ''خدا کا شکر ہے اور اپنی سمت کا گلہ ہے''۔ اِن دلائل کی بنا پر، کلامِ غالبؔ میں لازماً اِس لفظ کا املا ''گلہ'' اختیار کیا جائے گا۔ صحیح املا بھی یہی ہے۔ ایسے اور لفظوں کو اِس پر قیاس کیا جاسکتا ہے اور اُن کے صحیح املا کا بہ آسانی تعیّن کیا جاسکتا ہے۔ مگر صدی اڈیشن کے فاضل مرتّب نے املا کے اِن مسائل پر غور کرنے اور پھر کوئی فیصلہ کرنے کے بجاے، اِس سلسلے میں بھی نسخۂ نظامی کے اندازِ کتابت پر تکیہ کیا ہے۔ چوں کہ اِس میں عموماً ''گلا، اشارا، پردا'' لکھے ہوئے ہیں، اِس لیے مرتّب نے بھی اسی کی نقل کی ہے۔ اور اُس کاتب نے اگر کہیں ''پردہ'' لکھا ہے تو وہاں پر مرتّب نے بھی ''پردہ'' کو صحیح سمجھا ہے۔ مثلاً صدی اڈیشن کے اِن مصرعوں کو دیکھیے:

ع: گلا ہے شوق کو، دل میں بھی تنگیِ جا کا (ص ۳۱)

ع: تنگیِ دل کا گِلا کیا؟ یہ وہ کافر دل ہے (ص۳۳)

ع: تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گِلا (ص۳۶)

ع: یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردا ہے ساز کا (ص۱۸)

ع: کیا ہے کس نے اشارا، کہ نازِ بستر کھینچ (ص۴۹)

ع: ظاہر کا یہ پردا ہے کہ پردا نہیں کرتے (ص۱۵۴)

نسخۂ نظامی میں اِن مصرعوں میں ''پردا''، ''اشارا''، ''گِلا'' لکھّے ہوئے ہیں، اِس لیے مرتّب نے بھی اُسی کی نقل کی ہے۔ اِس کے برخلاف، ذیل کے مصرعے میں، نسخۂ نظامی میں ''پردہ'' لکھا ہوا ہے:

''کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے (ص۷۴)

صدی اڈیشن میں بھی اِس مصرعے میں آپ کو ''پردہ'' ملے گا (ص۱۶۱)۔ اِس وزن اور اِس قبیل کے دوسرے لفظ جیسے تیشہ، پیشہ، جلوہ، آبلہ، شکوہ، ریشہ، نالہ وغیرہ چوں کہ اِس میں بھی بہ ہاے مختفی لکھے ہوئے ہیں، اِس لیے مرتّب کے نسخے میں بھی یہ لفظ بہ ہاے مختفی پائے جاتے ہیں۔ گویا اصول اور قاعدہ کوئی چیز نہیں، نقل اصل چیز ہے۔ چوں کہ مقدّمہ یا حواشی موجود نہیں، اِس لیے ایسے اُلجھن میں ڈالنے والے مباحث سے بھی سابقہ نہیں پڑتا۔

ع: سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں (ص۸۲)

ع: تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر (ص۱۹۱)

ع: جب ازل میں رقم پذیر ہوئے (ص۱۹۳)

غالبؔ فارسی میں وجودِ ذال کے قائل نہیں تھے (یہاں اِس سے بحث نہیں کہ صحیح صورتِ حال کیا ہے) اُنھوں نے سختی کے ساتھ اِس کی پابندی کی ہے کہ فارسی الفاظ میں ذال کی جگہ زے لکھی جائے اور یہ بات سب کو معلوم ہے۔ مرتّب نے گذشتن اور گذاشتن کے مشتقّات کو تو زے سے لکھا ہے مگر ''پذیرفتن'' کے امر ''پذیر'' کو ذال سے لکھا ہے، اگر یہ سہوِ کاتب نہیں، تو نہایت غلط طرزِ نگارش ہے۔

ع: زندگی اپنی جب اس مشکل سے گذری غالبؔ (ص۱۲۰)

یہاں بھی ''گزری'' ہونا چاہیے۔ ''گزرنا'' اُردو کا مصدر ہے، اور اِس میں متّفقہ طور پر زے ہے۔ آزاد کتاب گھر والے نسخے کا اُس حصّے میں بھی، جس میں نسخۂ نظامی کے مقابلے میں زائد کلام ہے، یہ صورت

ملتی ہے، مثلاً:

ع: ہر چند عمر گذری آزردگی میں لیکن (ص ۳۴۶)

ع: دریا سے خشک گذرے مستوں کی تشنہ کامی (ص ۳۴۶)

یہ واقعی ستم کی بات ہے۔

جس طرح غالبؔ ''گزشتن'' اور ''پزیرفتن'' کو صحیح سمجھتے تھے، اُسی طرح ''ذرا'' کے بجائے ''زرا'' کو درست مانتے تھے۔ مکتوبِ غالبؔ بہ نامِ شیونرائن کا عکس مرقعِ غالب میں موجود ہے، اُس کے ایک جملے میں لفظ ''زرا'' آیا ہے، اور غالبؔ نے اُسے زے سے لکھا ہے۔ جملہ یہ ہے: ''اور اچھا میرا میاں زرا تصحیح کا بہت خیال رکھیو''۔ مزید تائید یوں ہوتی ہے کہ عرشی صاحب نے ص ۲۲۵ کے حاشیے پر لکھا ہے: ''دیوانِ غالبؔ کے خوش خط نسخے میں ایک جگہ کاتب نے ذرا کو ذال سے لکھا تھا، میرزا صاحب نے یہاں بھی ذال کا سر چاقو سے چھیل کر ''زرا'' بنا دیا ہے''۔ خاص خاص الفاظ میں املاے غالبؔ کی پیروی اگر کی جائے (اور کی جانا چاہیے) تو کلامِ غالبؔ میں اِس لفظ کو لازماً زے سے لکھا جانا چاہیے۔ نسخۂ نظامی کے کاتب نے، روشِ عام کے مطابق، اِس لفظ کو ذال سے (ذرا) لکھا ہے۔ مرتّب نے بھی اِسی کی نقل کی ہے، مثلاً:

''کھول کر پردہ، ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے (ص ۱۶۱)

نسخۂ نظامی میں اِس مصرعے میں ''ذرا'' ہے (ص ۴۷) مرتّب نے فرمودۂ غالبؔ پر، املاے کاتب کو مرجّح سمجھا ہے۔ یہ تو میں کہہ نہیں سکتا کہ مرتّب کو اِس سلسلے میں فرمودۂ غالبؔ اور روشِ غالبؔ کا علم نہیں تھا؛ لہٰذا یہی کہنا پڑے گا کہ یہ تدوین کا کوئی نیا اصول معرضِ ایجاد میں آیا ہے کہ کاتب کے املا کو ایسے مقامات پر مرجّح سمجھنا چاہیے۔ یہ غلط سہی مگر بات تو نئی ہے؛ یہ تو ماننا ہی پڑے گا۔

لے تو لوں سوتے میں اُس کے پاؤں کا بوسہ مگر (ص ۲۹)

غالبؔ نے دو خطوں میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ صحیح لفظ ''پانو'' ہے (ملاحظہ ہو مقدّمۂ خطوطِ غالب، مرتّبۂ مہیش پرشاد)۔ اُن کی ایک غزل ہے، جس کی ردیف ''پانو'' ہے، اور وہ واو کی ردیف میں ہے، یہ ہے:

دھوتا ہوں جب میں پینے کو، اس سیم تن کے پانو

رکھتا ہے ضد سے، کھینچ کے باہر لگن کے پانو

غالبؔ ''ٹھہرنا'' لکھا کرتے تھے۔ اُن کی تحریروں میں اِس املا کو دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً مرقعِ غالبؔ کے ص۱۰۰ پر غالبؔ کے ایک خط کا عکس موجود ہے، اُس کا ایک جملہ یہ ہے: ''مرادآباد کی سرا میں ایک چھوٹی سی حویلی میں ٹہرا''۔ اِس کی اور بھی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے دیکھیے:

> ''ٹھہرنا'' دلّی میں ''ٹہرنا'' بولا جاتا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا صاحب ہمیشہ ایک ہ سے لکھتے ہیں۔ ناظمؔ نے لکھا تھا:
>
> کیسا مزہ دکھاتے ہیں ہم بھی تو ٹھیر جا
> تقریریں کرکے اور یہ ناصح تو ہل گیا
>
> اس میں میرزا صاحب نے ''ٹہر تو جا'' اصلاح دی''۔

(مقدّمہ مکاتیبِ غالبؔ، ص۲۲۹)

اب ایک طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ یا تو غالبؔ کی روش کے مطابق، اُن کے کلام میں ہر جگہ ''ٹہر'' لکھا جائے، یا پھر صحتِ املا کے عام اصول کے تحت، اِس کو ''ٹھہر'' بنایا جائے۔ کلامِ غالبؔ میں ''ٹھیر'' کسی صورت میں بھی نہیں رکھا جا سکتا، اِس لیے کہ خود غالبؔ اِس کو نہیں مانتے تھے (یہ بات نہیں کہ ''ٹھیر'' بجاے خود غلط ہو) اور اگر یہ صورت اختیار کی جائے گی تو مقدّمے یا حواشی میں لازماً اِس کی صراحت کی جائے گی۔ اب صدی اڈیشن کے اِس مصرعے کو دیکھیے:

صومعے میں اسے ٹھیرایئے گر مُہرِ نماز (ص۲۰۲)

یہاں اِس ''ٹھیرایئے'' کو لازماً غلط قرار دیا جائے گا۔ یا تو ''ٹہرایئے'' لکھیے، یا ''ٹھہرایئے''۔ ہاں، دل چسپ بات یہ ہے کہ نسخۂ نظامی میں اِس مصرعے میں ''ٹھہرایئے'' لکھا ہوا ہے۔ یہاں پر اگر مرتّب اس کی تقلید کرتے تو صحیح بات ہوتی۔ عجیب بات ہے کہ جہاں اُس نسخے کی تقلید صحتِ متن کے لیے ضروری تھی، وہاں تو ایجادِ بندہ سے کام لیا گیا اور جہاں تقلید سے صحّتِ متن تباہ ہو سکتی تھی، وہاں پوری طرح تقلید کی گئی۔ معلوم نہیں، اِسے کیا کہتے ہیں۔

صحیح لفظ ''دونوں'' ہے۔ غالبؔ بھی اِسی طرح لکھتے تھے۔ پرتھوی چند صاحب کی کتاب مرقعِ

غالب میں، غالبؔ کے خطوں کے جو عکس چھپے ہیں، اُن میں کئی جگہ اِس لفظ کو دیکھا جا سکتا ہے۔صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔جنونؔ کے نام خط کے ایک ٹکڑے کا عکس اِس کتاب کے ص ۵۶ پر شائع ہوا ہے، اِس کا ایک جملہ یہ ہے: ''عربی میں تعقیدِ معنوی اور لفظی دونوں معیوب ہیں''۔نسخۂ نظامی کے کاتب نے کہیں ''دونو'' لکھا ہے اور کہیں ''دونوں''، مثلاً:

ع: ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں (ص ۱۳)

ع: قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونو ایک ہیں (ص ۴۲)

اب آپ داد دیجیے اِس نقل نگاری کی کہ صدی اڈیشن میں بھی پہلے مصرعے میں ''دونوں'' اور دوسرے مصرعے میں ''دونو'' کو جگہ دی گئی ہے:

ع: ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں (ص ۱۳)

ع: قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونو ایک ہیں (ص ۹۵)

حالاں کہ ''دونو'' (نون کے بغیر) اصلاً بھی غلط ہے اور غالبؔ کے طرزِ نگارش کے بھی خلاف ہے۔کلامِ غالبؔ میں ''دونو'' کو کسی طرح جگہ نہیں دی جا سکتی۔لیکن اِس سلسلے کا اصلی لطیفہ ابھی باقی ہے: صدی اڈیشن کے ایک اور مصرعے میں بھی ''دونو'' کو جگہ دی گئی ہے۔مصرع یہ ہے:

ع: ''دونو جہان دے کے وہ سمجھے، یہ خوش رہا'' (ص ۸۵)

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، اِس نسخے میں تو حواشی نام کی کوئی چیز موجود نہیں، مگر مالک رام صاحب ہی کا مرتّب کیا ہوا جو نسخہ دیوانِ غالبؔ، آزاد کتاب گھر دہلی سے شائع ہوا ہے، اُس میں تھوڑے بہت حواشی بھی موجود ہیں۔اُس نسخے میں بھی یہ مصرع اِسی طرح ملتا ہے اور حاشیے میں، منشی شیونرائن کے چھاپے ہوئے دیوانِ غالبؔ کے حوالے سے، اختلافِ متن کے طور پر ''دونوں'' کو لکھا گیا ہے۔یعنی شیونرائن والے نسخے میں تو ''دونوں'' ہے، مگر یہ محض حاشیے میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔قاعدہ یہ ہے کہ صحیح یا مرجّح صورت کو متن میں جگہ دی جاتی ہے، اور حاشیے میں اُس کے خلاف صورتوں کو درج کیا جاتا ہے۔مرتّب نے یہاں ہر لحاظ سے صحیح لفظ (یعنی بہ لحاظِ قاعدہ اور بہ لحاظِ املاے غالبؔ) کو تو حاشیے میں لکھا ہے اور غلط صورت کو متن میں جگہ دی ہے۔بات وہی ہے کہ نسخۂ نظامی میں چوں کہ یہاں ''دونو'' ہے (ص ۳۸)، اِس لیے غالبؔ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارتیں بھی اُس کے سامنے نا قابلِ قبول ہیں۔

ع: فائدہ کیا؟ سونچ، آخر تو بھی دانا ہے، اسدؔ

(صدی اڈیشن، ص۳۰)

''سونچنا'' اور ''پونچھنا'' کی جگہ ''سوچنا'' اور ''پوچھنا'' صحیح صورتیں ہیں۔ تلفّظ میں ایسے بعض الفاظ میں، کسی زمانے میں نونِ غنّہ کی ہلکی سی لہر، بعض علاقوں یا بعض افراد کے تلفّظ میں شامل ہو جایا کرتی تھی؛ مگر تحریری صورت نونِ غنّہ کے بغیر مانی گئی ہے۔ خود مرتّب نے دوسرے مقامات پر ''سوچنا کے مشتقات کو نونِ غنّہ کے بغیر ہی لکھا ہے۔ اِس کی دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ دونوں مثالیں موصوف ہی کے مرتّب کیے ہوئے دیوانِ غالبؔ، شائع کردۂ آزاد کتاب گھر، دہلی سے ماخوذ ہیں:

ع: کہا یہ جلد کہ، تو اس میں سوچتا کیا ہے (ص۳۱۱)

ع: مجھے معلوم ہے، جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے (ص۳۴۶)

قیاس کے لیے ایک اور صورت بھی موجود ہے؛ عرشیؔ صاحب نے مقدّمۂ مکاتیبِ غالبؔ میں لکھا ہے:

''پوچھنا، کو کیوں بیتابؔ اور نواب ناظمؔ کے کاتبوں نے ''پونچھنا'' لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے اِس غلطی کی بالالتزام اصلاح کی ہے'' (ص۲۲۹)

''برفاب'' مرکّبِ مقلوب ہے۔ اصلاً ''آبِ برف'' تھا۔ مقلوم صورت میں، ایسے مرکّبات میں الفِ ممدودہ باقی نہیں رہتا، سادہ الف اِس کی جگہ، لے لیتا ہے، جیسے زہراب، خوناب وغیرہ۔ اب صدی اڈیشن کے اِس مصرعے کو دیکھیے:

ع: خسخانہ و برف آب کہاں سے لاؤں (ص۲۱۳)

اور اِس کی وجہ وہی ہے کہ نسخۂ نظامی میں ''برف آب'' لکھا ہوا ہے بھلا اِس کے خلاف کیسے جاتا۔

ع: زخم گر دب گیا لہو نہ تھمبا (صدی اڈیشن، ص۳۰)

مرتّب نے غالباً ''تھمبا'' غالبؔ کی کسی تحریر کی بنا پر لکھا ہوگا، مگر پھر اِس مصرعے میں:

ع: رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے (ص۲۱۳)

''تھمے'' کیسے آ جائے گا؟

صدی اڈیشن میں ہر جگہ ''ڈھونڈھنا'' کے مشتقات کو ایک ھ کے ساتھ لکھا گیا ہے، جیسے یہ مصرعے:

ع: جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ، رات دن (ص ۱۸۰)

ع: سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو (ص ۱۰۰)

مگر یہ املاے غالب کے قطعاً خلاف ہے۔ غالب کی تحریروں میں، اِس مصدر کے مشتقات میں دو ھ ملتی ہیں۔ ایک مثال پیش کی جاتی ہے: غالب کا خط بہ نامِ کلب علی خاں، جو مکاتیبِ غالب (مرتبۂ عرشی صاحب) کے ص ۴۶ سے شروع ہوتا ہے؛ اِس کا عکس مرقعِ غالب میں موجود ہے۔ اُس خط میں غالب نے لکھا ہے: ''الفاظ ڈھونڈھے جاتے ہیں'' اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب اس مصدر کے مشتقات میں دو ھ لکھا کرتے تھے۔ اِس کی مزید تصدیق عرشی صاحب کی اس تحریر سے ہوتی ہے: ''املای غالب کے ذیل میں اُنھوں نے لکھا ہے: ''اُن لفظوں میں بہ تاکیدِ ہای مخلوط لکھواتے تھے جن میں بول چال کے اندر ''ھ'' موجود ہے۔ مثلاً نواب ناظم کے مسوّدے میں کاتب نے ''ڈھونڈا'' لکھا تھا، میرزا صاحب نے اسے ''ڈھونڈھا'' بنادیا ہے'' (مقدمۂ مکاتیبِ غالب، ص ۲۳۰)۔ اور اِن شواہد کے بعد، کلامِ غالب میں ''ڈھونڈتا ہے'' اور ''ڈھونڈھتا ہے'' کو قطعاً غلط قرار دیا جائے گا۔ مگر مرتّب نے اسی صورت نگاری کو، صحت کا مرادف سمجھا ہے۔

جن لفظوں کے آخر میں ہاے مختفی ہوتی ہے، اُن کی جمع جب ''ہا'' کے اضافے سے بنائی جاتی ہے تو اُس ہاے مختفی کو لکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے، جیسے: اندیشہ ہاے دور و دراز۔ اُردو کا چلن یہی ہے۔ صدی اڈیشن میں ایسے لفظوں میں عموماً علامتِ جمع کو متّصل لکھا گیا ہے۔ یہ اُردو کے چلن کے خلاف ہے۔ مرتّب نے ستم یہ کیا ہے کہ جہاں ''ہا'' کو ملا کر لکھا ہی نہیں جا سکتا، وہاں بھی ہاے مختفی کو حذف کر دیا ہے، اور اس سے سے لفظوں کی عجیب عجیب شکلیں وجود میں آئی ہیں، مثلاً:

ع: وہ میوہاے تازہ و شیریں کہ واہ واہ (ص ۲۰۱)
وہ بادہاے ناب گوارا کہ ہاے ہاے

ع: بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہاے گل (ص ۶۷)

ع: مجھے دماغ نہیں خندہاے بیجا کا (ص ۳۱)

ع: دل سے اٹھا لطفِ جلوہاے معانی (ص ۱۳۵)

ع: تمھارے آئیواے طرّہاے خم بہ خم آگے (ص ۱۴۰)

میو، باد، خند، جلو، پار، طرّ : یہ سب عجیب الخلق سے نئے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔اب دوسری قسم کی کچھ مثالیں دیکھیے :

ع: تالیفِ نسخہاے وفا کررہا تھا میں (ص ۱۵)

ع: سرگرمِ نالہاے شرربار دیکھ کر (ص ۵۳)

ع: ڈرنالہاے راز سے میرے خدا کو مان (ص ۹۲)

ع: نکتہاے خرد فزا لکھیے (ص ۱۹۷)

نسخ، نال، اندیش، نکہت؛ بھی اوپر درج کیے گئے الفاظ سے کچھ کم اجنبی نہیں معلوم ہوتے۔مگر لطیفہ یہ ہے کہ مرتّب نے اِس طرزِ غلط آفریں کی بھی پوری طرح پابندی نہیں کی ہے۔مثلاً اِن مصرعوں کو دیکھیے :

ع: میں اور دُکھ تری مژہ ہاے دراز کا (ص ۱۸)

ع: صفحہ ہاے لیالی و ایام (ص ۱۹۳)

اِس میں شک نہیں کہ یہ صورت کم پائی جاتی ہے، مگر خیر، پائی تو جاتی ہے۔مگر یہ سمجھ لیجیے کہ اِن دو مصرعوں میں یہ انداز اصلاً نسخۂ نظامی کے کاتب کا پیش کیا ہوا ہے۔اِس میں ''مژہ ہاے'' (ص ٦) اور ''صفحہ ہاے'' (ص ۸۹) ہی لکھا ہوا ہے۔

ع: یاد کرو وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا (صدی اڈیشن، ص ۲۱)

ع: وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا (صدی اڈیشن، ص ۳۳)

آخری مصرعے میں بھی ''ہر یک'' ہونا چاہیے تھا۔اِس سے متعلّق غالبؔ کا قول اِس سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔

جن لفظوں کے آخر میں ہاے مختفی ہوتی ہے، محرّف صورت میں اُن کو از روے قاعدہ، بہ یاے مجہول لکھنا چاہیے۔جیسے: اندیشہ اور اندیشے میں۔اِسی طرح کعبے سے، مے کدے کو، اشاریے پر، جلوے نے؛ وغیرہ۔اب یہ مسلّمہ قاعدہ ہے جس کی پابندی لازم سمجھی جاتی ہے اور لازم قرار دی جاتی ہے۔اُس زمانے کی عام روش کے مطابق، غالبؔ کی تحریروں میں بھی دونوں صورتیں پائی جاتی ہیں، مگر اِس فرق کے ساتھ کہ زیادہ تر مقامات پر ایسے الفاظ کو بہ یاے مجہول لکھا ہے اور کم مقامات پر بہ ہاے مختفی۔مثلاً مرقّعِ غالبؔ میں مکتوبِ غالبؔ بہ نامِ تفتہ کا عکس چھپا ہے، اُس میں ''نشے میں''، ''محلے میں'' اور ''کرایہ

کو" ملتے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ ایسے الفاظ کو زیادہ تر بہ یاے مجہول لکھتے تھے۔ عرشی صاحب کی تحریر سے اِس کی مزید تائید ہوتی ہے: "...انتخاب اُردو میں تین چار جگہ اور ناظمؔ و بیتابؔ کے مسوّدوں میں ایسے تمام الفاظ کی "ہ" قلم زد کر کے، اُس کی جگہ "ی" بنادی ہے، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے مواقع پر، تلفّظ کے مطابق املا کو پسند کرتے تھے" (مقدّمہ مکاتیبِ غالبؔ، ص۲۲۷)۔ اِس صورت میں اب یہ لازم ہوگا کہ ایسے عام الفاظ کو، کلامِ غالبؔ میں لازماً بہ یاے مجہول لکھا جائے: دو وجوہ سے: ایک تو یہ کہ بہ لحاظِ قاعدہ، یہی درست ہے۔ اور دوسرے یہ کہ خود غالبؔ کی تحریروں میں بیش تر یہی صورت ملتی ہے۔ مگر مرتّبِ صدی اڈیشن نے اِس سلسلے میں بھی سارے قاعدوں کو بالاے طاق رکھ کر، نسخۂ نظامی کے کاتب کی عموماً تقلید کی ہے۔ اُس نے جہاں ایسے لفظوں کو بہ ہاے مختفی لکھا ہے، مرتّب کے نسخے میں بھی آپ اِن کو بہ ہاے مختفی پائیں گے۔ اور اُس نے اگر ایسے لفظوں کو بہ یاے مجہول لکھا ہے تو صدی اڈیشن میں بھی یہ لفظ بہ یاے مجہول ملیں گے۔ عام طور پر یہی صورت ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک ہی مصرعے میں اگر دو لفظ ایسے آئے ہیں جن کے آخر میں ہاے مختفی ہے، اور محرّف صورت میں، نسخۂ نظامی میں اِن میں سے ایک کو بہ ہاے مختفی اور ایک کو بہ یاے مجہول لکھا گیا ہے؛ تو نسخۂ صدی اڈیشن میں بھی یہی صورت ملے گی۔ مثلاً صدی اڈیشن کے اِن مصرعوں کو دیکھیے:

ع: کیا آینہ خانے کا وہ نقشہ، تیرے جلوہ نے (ص۱۶)

ع: نشّہ کے پردے میں ہے محوِ تماشاے دماغ (ص۴۵)

ع: وہ آرہا مرے ہمسایہ میں تو سایے سے (ص۵۱)

ع: صبا جو غنچہ کے پردے میں جا نکلتی ہے (ص۱۷۱)

خط کشیدہ الفاظ نسخۂ نظامی میں بھی اِسی طرح ہیں (صفحات: ۶، ۲۰، ۲۳، ۷۹)۔ ذیل میں چند مصرعے نقل کیے جاتے ہیں۔ اِن مصرعوں میں چوں کہ نسخۂ نظامی میں ایسے الفاظ کو بہ ہاے مختفی لکھا گیا ہے، اِس لیے صدی اڈیشن میں بھی اِن کو بہ ہاے مختفی لکھا گیا ہے:

ع: دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ (ص۱۴)

ع: جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا (ص۱۹)

ع: گریہ سے یاں، پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا (ص۲۰)

ع: ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب (ص۲۲)

ع: ترے وعدہ پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا (ص۲۴)

ع: ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ (ص۲۴)

اِس کے برخلاف، اِن مصرعوں میں چوں کہ نسخۂ نظامی میں، ایسے الفاظ کو بہ یاے مجہول لکھا گیا ہے، اِس لیے صدی اڈیشن میں بھی یہ بہ یاے مجہول ملتے ہیں:

ع: تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ (ص۱۲)

ع: ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے، شیشے اچھل رہے (ص۱۸)

ع: نہ دے نامے کو اتنا طول، غالبؔ! مختصر لکھ دے (ص۲۹)

ع: ریختے کے تمھیں اُستاد نہیں ہو، غالبؔ!

ع: کہتے ہیں، اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا (ص۳۷)

ع: تیرے چہرے سے ہو ظاہر، غمِ پنہاں میرا (ص۴۱)

ع: کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار (ص۵۱)

بے شمار مثالوں میں صرف چند مثالوں کو یہاں پیش کیا گیا ہے۔ اِس سے اتّفاق کیا جائے گا کہ یہ صورتِ حال سخت پریشان کُن ہے۔ تدوین کا مطلب یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ کسی پریس کے کاتب کے املا کی نقل کی جائے۔

جس طرح ہاے مختفی اور یاے مجہول کے سلسلے میں، اِس صدی اڈیشن میں کسی قاعدے کی پابندی نہیں کی گئی، اُسی طرح لفظوں کو ملا کر یا الگ الگ لکھنے کے سلسلے میں بھی کسی قاعدے قانون کا نام و نشان نظر نہیں آتا۔ حد یہ ہے کہ ایک ہی مرکّب کو، کہیں الگ الگ لکھا گیا ہے اور کہیں ملا کر۔ اگر کوئی شخص یہ سوچنے لگے کہ شاید اُردو میں اِس سلسلے میں کوئی باضابطہ ہے ہی نہیں، تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ مرتّب کے لیے لازم تھا کہ اِس سلسلے میں کوئی اصول بناتے، کوئی ایک طریقہ اختیار کرتے؛ مگر حیرت ہوتی ہے کہ فاضل مرتّب نے اِس مسئلے کو ادنا التفات کا مستحق نہیں سمجھا۔ بے شمار مثالوں میں سے، میں یہاں صرف چند ایسی مثالیں پیش کرتا ہوں جن میں دو رنگی پائی جاتی ہے، یعنی ایک ہی مرکّب کو یا ایک ہی طرح کے مرکّبات کو، ایک جگہ ملا کر لکھا گیا ہے اور دوسری جگہ اِسی کو منفصل رکھّا گیا ہے۔ صرف انھی چند مثالوں

سے، اُس خلفشار کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ صدی اڈیشن کے صفحات پر جا بہ جا نظر آتا ہے:

ع: بسکہ دشوار ہے، ہر کام کا آساں ہونا (ص۱۲)
ع: پا بہ دامن ہو رہا ہوں بس کہ میں صحرا نورد (ص۲۶)

ع: وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا (ص۱۶)
ع: تو دوست کسی کا بھی ستم گر نہ ہوا تھا (ص۳۸)

ع: وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا (ص۱۶)
ع: نہ پوچھ بےخودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب (ص۵۲)

ع: چراغِ مردہ ہوں میں بےزباں گورِ غریباں کا (ص۱۷)
ع: عشق کا، اس کو گماں، ہم بیزبانوں پر نہیں (ص۸۵)

ع: مبارک باد اسدؔ! غمخوارِ جانِ دردمند آیا (ص۸۵)
ع: بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غم خوارِ دوست (ص۴۷)

ع: ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا (ص۱۸)
ع: غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں (ص۷۵)

ع: سُن، اے غارت گرِ جنسِ وفا! سُن (ص۲۸)
ع: غارتگرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ گل (ص۱۳۷)

ع: عشق میں، بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے (ص۴۷)
ع: درخورِ عرض نہیں، جوہرِ بےداد کو جا (ص۵۰)

ع: رہرو چلے ہے، راہ کو ہموار دیکھ کر (ص۵۴)
ع: کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں (ص۷۸)

ع: نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں، غالبؔ (ص۶۰)
ع: مے خانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں (ص۶۰)

ع: کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز (ص۶۱)
ع: غیر کو، یارب! وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے؟ (ص۱۲۳)
ع: گر چراغانِ سرِ رہ گزر بادنہیں (ص۶۰)
ع: مہر گردوں ہے چراغِ رہگزارِ باد، یاں (ص۸۶)

ع: ہوں گل فروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز (ص۶۰)
ع: دامانِ باغبان وکفِ گلفروش ہے (ص۱۳۵)

ع: گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج (ص۴۸)
ع: بہ طرزِ اہلِ فنا، ہے فسانہ خوانیِ شمع (ص۶۴)

ع: چھوڑوں گا میں نہ اس بُتِ کافر کا پوجنا (ص۵۲)
ع: ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے (ص۱۲۰)

ع: حضرت بھی کل کہینگے کہ ''ہم کیا کِیا کیے''؟ (ص۱۲۱)
ع: کھلیگا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا، یارب (ص۱۱۲)

یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ مرتّب نے اِس سلسلے میں کسی طرح کا ضابطہ نہیں بنایا۔ فارسی کے اسمِ فاعل سماعی (جیسے: غم خوار) کہیں منفصل ملتے ہیں، کہیں متّصل۔ فارسی کا حرفِ جار ''بہ'' کہیں لفظ سے ملا کر لکھا گیا ہے (جیسے: بوقت) اور کہیں اس کو منفصل رکھا گیا ہے (جیسے: بہ طرز)۔ ''بے'' جو بہ طورِ لاحقہ آتا ہے، اِس کی بھی یہی صورت ہے یعنی کہیں مثلاً ''بے خبر'' ہے اور کہیں ''بیباک''۔ غرض عجیب افراتفری کا عالم ہے۔

مرتّب نے توقیف نگاری کا اہتمام کیا ہے۔ تشدید اور اضافت کے زیر بھی لگائے گئے ہیں اور بعض مقامات پر اعراب بھی لگائے ہیں۔ یقیناً یہ ضروری امور ہیں، مگر اِن احتیاط کی بے حد ضرور ہوتی

ہے، ورنہ بہت سے مقامات پر مفہوم بدل بھی سکتا ہے اور بگڑ بھی سکتا ہے۔ اِس سلسلے میں بھی بہت سی خامیاں سامنے آتی ہیں۔ اِس سلسلے میں کم سے کم مثالوں پر قناعت کی جائے گی، اِس لیے کہ یہ تبصرہ ویسے ہی طوالت سے گراں بار ہو چکا ہے:

دماغِ عِطر پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہاے صبا، کیا؟ (ص۲۶)

نسخۂ عرشی میں ''دماغِ عطرِ پیراہن'' ہے۔عرشی صاحب نے اپنے مقدّمۂ دیوانِ غالب میں اِس مصرعے کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔اُن کی عبارت یہ ہے:

> اِس کے پہلے مصرعے کے الفاظ ''عطر پیراہن'' کو بہ کسرۂ را اور بدونِ کسرہ دو طرح سے پڑھا جاسکتا ہے۔مگر میرزا صاحب نے پہلے ''بوی پیراہن'' لکھا تھا، جس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مقصودِ شاعر مرکّبِ اضافی ہے اور اس نے ''بو'' کی جگہ ''عطر'' اِس لیے رکھا ہے کہ اوّل الذکر کی تعیم دور ہو جائے۔لہٰذا یہاں علامتِ اضافت نہ لگائی جائے گی، تو ہم مرادِ شاعر سے دور جاپڑیں گے''۔(ص ۱۱۹)

ممکن ہے کہ مرتّب کے ذہن میں کوئی مفہوم ہو، مگر حواشی یا مقدّمے کے نہ ہونے سے، عام قاری اِس سے واقف نہیں ہوسکتا اور وہ اِس مقام پر اُلجھے گا۔

بزمِ قدح سے عیشِ تمنّا نہ رکھ کہ، رنگ
صیدِ ز دام جستہ ہے، اس دام گاہ کا (ص۴۲)

''عیشِ تمنّا'' بہ ظاہر مفہوم کو بگاڑ رہا ہے۔ یہ کتابت کی غلطی اِس لیے نہیں معلوم ہوتی کہ آزاد کتاب گھر سے جو نسخۂ دیوانِ غالب چھپا ہے (مرتّبۂ مالک رام صاحب) اُس میں بھی ''عیشِ تمنا'' ہے۔

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغِ جگر کا نشاں ہے (ص۱۱۳)

''عیشِ تمنا'' کی طرح یہ ''داغِ جگر'' بھی بہ ظاہر منافیِ مفہومِ شعر معلوم ہوتا ہے۔ہاں نسخۂ آزاد کتاب گھر میں بھی ''داغِ جگر'' ہے، اِس لیے بہ ظاہر یہ بھی غلطیِ کتابت نہیں معلوم ہوتی۔

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے

نافہ دماغ آہوِ دشتِ تتار ہے (ص ۱۳۷)

پہلے مصرعے میں ''زلفِ یار'' ہونا چاہیے۔ یہ غالباً سہوِ غالب ہے اور یہ ایسا ہے کہ بہ آسانی اِس کی طرف ذہن منتقل ہو سکتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں ''نافہ دماغ آہوِ'' محلِ نظر ہے۔ بہ ظاہر تو ''دماغِ آہو'' کا محل ہے۔ معنویت کا تقاضا یہی ہے۔ اگر مرتّب نے اِس کے خلاف رائے قائم کی ہے، تو لازم تھا کہ وہ اِس کی صراحت کرتے۔ بالفرض یہ سہوِ کاتب ہے، تو یہ ایسا سہو ہوگا جس کی طرف بہ آسانی ذہن منتقل نہیں ہوگا، اِس کے بجائے اُلجھن کا شکار ہوگا۔ نسخۂ آزاد کتاب گھر دہلی میں بھی ''نافہ دماغ آہوِ'' ملتا ہے (مگر نسخۂ عرشی میں صحیح طور پر ''دماغ'' کی ''غ'' پر زیر لگا ہوا ہے) ایسے مقامات بہت پریشان کُن ہوتے ہیں۔

بہت سے عام الفاظ پر تشدید لگائی گئی ہے اور یہ التزام نہایت مناسب ہے، مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ ایسے بہت سے مقامات پر اِس کو چھوڑ دیا گیا ہے، جہاں اِس کی واقعی ضرورت تھی اور اِس کے بغیر صحتِ متن کو ناقص بھی کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

ع: سادگی و پُرکاری، بےخودی و ہشیاری (ص ۱۳)

ع: ایک عالم پہ ہیں، طوفانِ کیفیتِ فصل (ص ۴۵)

ع: تغیر آب برجا ماندہ کا، پاتا ہے رنگ آخر (ص ۵۷)

ع: ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا، سو بھی مٹ گیا (ص ۱۱۷)

ع: ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف، کیفیتِ شادی (ص ۱۷۳)

ع: دل مدّعی و دیدہ بنا مدّعا علیہ (ص ۱۷۴)

یہ چند مثالیں ہیں۔ خط کشیدہ الفاظ تشدید کے متقاضی ہیں۔ مثلاً پہلے مصرعے میں ''سادگی'' اور ''بےخودی'' کی ''ی'' پر تشدید نہ لگائی جائے، تو ایک عام آدمی اِس کو ''سادگی و پُرکاری، بےخودی و ہشیاری'' پڑھے گا۔ حالاں کہ اِن کی صحیح قرأت بہ یائے مشدّد ہوگی، یعنی: ''سادگیّ و پُرکاری، بےخودیّ و ہشیاری''۔ اِس سے اتّفاق کیا جائے گا کہ ایسے مقامات پر تشدید لازماً ہونا چاہیے اور اِس کے نہ ہونے سے، غلط خوانی کا احتمال کچھ نہ کچھ ضرور رہے گا۔ یہ بات اِس لیے کہی جا رہی ہے کہ چوں کہ مرتّب نے تشدید کا اہتمام کیا ہے اور ایسے لفظوں پر تشدید لگائی ہے، جن کو اُس کے بغیر بہ آسانی صحّت کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے:

ع: یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان غالبؔ (ص۵۲)

ع: دے وہ جس قدر ذلّت، ہم ہنسی میں ٹالیں گے (ص..)

اور ایسے ہی بہت سے مقامات؛ اِس بنا پر قاری کے ذہن کا مشوّش ہونا ناگزیر ہے۔ ''ذلّت'' تو اصلاً مع تشدید ہے، اس لیے اِس کو تو ہر صورت میں بہ لامِ مشدّد پڑھا جائے گا، مگر جیسے ''کیفیت'' دونوں طرح صحیح ہے (کیفیت، کیفیّت)، ایسے الفاظ اگر بہ یاے مشدّد استعمال میں آئے ہوں، تو اُن پر لازماً تشدید کو ہونا چاہیے۔

متعدّد الفاظ پر اعراب لگائے گئے ہیں، ان میں سے کئی مقامات محلِ نظر ہیں، مثلاً:

ع: غرض شِستِ بُتِ ناوک فگن کی آزمایش ہے (ص۱۵۹)

لفظ ''شست'' کے شؔ پر زیر لگا ہوا ہے، مگر فارسی میں یہ لفظ اِس معنی میں بہ فتحِ اوّل ہے (برہانِ قاطع، غیاث اللّغات، بہارِ عجم)۔ اُردو کی بول چال میں یہ بہ کسرِ اوّل بھی ہے (نور اللّغات)۔ غالبؔ کے کلام میں اِس کو بہ لحاظِ اصل، بہ فتحِ اوّل ہونا چاہیے۔ بہ صورتِ دیگر یہ ثابت کرنا ہوگا کہ غالبؔ نے اِس لفظ کو بہ کسرِ اوّل استعمال کیا ہے، اور مرتّب نے ایسا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ اِس کے بغیر، بہ کسرِ اوّل کو محلِ نظر قرار دیا جائے گا۔ نسخۂ عرشی میں اِس کو صحیح طور پر بہ فتحِ اوّل ''شَست'' لکھا گیا ہے۔

ع: یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے؟ (ص۱۴۳)

فارسی میں اِس لفظ کو اکثر لُغت نویسوں نے بہ فتحِ اوّل اور بعض نے بہ ضمِ اوّل لکھا ہے۔ بہ ضمِ اوّل کو (جو قولِ بعض ہے) مرجّح قرار دینے کے لیے، کسی وجہ کا تعیّن ضروری ہے۔ اس کے بغیر، یہاں بہ ضمِ اوّل کو کیوں قبول کرلیا جائے؟ یا پھر یہ بتایا جائے کہ غالبؔ نے اِس کو بہ ضمِ اوّل استعمال کیا ہے۔ کیا ایسا کوئی ثبوت موجود ہے؟ نسخۂ عرشی میں اِس کو بہ فتحِ اوّل ہی لکھا ہے، اور یہی مرجّح ہے۔

ع: ہر چند سُبک دست ہوئے بت شکنی میں (ص۵۶)

ع: سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟ (ص۱۰۵)

فارسی لُغات میں عام طور پر اِس کو بہ فتحِ اوّل وضمِ ثانی لکھا گیا ہے (بہارِ عجم، برہانِ قاطع) بل کہ صاحبِ غیاث اللّغات نے یہ صراحت بھی کردی ہے کہ: ''ایں لفظ بلہجۂ عام بضمتین است وبلہجۂ اہلِ ایران بفتح اول وضم ثانی''۔ لغت نویسوں نے اِس کو بہ فتحِ اوّل وضمِ دوم مرجّح قرار دیا ہے۔ بہ فتحِ اوّل کو مرجّح

ماننے کے لیے، کوئی نہ کوئی دلیل تو دینا ہی ہوگی۔ یا پھر یہ ثابت کیا جائے کہ غالبؔ نے اِس لفظ کو بہ ضمِ اوّل مرجّح بتایا ہے۔ اِس کے بغیر، بہ ضمِ اوّل کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ نسخۂ عرشی میں صحیح طور پر دونوں مصرعوں میں ''سُبک'' بہ ضمِ اوّل و دوم لکھا ہوا ہے۔

ع: نافہ دماغ آہوِ دشتِ تتار ہے (ص۱۷۳)

ع: شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا (ص۳۹)

دونوں مصرعوں میں ''آہو'' اور ''بازو'' ایک ہی انداز سے آئے ہیں مگر ایک جگہ تو اضافت کے لیے واو پر زیر لگانا کافی سمجھا گیا ہے (آہوِ) اور ایک جگہ ے کا اضافہ کیا گیا (بازوے)، ایک طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ میں ذاتی طور پر واو پر زیر لگانے کو ترجیح دوں گا۔

ہاے ملفوظ شروعِ الفاظ میں ہو، درمیان ہو یا آخر میں؛ ہر صورت میں اُس کا نیچے والا شوشہ اُس کا جزو رہے گا، خاص طور پر آخرِ لفظ میں۔ عام طور پر اس کی پابندی نہیں کی جاتی، مگر یہاں ذکر خاص لوگوں کا ہے۔ مرتّب نے بعض مقامات پر اس کا لحاظ رکھا ہے، مثلاً:

ع: در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا (ص۱۹)

یہاں ''کہہ'' صحیح طور پر لکھا گیا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ آخرِ لفظ میں آنے والی ہاے ملفوظ کے نیچے شوشہ لگانے کو مرتّب ضروری سمجھتے ہیں، مگر بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں اس کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ حالاں کہ یہ پابندی ضروری تھی، مثلاً:

ع: بہ کرم داغ نہ، ناصیۂ قلزم و نیل (ص۱۱۹)

یہاں ''نہہ'' ہونا چاہیے۔ ''نہ'' اور ''نہہ'' میں اسی طرح فرق کو ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔ ''بہ کرم'' میں ''بہ'' کو شوشے کے بغیر لکھا جائے گا، کیوں کہ اِس میں ہاے مختفی ہے اور ''نہہ'' میں شوشہ لازماً لگایا جائے گا کیوں کہ یہاں ہاے ملفوظ ہے۔ اور شوشے کے بغیر، اِن دونوں میں امتیاز کی نشان دہی کی ہی نہیں جا سکتی۔ یا جیسے یہ مصرع:

ع: رہے ہے یُوں گہ و بے گہ کہ، کوے دوست کو اب (ص۱۵۶)

یہاں بھی ''گہہ و بے گہہ'' ہونا چاہیے۔ اِس مصرعے میں ''کہ'' بیانیہ ہے، جس میں ہاے مختفی ہے اور اِس کے مقابلے میں ''گہہ'' میں ہاے ملفوظ ہے، اِس لیے یہ لازم ہوگا کہ ''کہ'' کو شوشے کے بغیر لکھا جائے،

اور ''گہ'' اور ''بے گہ'' کی ہائے ملفوظ کو مع شوشہ لکھا جائے۔ ایسی مثالیں اِس نسخے میں بہت ہیں۔

اغلاطِ کتابت تو اُردو کتابوں کا مقدّر ہیں اور اِن سے محفوظ رہنے کی بہ ظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کسی کتاب میں اغلاطِ کتابت کا وجود، نہ محلِ تعجب ہے نہ قابلِ اعتراض، ہاں تعجب اُس وقت ہونا چاہیے جب اغلاطِ کتابت کسی کتاب میں نہ ہوں۔ مجھے تو اب تک ایسی کوئی کتاب ملی نہیں جو اغلاطِ کتابت سے خالی ہوتی۔ صدی اڈیشن کے اِس نسخے میں بھی کتابت کی غلطیاں ہیں اور اچھی خاصی تعداد میں ہیں، اور ہر طرح کی ہیں۔ یہ ضرور کیا جاسکتا ہے کہ ایسی کتابوں میں غلط نامہ شامل کیا جائے۔ اِس نسخے میں یہ شامل نہیں، اور یہ واقعی کمی ہے۔

متعارف حضرات کی تالیفات، نوواردانِ بساطِ تحقیق و تدوین کے لیے مثال و معیار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر انھی حضرات کی تالیفات کا یہ حال ہو کہ کوئی صفحہ کسی نہ کسی طرح غلطی، خامی یا ناتمامی سے خالی نہ ہو، تو تدوین کے اصولوں کی پابندی کا فقدان نظر آئے، معمولی سے معمولی مسائل میں اُلجھاوے نظر آئیں اور اہم اُمور، بے نیازی کے بوجھ تلے دب کر رہ گئے ہوں؛ اُس صورت میں ایسی تالیفات کے جو اثرات ہوں گے، اُن کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ کم فرصتی، ہمارے اکثر متعارف اساتذہ کا ضمیمہ بن کر رہ گئی ہے اور اِس کی وجہ سے اکثر خرابیاں ظہور میں آتی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ یہ حضرات بہ یک وقت کئی کام اور کئی طرح کے کام انجام دینا چاہتے ہیں، یعنی تحقیق و تدوین پر بھی صنعتِ تضاد کو حاوی کرنا چاہتے ہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ تحقیق میں شرک کی گنجایش نہیں اور ''ہزار شیوگی'' اِس کو راس نہیں آتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عشق و ہوس کے امتزاج سے، ایک خاص طرح کی کج خرامی وجود میں آتی ہے اور یہ کاواک پن، تحقیق و تدوین کے وجود کو بگاڑ کر رکھ دیا کرتا ہے۔

حواشی:

ا نسخۂ احمدی کے آخری صفحے کے حاشیے پر، غالبؔ کا لکھا ہوا جو خط موجود ہے، اور جس کو اوپر نقل کیا جاچکا ہے؛ اُس خط کو مالک رام صاحب نے بھی، مقدمۂ دیوانِ غالبؔ (آزاد کتاب گھر، دہلی) میں ص ۲۵ پر نقل کیا ہے۔ اُس نقل میں پہلا جملہ اِس طرح ملتا ہے: ''جناب مولوی محمد حسین خاں کو میرا اسلام پہنچے''۔ اصل خط میں لفظ ''مولوی'' موجود نہیں۔ اُس میں جملہ یوں ہے: ''جناب محمد حسین خاں کو میرا اسلام پہنچے''۔ مالک رام صاحب نے اپنے اس مقدّمے میں کئی جگہ ''مولوی محمد

حسین خاں'' لکھا ہے، جو ظاہر ہے کہ اُسی غلطی پر مبنی ہے۔ اِس سے خیال یہی ہوتا ہے کہ موصوف نے اُس نسخے کو خود نہیں دیکھا، بالواسطہ استفادہ کیا ہے۔ اِسی طرح مالک رام صاحب کی نقل میں آخری جملہ یوں ملتا ہے: ''یہ مجلّد گویا مسوّدہ ہے، اِسی کو بھیج دیجیے''۔ اصل خط میں ''بھیج دیجے'' ہے۔

۲۔ اِس نسخے کے سرِ ورق کے بالائی حاشیے پر یہ، عبارت لکھی ہوئی ہے:

''از ملک ہیچ میرز خاکسار ذرۂ بیمقدار سیّد حسن رضا عرف بڈّھن وفا سوز خواں ابن سید علی رضا ابن سیّد مولوی احسان محمد صاحب المتخلص بہ صفا مرحوم و مغفور بلگرامی''۔

اس کے نیچے بھی کچھ لکھا ہوا تھا، لیکن اُسے سیاہی سے اِس طرح قلم زد کیا گیا ہے کہ پڑھنے میں نہیں آتا۔

۳۔ غالبؔ سے پہلے بھی اِس لفظ کے اِس طرح استعمال کی مثال ملتی ہے:

اپنی کولی میں مگر رات کو بھر لیتا ہے　　　تان بھیروں کی جو یہ مرغِ سحر لیتا ہے

ایک کوڑی کو نہ لیجے، جو فروشندہ کہے　　　ہے بِکاؤ، کوئی زنبیلِ عمرو لیتا ہے

(انشا، کلامِ انشا، ص۲۶۲)

یہ ویسا ہی تصرّف ہے جیسے مومنؔ نے شمر کو ''شمَر'' نظم کیا ہے:

لگے خدنگ جب اُس نالۂ سحر کا سا　　　فلک کا حال نہ ہو کیا مرے جگر کا سا

دل اے شوخ کو مومن نے دے دیا، کہ وہ ہے　　　محب حسین کا، اور دل رکھے شمَر کا سا

(انشا، کلامِ انشا، ص۲۶۲)

کسی لفظ کی حرکات میں تصرّف سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا املا بھی بدل جائے۔

۴۔ قاضی عبدالودود صاحب نے مرتّب کے اس حاشیے پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اُن کی عبارت یہ ہے:

''غالبؔ کی ایک عروضی غلطی: نظم طباطبائی نے شرحِ دیوانِ غالبؔ میں لکھا ہے کہ غالبؔ کے مصرعے: ''دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ'' میں ایک ''رک'' زائد ہے۔ جناب مالک رام نے اپنے مرتّبہ دیوان کے حاشیے میں تحریر کیا ہے: ''اصل میں رک کی تکرات ہے، جو ظاہراً کتابت کی غلطی ہے'' اور اِس نسخے میں ہے بھی صرف ایک ''رک'' (ص۲۷۸)۔ غالبؔ اتنے بڑے عروضی نہ تھے کہ اُن سے غلطی کا احتمال ہی نہ ہو، اور دیوان کے کل مطبوعہ اور خطّی نسخوں میں، جن میں یہ رباعی ہے، بہ شمولِ نسخۂ لاہور اور بہ استثنائے نسخۂ مرتّبۂ موصوف، دو ''رک'' موجود ہیں''۔ (نقوش، اکتوبر ۱۹۵۸ء)

۵۔ ''ایک'' اور ''اک'' کے سلسلے میں غالبؔ نے اپنی رائے واضح طور پر ظاہر کی ہے۔ نواب ناظم کا شعر تھا:

''پیری میں بھی بے ولولۂ شوق نہیں ہم
رکھتے ہیں ابھی ایک دل ہنگامہ گزیں ہم''

غالبؔ نے بہ ذیلِ اصلاح ''ایک'' کے متعلّق لکھا ہے:

''یہاں ''ایک'' کی جگہ ''اک'' بے یاے تحتانی درست ہے۔ مگر ''ہر'' کے ساتھ ''ہریک'' ہو، نہ ''ہراک''۔ (مقدمۂ مکاتیبِ غالب، ص ۱۵۴)

اِس سے صراحت کے ساتھ ''ایک'' اور ''اک'' کے متعلّق غالبؔ کی راے معلوم ہو جاتی ہے۔ یہی بات ناظم کے ایک اور شعر کی اصلاح کے ذیل میں لکھّی ہے:

''یوں تو ہو جاتا ہے ہر ایک عیش و عشرت کا شریک
دوست کہتے ہیں اسے جو ہو مصیبت کا شریک

جہاں ''ہرایک'' اچھی طرح نہ آئے، وہاں ''ہریک'' لکھیے، ''ہرایک'' کیوں لکھیے''۔
(ایضاً، ص ۱۵۴)

۶۔ یادگارِ غالب کا پہلا اڈیشن (نامی پریس کان پور ۱۸۹۴ء) میرے سامنے ہے، اِس میں ایسے مقامات پر ہر جگہ التزام کے ساتھ ''یھاں'' اور ''وھاں'' (بہ ہاے مخلوط التلفّظ) لکھا ہوا ملتا ہے، مثلاً:

ع: یھاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں (ص ۱۵۰)
ع: یھاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں (ص ۱۵۰)
ع: یھاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا (ص ۱۳۹)
ع: اس کی بزم آرائیاں سن کر دلِ رنجور یھاں (ص ۱۳۷)
ع: یھاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے (ص ۱۳۷)
ع: مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یھاں (ص ۱۲۷)
ع: وھاں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب (ص ۱۵۲)
ع: یھاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی (ص ۱۶۱)

یہ صرف کچھ مثالیں ہیں، اِن دونوں لفظوں کا مرجح املا (کلامِ غالبؔ کی حد تک) وہی ہے جس کو یادگارِ غالب میں اختیار کیا گیا ہے۔

۷۔ آزاد کتاب گھر والے نسخۂ دیوانِ غالبؔ میں بھی یہ مصرع اِسی طرح ہے مگر اُس میں دوسری جگہ ''آہوے'' ملتا ہے، وہ مصرع یہ ہے: میں دشتِ غم میں آہوے مینا و دیدہ ہوں'' (ص ۸۴)۔

[ماہنامہ ''تحریک'' غالب نمبر شمارہ:۱، جلد:۲۲ دہلی، اپریل ۱۹۷۴ء، ص ۲۵ تا ۵۲]

نوٹ: یہ مضمون پہلی بار اپریل ۱۹۷۴ء میں ماہ نامہ 'تحریک' نئی دہلی میں صفحہ ۲۵ تا ۵۲ پر شائع ہوا۔ اس کے بعد یہ مضمون ''اُردو تحقیق اور مالک رام از شاہد اعظمی''، مکتبہ شاہ راہ، اُردو بازار، دہلی ۱۹۷۵ء، میں ص ۴۵ تا ۱۰۱ تک شائع ہوا۔ رشید حسن خاں نے اس مضمون کو اپنی کتاب ''ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ'' سالِ اشاعت ۱۹۹۰ء، اتر پردیش اُردو اکادمی کے صفحات ۱۴۹ تا ۲۱۲ پر محیط ہے مختصر حذف و اضافے کے ساتھ شائع کیا۔

ooo

غالبؔ کے سلسلے میں تحقیق کے نئے امکانات

یہ عجیب بات ہے کہ ہم جشنِ یادگار تو اس دھوم دھام سے مناتے ہیں کہ عاشق کے جنازے کا سماں سامنے آجاتا ہے، لیکن اُس شخص کی تحریروں کو، جن پر شہرت اور عظمت کا مدار ہے، سلیقے کے ساتھ اور خالص علمی ڈھنگ سے ایک سلسلے میں شائع کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ غالبؔ کی سوسالہ یادگار منائی گئی اور خوب منائی گئی لیکن غالبؔ کی سب کتابوں کو ایک سلسلے میں اصولِ تدوین کی پابندی کے ساتھ چھاپنے کی توفیق نہیں ہوئی، یعنی جو کام سب سے پہلے کرنے کا تھا اُسی کو نظر انداز کر دیا۔ غالبؔ کی تخصیص نہیں یہ ہمارا عام انداز ہے۔ امیر خسروؔ کی یادگار منائی لیکن امیر خسروؔ کی کتابیں نہیں چھاپیں۔ محمد علی جوہرؔ کی یادگار منائی لیکن اُن کا اُردو دیوان تک نہیں چھاپا۔ یا تو وہ نسخہ ہے جو کبھی دہلی سے چھپا تھا اور کسی نے اب اُس کو پھر چھاپ دیا اور اِس بُری طرح کہ اُس کو دیکھ کر خوش مذاقی دردِ سر میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ یا پھر ایک پرانا پاکستانی اڈیشن ہے اور وہ جس کے ہاتھ آگیا ہے اُس نے سرمایۂ بے بہا سمجھ کر محفوظ کر لیا ہے۔

غالبؔ سے متعلق تحقیقی کام تو بہت کچھ ہوا ہے، لیکن اُن کے کلام نظم ونثر کی تدوین کی طرف اُس قدر اور اُس طرح توجّہ نہیں کی گئی جس قدر اور جس طرح توجّہ کی جانی چاہیے تھی۔ اس مرتبے کے دوسرے افراد کی طرح، غالبؔ کے یہاں بھی یہ صورتِ حال پائی جاتی ہے کہ اِن کے کلام کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے، اُن کی شخصیت اور اُن کی زندگی کے احوال سے باخبر ہونا ضروری ہے۔ اِسی طرح اِن کی شخصیت اور زندگی کو سمجھنے کے لیے اُن کے کلام کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ لازم وملزوم کی اِس نسبت کو پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا جاسکا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اِس ضرورت اور اِس تناسب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، مسائل ازسرِنو جائزہ لیا جائے۔

تحقیق کے نئے امکانات اُسی وقت صحیح طور پر سامنے آسکیں گے جب ہم تحقیق اور تدوین کے بنیادی کام کو انجام دے سکیں گے۔ اب تک جو کچھ ہو جانا چاہیے تھا، وہ اُس طرح نہیں ہوا ہے، اِس لیے پہلی ضرورت فی الوقت یہ ہے کہ تحقیق اور تدوین کا جو بنیادی کام ہے اُسے مکمّل کیا جائے۔ جب اِس ادھورے کام کو مکمّل کیا جائے گا تو اُسی دوران میں اور اُس کے نتیجے میں نئے مسائل سامنے آئیں گے اور نئے امکانات نمودار ہوں گے۔ میں پہلے کلامِ غالبؔ کی از سرِ نو تدوین کے مسائل پر گفتگو کروں گا۔

سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ غالبؔ کے مکمّل کلام کو، تدوین کے اصولوں کی مکمّل پابندی کے ساتھ اور مفصّل حواشی اور ضمیموں کے ساتھ، ایک سلسلے میں شائع کیا جائے۔ اردو نظم کی حد تک، ایک تو کلّیاتِ نظم اردو ہو، جس میں سارا اردو کلام زمانی ترتیب کے ساتھ جمع کیا جائے اور اِس کا انداز وہ ہو جو نسخۂ عرشی کا ہے۔ یہ خواص کے کام آئے گا۔ اُن کا متداول دیوان اِس سلسلے کی دوسری جلد کے طور پر مرتّب کیا جائے۔ یہ عام و خاص سب کے کام آئے گا۔ زیادہ مانگ بھی اِسی کی ہے۔ یہ کام بہ ظاہر آسان معلوم ہوتا ہے لیکن ایسا ہے نہیں۔ اِس کے لیے یہ لازم ہوگا کہ پہلے غالبؔ کی خطّی تحریروں کا غور کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور اِس کا قطعی طور پر تعیّن کیا جائے کہ خود غالبؔ نے کس لفظ کو کس طرح لکھا ہے یا وہ کس طرح لکھتے تھے۔ اِس کے لیے اہم لفظوں کی مکمّل فہرست بنانا ہوگی۔ یہی صورت تذکیر و تانیث کے تعیّن کی ہوگی۔ غالبؔ نے متعدّد لفظوں کے املا کے سلسلے میں مختلف مقامات پر اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ میں ایک مثال سے اِس کی وضاحت کرنا چاہوں گا: غالبؔ نے ایک اصلاح کے ذیل میں یہ لکھا ہے کہ جب "وہاں" شعر میں نظم نہ ہو سکے تو "وھاں" بہ ہائے مخلوط افصح ہے۔ اب یہ دیکھا جائے کہ اِس کے خلاف تو کہیں کوئی قول موجود نہیں، اگر معلوم ہو کہ اِس قول کے بعد کوئی دوسرا قول اِس کے خلاف نہیں ملتا تو لازم ہوگا کہ کلامِ غالبؔ میں وہاں اور یہاں کے مخفف کو "یھاں" اور "وھاں" لکھا جائے۔ اگر اِس کے خلاف کیا جائے گا اور "واں" اور "یاں" لکھا جائے گا تو اِس کو لازماً غلط کہا جائے گا۔

یا مثلاً غالبؔ نے لکھا ہے کہ میں "خرشید" واو کے بغیر لکھتا ہوں اور اِس کے مخفّف کو "خور" مع واو لکھتا ہوں تو اب لازم ہوگا کہ کلامِ غالبؔ میں "خرشید" بغیر واو لکھا جائے اور "خور" مع واو۔ اسی طرح اور بہت سے الفاظ کا احوال ہے۔

اگر کوئی شخص اب غالبؔ کا کلام مرتّب کرتا ہے تو ضروری ہوگا کہ پہلے غالبؔ کی خطّی تحریروں کا

تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا جائے، اُن کی اصلاحات کو دیکھا جائے اور اُن کے خطوں کو پڑھا جائے جن میں اِنھوں نے الفاظ کے املا یا قواعد کے سلسلے میں رائے ظاہر کی ہے۔ کلامِ غالبؔ کے جو خطّی نسخے کتاب خانوں میں محفوظ ہیں اور جو غالبؔ کی نظر سے گزرے ہیں، اُن کا جائزہ لیا جائے اور مفصّل یادداشت تیار کی جائے، تب الفاظ کی صحیح صورت نویسی کا مسئلہ حل ہوگا۔ مختلف مطبعوں میں چھپے ہوئے نسخوں میں جو املا ہے وہ اُسی نسخے کے کاتب کا ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ املاے غالبؔ کے مطابق ہو (اور عموماً وہ املاے غالبؔ کے مطابق نہیں ہے)۔ کلّیات کے سلسلے میں ایک بڑا مسئلہ الحاقی کلام کا سامنے آئے گا۔ اب تک ہم نے بڑی مروّت سے کام لیا ہے اور عقیدت کو اپنا رہبر بنایا ہے۔ ہر بیاض ہمارے لیے ایک معتبر صحیفہ ہے اور ہر روزنامچہ بھروسے کے قابل ہے۔ اس طرزِ عمل کے نتیجے میں ہوا یہ ہے کہ غیر معتبر کلام بھی غالبؔ کے نامۂ اعمال میں جگہ پا گیا۔ اب ضرورت اِس کی ہے کہ جب تک قطعی شہادت دستیاب نہ ہو اِس وقت تک ایسے کلام کو کلامِ غالبؔ تسلیم نہ کیا جائے، اُسے مشکوک کلام کے ذیل میں رکھّا جائے۔ جب کوئی شہادت دست یاب ہوگی، اُس وقت اُسے قبول کرلیا جائے گا۔ ہمیں غالبؔ کے ساتھ وہ سلوک نہیں کرنا چاہیے جو یار لوگوں نے امیر خسروؔ کے ساتھ روا رکھا ہے کہ جس بیاض اور جس تذکرے میں اور جہاں بھی خسروؔ کے نام سے جس کسی نے کچھ لکھ دیا ہے اُسے بلا تامّل خسروؔ کے نام لکھ دیا گیا۔ شک نہ کرنا جرح کو بُرا سمجھنا اور عقیدت کا سہارا لینا ہمارا قومی مزاج بن کر رہ گیا ہے، اِس لیے ہمیں مشکل کا احساس نہیں ہو پاتا اور اِس مرحلے پر تحقیق اور منطق دونوں سر پیٹتی رہ جاتی ہیں۔

ایک بڑا مسئلہ خطوط کا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ غالبؔ کے وہ سب خط جواب تک علم میں آچکے ہیں اور بکھرے ہوئے ہیں، اُن کو مرتّب کیا جائے، تاریخی ترتیب سے یا پھر مکتوب الیہم کی نسبت سے۔ خطوں کے کئی مجموعے لوگوں نے مرتّب کیے ہیں۔ حواشی، مقدّمے اور صحتِ عبارت کے لحاظ سے عرشی صاحب کا مرتّب کیا ہوا مجموعہ مکاتیبِ غالبؔ خاصے کی چیز ہے اور اُسے بہ طورِ نمونہ سامنے رکّھا جاسکتا ہے۔ منشی مہیش پرشاد مرحوم، عرشی صاحب اور آفاقؔ دہلوی کے مرتّب کیے ہوئے مجموعوں پر نہایت اہم تبصرے رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں اور محفوظ ہیں، ان کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خطوطِ غالبؔ کی ترتیب کے مسائل کیا ہیں۔ ان تبصروں کی روشنی میں اچھا کام کیا جاسکتا ہے۔ ان خطوط کے ساتھ مفصّل حواشی ہوں جن میں ضروری مباحث آجائیں۔ خطوطِ غالبؔ پر ادھر اُدھر بہت سا کام ہوا ہے، بہت کچھ لکھا

جا چکا ہے۔ ضرورت اِس کی ہے کہ اُن تحریروں کا گوشوارہ تیار کیا جائے اور اِن کے مباحث کو سامنے رکھ کر اِس کام کو مکمّل کیا جائے۔ اِس سلسلے میں اِس کا بھی اہتمام کیا جائے کہ اب تک جن خطوں کی اصل دریافت میں آ چکی ہے اب اُن سے لازماً استفادہ کیا جائے اور عبارت کو درست کیا جائے۔

کلّیاتِ نظم اردو کی طرح یہ مکمّل مجموعہ بھی سب کے لیے نہیں ہوگا، یہاں بھی ضروری ہوگا کہ خطوں کا ایک انتخاب اِس طرح مرتّب کیا جائے کہ غالبؔ کی نثر کی ساری خوبیاں سامنے آ جائیں۔

یہاں واقعات، حالات اور مسائل کی اہمیّت نہیں ہوگی اِس لیے اُن مفصّل حواشی کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہاں صرف محاسنِ نثر کی اہمیّت ہوگی۔ یہ مجموعہ سب کے لیے ہوگا۔ طالبِ علموں کے بھی یہی کام آئے گا اور غالبؔ کی نثر نگاری اور اِن کے اسلوبِ نثر کی نمایندگی بھی اسی سے بہتر طور پر ہو سکے گی۔

فارسی کلّیاتِ نظم کے نام سے وہی نول کشوری نسخہ ہمارے پاس ہے جو پچھلی صدی میں چھپا تھا۔ یا پھر اُسی کی کچھ بدلی ہوئی نقل ہے۔ اِسے بھی نئے ڈھنگ سے مرتّب ہونا ہے۔ اِس کے مفصّل حواشی میں اور چیزوں کے علاوہ اِس کی وضاحت ملنا چاہیے کہ غالبؔ نے کس قصیدے کو پہلے کس کے لیے لکھا تھا اور پھر ضرورت پڑنے پر کسی اور کا نام اُس میں ڈال دیا۔ ایسے کئی قصیدے ہیں۔ اختلافِ متن کا عالم بھی دیکھنے دکھانے کے قابل ہے۔ یا مثلاً یہ کہ مثنوی بادِ مخالف کی پہلی روایت اور موجودہ مطبوعہ صورت میں کس قدر فرق ہے۔ ایسی ہی اور دل چسپ ضروری بحثیں۔ یہ کام بھی صبر آزما ثابت ہوگا اور اِس میں اچھا خاصا وقت لگے گا۔

فارسی نثر میں سب سے اہم چیز دستنبو ہے۔ اِس کے متن کو ضروری حواشی اور مفصّل مقدّمے کے ساتھ ایک جلد میں چھاپا جائے۔ اچھا یہ ہوگا کہ اِسی جلد میں اِس کا اردو ترجمہ بھی شامل ہو۔ یہ بھی ضروری کام ہے۔ عام لوگ اِس کی مشکل فارسی سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے۔ اِس کے مفصّل مقدّمے میں غالبؔ کے اِس دعوے کا بھی جائزہ لیا جائے کہ اِس میں کوئی عربی لفظ نہیں ہے۔ اِس سلسلے میں بہت کچھ لکّھا جا چکا ہے، اُس کو سامنے رکھنا چاہیے۔ پھر غدر کے حالات کے سلسلے میں اِس کی واقعی اہمیّت پر اور اِس پر بحث ہونا چاہیے کہ غالبؔ نے کیا واقعی اِس کو بہ طورِ روزنامچہ لکھا تھا؟ اور اِنھی دنوں لکھا تھا جب وہ گھر میں قید تھے۔ غالبؔ کے اِن بیانات کو موجودہ معلومات کی روشنی میں پرکھنے کی ضرورت ہے۔ دستنبو کے دو اردو ترجمے چھپ چکے ہیں، نظرِ ثانی کے بعد اِن میں سے کسی کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

برہانِ قاطع کی بحث اورمعرکے کے سلسلے میں رسائل کوایک جلد میں ہونا چاہیےاور یہ چھپ چکے ہیں،مرتّبہ قاضی عبدالودود صاحب۔لیکن یہ ناتمام کام ہے،کیوں کہ اصل چیز اِس کے حواشی تھے جن کودوسری جلد میں آنا تھا۔وہ کام نہیں ہوا۔قاضی صاحب اب اُسے کربھی نہیں سکتے۔مجھے تعجب تو اِس پر ہے کہ یہ جلداوّل بھی کیسے چھپ گئی۔قاضی صاحب ہم سب کے مخدوم ہیں لیکن اب تک کا تجربہ اِس پر گواہ ہے کہ قاضی صاحب کوئی مکمّل اور مفصّل کتاب نہ لکھ سکتے ہیں نہ مرتّب کر سکتے ہیں البتہ مضامین کی صورت میں وہ معلومات کاانبارلگادیں گے۔اِسی جلد کے حواشی کے سلسلے میں بھی یہی صورت ہے کہ مختلف مضامین کی صورت میں اِنھوں نے گویاسارے حواشی لکھ دیے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ اِس طرح لکھے ہیں کہ اب کوئی دوسرا کیا لکھے گا۔یہ حواشی معلومات کا گنجینہ ہیں اور اُن پر اضافہ بہت مشکل ہے۔ضرورت اِس کی ہے کہ یا تواُنھی مضامین کوضروری کتر بیونت کے بعد کتابی صورت میں مرتّب کردیا جائے یا اِن کی مدد سے ازسرِنو کچھ لکّھا جائے۔اِس سلسلے میں میرے محترم ڈاکٹر نذیر احمد مناسب ترین فرد ہوں گے۔ فارسی زبان اور لُغت کے مسائل پر قاضی صاحب کے بعد پروفیسر نذیر احمد سے بہتر شاید ہی کسی کی نظر ہو۔اس طرح برہانِ قاطع کی بحث سے متعلّق جو رسائل ہیں وہ دو جلدوں میں مکمّل ہو جائیں گے اور اِس سے بہت مدد ملے گی یہ سمجھنے میں کہ فارسی زبان وادب اور لغت وقواعدِ زبان کے متعلّق غالبؔ کی معلومات کااحوال کیاتھااوراُن کی روش اِس سلسلے میں کیاتھی ایک جلد میں باقی نثری سرمایہ سما سکتا ہے۔

غالبؔ کی زندگی کے حالات،اُن کی شخصیت،اُن کا عہداور اُن کااسلوب،یہ چار اہم باب ہیں جن کے لیے ابھی تحقیق کو بہت سا کام کرنا ہے۔پہلی ضرورت یہ ہے کہ غالبؔ کی ایک نئی مفصّل سوانح عمری لکّھی جائے،جس میں صحیح واقعات ہوں کمی بیشی کے بغیر،اور جس میں اُن عوامل اور محرکات کا جائزہ لیا جائے جو زندگی کے اہم واقعات اور شخصیت کے پیچ وخم کی بنیاد بنے ہوں۔اِن کی زندگی کے سادہ واقعات کو یکجا کردینا اور اُن واقعات کی تاریخوں کا تعیّن کر دینا کافی نہیں۔یہ سطحی کام ہے،اِس میں اکہراپن ہے۔محض واقعات کا روزنامچہ لکھنا سوانح نگاری کا اعلا معیار نہیں۔شیخ اکرام اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم نے اِس سلسلے میں قابلِ قدر کام کیا ہے لیکن ناتمام ہے۔اجزا بکھرے ہوئے ہیں، مرقّع نہیں بن پایا ہے اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں حضرات نے مکمّل سوانح لکھنے کا خاکہ نہیں بنایا ہے۔ہاں اِن لوگوں کے یہاں بہت سا مواد یکجا ہو گیا ہے اور تحلیل وتجزیے کا قابلِ قدر انداز ہم کو مل جاتا

ہے۔ اِس سلسلے میں بہت اچّھے مضامین بھی لکھے گئے ہیں اِن سب کو سامنے رکھ کر ایک مکمّل سوانح عمری مرتّب کی جانا چاہیے۔ اِس نئی سوانح عمری میں ایسے سب واقعات اور ایسی سب روایتوں کی واضح انداز میں چھان بین کی جانا چاہیے جن پر شک وشبہے کا اظہار کیا گیا ہے، مثال کے طور پر عبدالصمد کا مسئلہ۔ کیا وہ غالب کے مخلوقِ ذہنی کی حیثیت تو نہیں رکھتے تھے۔ غالب کا یہ دعوا کہ میں ترکِ ایبک اور افراسیابی ہوں۔ اِس پر شک کا اظہار کیا گیا ہے۔ غالب کے والد کا کچھ زیادہ احوال معلوم نہیں، اِس کا امکان ہے کہ حیدرآباد کے کسی پرانے دفتر میں تلاش کرنے پر کچھ مزید معلومات حاصل ہو سکے۔ غالب کے حالات کے ذیل میں بہت سی روایتیں ایسی ملتی ہیں جو مشکوک معلوم ہوتی ہیں۔ بعض کے متعلّق شک کا اظہار کیا بھی گیا ہے، مثلاً صفیر بلگرامی کے بعض بیانات یا دربار اور خلعت کے متعلّق غالب کے اپنے بیانات۔ قاضی عبدالودود کا مفصّل مقالہ جو بین الاقوامی غالب سمینار (مرتّبہٗ یوسف حسین خاں) میں شامل ہے، اس میں ایسی متعدّد روایتوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اِس نئی کتاب میں ایسی سب مشکوک اور غیر معتبر روایتوں پر مفصّل بحث ہونا چاہیے۔ سفرِ کلکتہ کے متعلّقات اور دہلی میں سسرالی عزیزوں کے تعلّقات کی صحیح نوعیت بھی ابھی تفصیل طلب ہے۔ زمانۂ قید میں غالب کے ساتھ سسرالی عزیزوں کا جو سلوک بیان کیا جاتا ہے کیا یہ اُسی زمانے میں تھا یا شروع ہی پست و بلند کا احساس کارفرما تھا۔

غالب کے یہاں آخر اِس قدر تضاد کیوں کارفرما تھا، مثلاً وہ ہندستان کے فارسی لُغت نویسوں کو مستند ماننے کے لیے تیار نہیں، لیکن خود بلاتکلف حالی اور شیفتہ کو سند میں پیش کرتے ہیں اور اِس میں ان کو قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ اِس طرح کے بہت سے واقعات ہیں۔ اُن کے حالاتِ زندگی کے ذیل میں ذہنی نشوونما کا جائزہ لیا جانا بھی ضروری ہے۔ اِس کے بعد زندگی کے حالات نامتمام رہیں گے کیوں کہ اصل اسباب نظروں کے سامنے نہیں آپائیں گے۔

دوسرا موضوع عہدِ غالب ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ایک علاحدہ کتاب دہلی میں کارفرما اُس عہد کے تاریخی، تہذیبی، ادبی، معاشی اور معاشرتی حالات پر حاوی ہو، یہ پانچ باب ہوئے۔ اِس کتاب کی مدد سے غالب کے ذہنی پس منظر کو سمجھنے میں مدد مل سکے گی۔ اِس سلسلے میں کچھ نہ کچھ تو لکھا گیا ہے لیکن مختلف لوگوں کے منتشر مضامین کی صورت میں یہ سب بکھرا ہوا ہے۔ مستقل کتاب کا خاکہ بنا کر اور حدود کا تعیّن کر کے اِس کام کو مکمّل کیا جانا چاہیے۔ ہمارے یہاں تنقیدی مضامین کے مجموعے تو بہت ہیں، موضوع کی

پابندی سے مستقل کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ حدود کا تعیّن کر کے، مربوط اور مسلسل کام کرنے کی عادت ذرا کم ہے۔ مختلف مضامین کتنے ہی اچھے ہوں، وہ نقشِ ناتمام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ ٹکڑوں میں بٹ کر اصل نقش بکھر جاتا ہے اور بگڑ بھی جایا کرتا ہے۔ غالبؔ کی شاعری میں تہ نشیں عناصر، اِن کے بہت سے خطوط کے صحیح مفاہیم، اُن کی ادبی اور لسانی بحثیں، انکار، اصرار اور ضد کے عناصر، اِن سب کے محرکات کو سمجھنے میں اِس کتاب سے صحیح معنی میں قابلِ قدر مدد ملے گی۔

''جہانِ غالب'' کے عنوان سے قاضی عبدالودود صاحب نے ایک قابلِ قدر سلسلہ شروع کیا تھا۔ غالبؔ کے کلام نظم و نثر میں جن افراد کا ذکر آیا ہے اُن پر مختصر لیکن ضروری معلومات پر مشتمل یادداشتیں لکھی گئی ہیں۔ تحقیق کے نقطۂ نظر سے یہ اعلا درجے کا کام ہے۔ اِس ضمن میں بہت سے واقعات بھی زیرِ بحث آ گئے ہیں۔ اِس کی غالباً دس بارہ قسطیں چھپ چکی ہیں۔ اِس سلسلے کا زیادہ کام ہو چکا ہے، کم کام باقی ہے۔ جتنی قسطیں اِس سلسلے کی چھپ چکی ہیں، اُن کو یک جا کر لیا جائے اور جو کام رہ گیا ہے، اُس کا اضافہ کر دیا جائے۔ اِس طرح ایک بہت ضروری کتاب مرتّب ہو جائے گی۔ یہ اپنے انداز کی منفرد کتاب ہوگی اور کلامِ غالبؔ کے بہت سے مقامات اور بہت سے واقعات کو سمجھنے میں اِس سے قیمتی مدد ملے گی۔

غالبؔ پر بہت لکھا گیا ہے ان میں مستقل کتابیں بھی ہیں اور مضامین بھی۔ یہ سرمایہ اتنا زیادہ ہے کہ کسی شخص کے لیے یہ معلوم کرنا یا یاد رکھنا مشکل اور بہت زیادہ مشکل ہے کہ کیا کیا لکھا جا چکا ہے یا یہ کہ کس نے کیا لکھا ہے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ''اشاریۂ غالب'' کے عنوان سے ایک مبسوط کتاب مرتّب کی جائے، جس میں ضروری تفصیل کے ساتھ غالبؔ سے متعلّق مناسب مضامین اور کتابوں کی نشان دہی کی جائے۔ اور اِس کو کتاب خانوں کی وضاحتی فہرستوں کے انداز پر مرتّب کیا جائے جن میں ضروری تفصیلات کو یکجا کر دیا جاتا ہے۔ چھوٹے پیمانے پر ہندستان میں کئی افراد نے اِس کام کو کیا ہے، لیکن بعض کام ناتمام ہیں اور بعض غیر معتبر۔ نئے اور پرانے رسائل بے طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ اُن سب کو بہ چشمِ خود دیکھ کر یادداشتیں تیار کرنا بہت دقّت طلب اور صبر آزما کام ہے اور اچھا خاصا وقت بھی اِس کے لیے درکار ہے۔ اِسی لیے اب تک بہت ضروری کام نہیں ہو سکا ہے۔ کسی ذہین اور محنتی طالبِ علم کو مناسب وظیفہ دے کر یہ کام کرایا جا سکتا ہے۔ مناسب نگرانی اور رہ نمائی کے تحت یہ، کام سال ڈیڑھ سال یا دو سال کے عرصے میں مکمّل کیا جا سکتا ہے۔ اور باتوں کے علاوہ تحقیق پر کام کرنے والوں کو اِس

اشاریے سے بہت مدد ملے گی اور یہ معلوم ہو سکے گا کہ کیا کیا ہو چکا ہے اور صحیح معنی میں یہ بھی طے کیا جا سکے گا کہ اور کیا ہونا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ کوئی ایک اندراج بھی نقلِ محض پر مبنی نہ ہو۔ ہر مضمون کو بہ چشمِ خود دیکھا جائے اور تب اِسی کے مندرجات کی نشان دہی کی جائے۔

اِسی قبیل کا ایک اور کام ہے اور اِس کو ''اشاریۂ کلامِ غالب'' کا عنوان دیا جا سکتا ہے۔ غالبؔ کے اردو اور فارسی کلام میں بہت سے مفرد اور مرکّب لفظ، خود اِن کے الفاظ میں ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' ہیں، خاص کر وہ جن کی مدد سے وہ استعارے تراشتے ہیں یا جن کے تلازموں کی مدد سے وہ خیال کو وسعت دیتے ہیں۔ ایسے الفاظ کا اشاریہ تیّار کیا جائے، مثلاً کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہیے کہ طاؤس یا آئینہ یا قفس یا آشیانہ یا برق یا ایسے دوسرے خاص خاص لفظوں کو غالبؔ نے کس کس طرح استعمال کیا ہے اور اِن کی مدد سے کون کون سے عکس ابھارے اور پیکر تراشے ہیں تو اُس کو بہ یک نظر یہ بات معلوم ہو سکے۔ اِس طرح کہ مثلاً لفظ طاؤس کے ذیل میں اِن سب اشعار کو یکجا کر دیا جائے جن میں یہ لفظ کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس سے غالبؔ کے رنگِ بہار ایجادی کی تفصیلات کو اور مختلف نقوش کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور اِن کے اندازِ فکر پر روشنی پڑے گی۔

اِس طرح غالبؔ کے یہاں ترکیبوں کا خاص عالم ہے۔ اِن ترکیبوں نے اُن کے اشعار میں تہ داری کا اضافہ کیا ہے۔ یہ ترکیبیں صحیح معنی میں گنجینۂ معنی کا طلسم'' ہیں، خاص کر وہ ترکیبیں جو دو سے زیادہ الفاظ سے مل کر بنی ہیں۔ کلامِ غالبؔ میں بیان کی سطح پر ایسی ترکیبوں نے نئے پن کے رنگ کو چمکایا ہے اور مفہوم کو وسیع الذیل بنانے اور اُس میں کئی تہوں اور پرتوں کا اضافہ کرنے میں مدد کی ہے۔ غالبؔ کے اسلوب کی تشکیل میں بھی ان کا خاصا حصّہ ہے۔ دہلی یونی ورسٹی کی طرف سے غالبؔ کی ترکیبوں پر مشتمل ایک مجموعہ شائع ہوا تھا، لیکن اِس کی حیثیت محض نقشِ اوّل کی ہے۔ اِس کام کو اب ازسرِ نو ہونا چاہیے۔ اُسلوبیات کے نقطۂ نظر سے مفرد اور مرکّب الفاظ کے اشاریے پر مشتمل یہ مجموعہ بہت کارآمد ثابت ہوگا۔

غالبؔ کے اسالیبِ نظم و نثر پر اب تک کوئی ڈھنگ کا کام نہیں ہوا ہے، بھرپور اور جامع۔ ایک مستقل جلد کا یہ سرمایہ ہے۔ اِس سلسلے میں کئی اہم سوالات زیرِ بحث آئیں گے۔ یہ مسلّم ہے کہ وہ اردو نثر اور نظم دونوں میں صاحبِ طرز تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ فارسی میں بھی صاحبِ طرز تھے؟ یہ دل چسپ بات ہے کہ وہ کسی خیال کو اردو میں ادا کرتے ہیں تو اُس کا عالم اور ہوتا ہے اور اُس میں نیا پن محسوس ہوتا

ہے۔ جب اُسی بات کو فارسی میں کہتے ہیں تو حُسن تو قائم رہتا ہے، دل کشی بھی کارفرما رہتی ہے، لیکن نئے پن کا اُس طرح احساس نہیں ہوتا۔ اِس سوال پر مفصّل بحث کرنا ہوگی کہ کیا یہ درست ہے؟ اگر درست ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں؟ بیدلؔ کا اثر اِن پر رہا، وہ خود بھی اِس کے قائل تھے لیکن یہ اثر اردو شاعری تک محدود رہا۔ فارسی شاعری پر بیدلؔ کے اثرات یا تو نظر ہی نہیں آتے یا اِس طرح نہیں ملتے۔ ایسا کیوں ہے؟ اِس سوال پر بھی مفصّل بحث کرنا ہوگی۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ غالبؔ نے آسان اردو میں خط لکھنا آخر کیوں شروع کیا۔ فارسی میں جس انداز سے خط لکھتے تھے، وہی انداز یہاں بھی کیوں نہیں رہا، جب کہ اردو میں اُس انداز میں شعر کہنے میں اِنھیں تکلّف نہیں ہوتا تھا۔ یہ کن اثرات کا نتیجہ تھا۔ کیا فورٹ ولیم کالج کے اثرات تھے؟ کیا بدلتے ہوئے احساس نے یہ نمایاں تبدیلی پیدا کی؟ یا یہ بات تھی کہ پہلے تو وہ یہ خیال کرتے تھے کہ فارسی جیسا انداز اردو میں کہاں سے آئے گا، اِسی لیے بے دلی سے آغازِ نگارش ہوا لیکن کچھ دنوں کے بعد یہ محسوس ہوا کہ اِس میں تو نیا پن ہے ایسی امتیازی شان ہے جو اور کہیں نہیں ملتی۔ نئے پن اور امتیاز پر تو وہ جان دیتے تھے۔ جب اِس کا احساس ہوا تو اُسے اپنی روشِ خاص قرار دیا۔

یہ سوال کہ اردو نثر میں اُن کا اسلوب کن اجزا سے مرکّب ہے اور اردو نظم میں جو اِن کا طرزِ خاص ہے اِس میں اور اِس اسلوب میں کتنے عناصر مشترک ہیں اور کون سے عناصر مختلف ہیں، یہ سوال مفصّل بحث کا مستحق ہے۔ فارسی نظم اور نثر میں اُن کا انداز خوب ہے لیکن وہاں یہ انداز، اسلوب کے درجے کو نہیں پہنچ سکا ہے، جب کہ شخصیت ایک ہے اور فارسی نظم ونثر کا سرمایہ اردو کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اگر اسلوب میں شخصیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے تو یہاں یہ اختلاف کیوں ہے۔

غرض یہ ہے کہ تفصیل کے ساتھ اِس کا جائزہ لیا جائے کہ اردو نثر میں اُن کا اسلوب کیا ہے اور وہ کن اجزا سے مرکّب ہے۔ نظم میں اُس کا عالم کیا ہے۔ فارسی نثر میں جو اُن کا انداز ہے، اِس کی کیا حیثیت ہے اور فارسی نظم میں کیا احوال ہے، فارسی اور اردو کے لحاظ سے اسلوب اور انداز کا جو فرق ہے اِس کی حیثیت کیا ہے۔ یہ گویا چار فصلیں ہوئیں اسلوب کے بیان میں۔

ایک مفید اور ضروری کام یہ ہے کہ غالبؔ کی جو خطّی تحریریں مختلف کتاب خانوں میں بکھری ہوئی ہیں، اِن سب کے عکس کتابی صورت میں شائع ہوں۔ یہ اِس لیے بھی ضروری ہے کہ کلامِ غالبؔ کی تدوین وترتیب کے سلسلے میں اِس سے بہت مدد ملے گی۔ تصحیح عبارت میں بھی اور املاے غالبؔ کے تعیّن کے سلسلے میں بھی۔ جب تک غالبؔ کی خطّی تحریروں کا مجموعی طور پر اور زمانی ترتیب کے لحاظ سے مطالعہ

نہیں کیا جائے گا، املاے غالبؔ کے سلسلے میں صحیح نتیجے نہیں نکالے جا سکیں گے۔

اِسی طرح ایک اہم کام یہ ہے کہ کلامِ غالبؔ کے جو اہم خطّی نسخے مختلف کتاب خانوں، خاص کر رام پور میں ہیں، اِن سب کے عکس کتابی صورت میں شائع ہوں۔ دیوانِ غالبؔ اگر آج کوئی شخص مرتّب کرنا چاہے تو یہ مشکل اُس کے راستے میں آئے گی کہ ان خطّی نسخوں سے کس طرح استفادہ کیا جائے؟ پاکستان سے نسخۂ شیرانی کا عکس کتابی صورت میں شائع ہوا تھا اِسی انداز پر باقی نسخوں کے عکس جوں کے توں چھاپ دیے جائیں، اِس سے تدوین کا کام کرنے والوں کو بہت مدد ملے گی۔ احتیاط اور سلیقے سے کام لیا جائے تو یہ سب عکس زیادہ سے زیادہ دو جلدوں میں سما جائیں گے۔

اس فہرست میں اور بھی اضافے کیے جا سکتے ہیں لیکن اُن سے قطع نظر کرتا ہوں۔ توقّع ہو یا نہ ہو تمنّا ضروری ہے کہ یہ سب کام یا اِن میں سے زیادہ کام ہو جائیں۔ جب یہ کام ہو جائیں گے تب مطالعے کے راستے میں زیادہ روشنی پھیلے گی اور اُس روشنی میں اور بھی امکانات نظر آئیں گے۔ میں ایک بار پھر یہ عرض کروں۔ سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ کلامِ غالبؔ کی ازسرِ نو تدوین ہو اور غالبؔ کے شایانِ شان ایک سلسلے میں یہ سب کتابیں شائع ہوں، یہ بنیادی کام ہے۔ اگر ہم اِس بنیادی کام ہی کو نہیں کر سکے تو پھر نئے امکانات کی تلاش اور بحث مباحثہ سب فضول ہے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ ہم سب کہتے ہیں کہ غالبؔ کے خط، اردو نثر کی آبرو ہیں۔ لیکن کوئی شخص پوچھ بیٹھے کہ کیا ہندستان میں خطوطِ غالبؔ کا کوئی مکمّل اور مستند مجموعہ شائع ہوا ہے تو اِس کے سوا کہ شرمندگی کے عالم میں سر جھک جائے اور آنکھیں نیچی ہو جائیں، اور کیا ہوگا! اگر اِس ادارے کی طرف سے یہی کام ہو جائے کہ غالبؔ کا مکمّل کلام ایک سیریز میں اصولِ تدوین کی پابندی کے ساتھ شائع ہو جائے تو بہت بڑا کام ہوگا۔ غالبؔ کے کام پر سوداگری تو بہت کی گئی ہے، اگر ہم خفیف الحرکاتی اور آسان پسندی سے کچھ دیر کے لیے قطعِ تعلّق کر کے تھوڑا سا کام بھی کر لیں تو ایسی کچھ بے جا بات نہیں ہوگی۔

(شش ماہی ''غالب نامہ'' جنوری ۱۹۸۱ء، جلد: ۲، شمارہ: ۱، ص ۱۱۸ تا ۱۲۷)

ooo

غالبؔ سے متعلّق کچھ مطبوعات

اِس سال فروری میں مرزا غالبؔ کی سو سالہ یادگار منائی گئی اور بہت دھوم دھام کے ساتھ منائی گئی۔ پُرشکوہ جلسے منعقد ہوئے، پُرشور مشاعرے برپا ہوئے، اور نہ معلوم کیا کیا ہوا۔ حکومتِ ہند نے فراخ دلی کے ساتھ سرپرستی کی اور بعض دوسرے سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں نے بھی اِس سلسلے میں حسبِ توفیق حصہ لیا۔ اِس موقعے پر روایت کے مطابق، اُردو کے اکثر مقتدر رسالوں نے غالبؔ نمبر شائع کیے، کچھ کتابیں بھی شائع ہوئیں، لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ خود کلامِ غالبؔ کے مکمّل صدی اڈیشن کو آج بھی آنکھیں ترستی ہیں۔ کیا دنیا کا کوئی شخص اِس بات کو مان سکتا ہے کہ ایک ایسا شاعر، جس کو اُردو کا عظیم شاعر کہا جاتا ہے، جس کی یادگار منانے کے لیے گویا زمین کی طنابیں کھنچ گئیں، اُس کی یادگار کا جلوس تو اس دھوم سے نکالا گیا، جیسے عاشق کا جنازہ ہو، لیکن اُس کے مکمّل کلام کو تدوین و تحقیق کے آداب کے ساتھ ایک سیریز میں شائع نہیں کیا جا سکا۔

غالبؔ کے خطوط، اُردو نثر کی آبرو ہیں، بجا و درست، لیکن اگر کوئی شخص یہ پوچھے کہ کیا اُن کے خطوں کا کوئی مستند مکمّل مجموعہ شائع ہوا ہے؟ تو کسی کو یارائے جواب نہیں ہوگا۔ فارسی کلام، جس پر مرحوم، فخر کرتے کرتے اِس دنیا سے اُٹھ گئے، اُس کا بھی یہی حال ہے۔ وہی لے دے کے نول کشوری نسخہ، آگے آیت۔ کلام کی تدوین کے ساتھ ساتھ دوسرا اہم کام یہ تھا کہ غالبؔ کے عہد سے متعلّق وہ ساری تفصیلات یکجا کر دی جائیں، جن کو پیشِ نظر رکھے بغیر، بہت سے اُمور کو صحیح طور سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ اِن میں سیاسی حالات، ادبی روایات، تہذیبی ماحول، سبھی کچھ شامل ہے۔ کلامِ غالبؔ میں مقامات، افراد، کتب، واقعات

اور ایسے ہی دیگر عنوانات کے تحت جو کچھ مذکور ہے اُس کا توضیحی اشاریہ تیار رہوتا، پھر باقی دھوم دھام ہوتی، ہم نے اُلٹی گنگا بہائی۔ ہم جس طرح تنقید کو انشائیہ بنا کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ تنقید کا حق ادا ہو گیا، اُسی طرح جلسے اور مشاعرے کر کے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اعتراف و پرستش کے سارے مرحلے طے ہو گئے۔

غالبؔ کے سلسلے میں اگر چہ یہ بنیادی کام نہیں ہو سکا، لیکن بعض اور کام ضرور ہوئے ہیں۔ کچھ اچّھی کتابیں اور مضامین بھی سامنے آئے ہیں۔ یادگار کے سلسلے میں شائع ہونے والی کچھ کتابوں اور رسائل کے خاص نمبروں کا ذیل میں ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۹۵۸ء میں محترمی عرشی صاحب کا مرتّب کیا ہوا دیوانِ اردو شائع ہوا تھا۔ موصوف اب اُس کو مکمّل نظرِ ثانی کے بعد شائع کرنا چاہتے تھے۔ خیال یہ تھا کہ یہ نظرِ ثانی شدہ نسخہ، غالبؔ کے اردو کلام کا مستند اور مکمّل مجموعہ ہوگا، لیکن اُن کی ناوقت علالت نے تاخیر کا سامان مہیّا کر دیا اور اب معلوم نہیں وہ کب شائع ہوگا۔ اِس موقعے پر خیال یہ تھا کہ یادگارِ غالب کے سلسلے میں جو مرکزی کمیٹی ہے، اُس کی طرف سے اور کچھ نہ سہی، غالبؔ کے اردو کلام کا تو ایک مکمّل اور مستند مجموعہ ضرور شائع ہوگا۔ یہ تو ہوا نہیں، اِس کے بجائے دیوانِ غالب کے نام سے اردو کلام کا ایک مجموعہ شائع کیا گیا ہے، جس پر بہ حیثیتِ مرتّب مالک رام صاحب کا نام درج ہے۔ مرتّب نے صراحت کر دی ہے کہ ۱۸۶۲ء میں نظامی پریس کان پور سے، غالبؔ کا جو اردو دیوان شائع ہوا تھا، اُس کو بعض املائی تغیرات اور سولہ اشعار کے اضافے کے ساتھ، اب پھر شائع کیا گیا ہے۔ [یہ نسخہ غالبؔ کے کُل کلام پر حاوی نہیں] موصوف نے اِس کا اظہار نہیں کیا کہ یہ نسخہ کچھ پہلی بار شائع نہیں ہو رہا ہے، وہ خود اس کو اِس سے پہلے دو بار شائع کرا چکے ہیں، پہلی بار ۱۹۵۷ء میں اور دوسری بار ۱۹۶۰ء میں۔ فرق بس اتنا ہے کہ اُن دونوں اشاعتوں میں شروع میں مفصّل مقدّمہ ہے، حواشی میں اختلافِ نسخ بھی ہے، اور آخر میں دو عنوانات کے تحت، غالبؔ کے اردو کلام کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ اِس صدی اڈیشن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مفصّل مقدّمہ نکال دیا گیا ہے۔ اِس کے بجائے پونے دو صفحے کا پیش لفظ شامل کیا گیا ہے۔ اختلافِ نسخ کو بھی خارج کر دیا گیا ہے اور آخر میں جس کلام کا اضافہ کیا گیا تھا، اور جس کے سبب سے اُس میں جامعیّت کا ایک انداز آ گیا تھا، اُس کو بھی حذف کر دیا گیا ہے۔ البتہ سولہ اشعار کا اضافہ کیا گیا ہے، یہ بتائے بغیر کہ ان اشعار کے اضافے کی وجہ کیا ہے، اور یہی سولہ اشعار کیوں اِس قابل سمجھے گئے۔ گویا وہی پُرانا نسخہ، اب تیسری بار شائع کیا گیا ہے،

جو پہلی اشاعتوں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے نامکمّل ہے اور اصولِ تدوین کے اعتبار سے قابلِ اعتراض۔ اورعدم صراحت کی وجہ سے جس کے متعلّق عام لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ پہلی بار شائع ہوا ہے۔ تحقیق کا کام، مغالطوں کو ختم کرنا ہے، پیدا کرنا نہیں۔

تدوین کے آداب اب متعیّن ہو چکے ہیں، اور اب کسی قدیم شاعر کے کلام کو اُن کی پابندی کے بغیر شائع کرنا، قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ اِس میں سب سے اہم حیثیت اختلافِ نسخ کی ہے۔ اِس کے بغیر، یہی نہیں کہ تدوین کے مسلّمہ طریقے کی خلاف ورزی ہوگی، بہت سے مقامات پر پڑھنے والوں کے لیے سخت اُلجھن پیدا ہو جائے گی۔ قدیم نسخے بالعموم لوگوں کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں، اِس لیے ایسی اُلجھنیں اور زیادہ شک میں مبتلا کر دیا کرتی ہیں۔ یا پھر اِس کی صراحت کر دی جائے کہ تدوین کے اصولوں کی پابندی نہیں کی گئی ہے، اور یہ اُس نوعیّت کا کام نہیں ہے، اِس کی نوعیّت مختلف ہے، تا کہ دیکھنے والے، اُس معیار سے اُس کو نہ جانچیں اور پڑھنے والے اُس خیال سے پڑھیں۔

مرتّب نے اِس کی بھی وضاحت نہیں کی ہے کہ اِس موقعے پر اِس اشاعت کا جواز کیا ہے۔ اگر مراد یہ ہے کہ نسخۂ نظامی پریس سامنے آجائے جو مرتّب کی نظر میں مستند ترین نسخہ ہے، سو وہ تو اِس سے پہلے دو بار شائع ہو چکا تھا۔ اور اگر مقصد یہ ہے کہ ایک خاص نسخے کو تدوین و ترتیب کے آداب کے ساتھ پیش کیا جائے، تو یہ مقصد بھی پورا نہیں ہوا، کیوں کہ تدوین کے مسلّمہ اصولوں اور طریقۂ کار کو ملحوظ ہی نہیں رکھا گیا ہے۔

کسی بھی اچھے تنقیدی اڈیشن کے لیے ضروری ہے کہ اختلافِ نسخ کے ساتھ ساتھ مفصّل مقدّمہ بھی شاملِ کتاب ہو، جس میں اصولِ تدوین اور طریقۂ کار کے متعلّق وضاحت کی جائے، تا کہ پڑھنے والا اُس کی روشنی میں کتاب کو پڑھے اور خود مرتّب کرنے والا بھی اُن کی مکمّل پابندی کے لیے مجبور ہو۔ اِس کے بغیر خود مرتّب کی ذمّے داری اپنا کام انجام نہیں دے سکتی اور یہ نسخہ اِس اہم ترین چیز سے خالی ہے۔ صرف ڈیڑھ پونے دو صفحے کا پیش لفظ ہے، جس سے اِس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ نسخۂ نظامی پریس کان پور کو اب پھر پیش کیا جا رہا ہے۔ مفصّل جائزے کا یہ محل نہیں، اجمالاً چند اشارے کیے جاتے ہیں:

اختلافِ نسخ کا نہ ہونا، نہ صرف یہ کہ اصولِ تدوین کے خلاف ہے، نسخ کے نہ ہونے سے کس قسم کی مشکلیں پیدا ہوسکتی ہیں، اُن کی صرف تین مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا:

(۱) کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناسپاس ہیں (ص ۱۰۳)۔ نسخۂ عرشی میں یہ صرف اِس طرح ہے:

ع: کیا وہ بھی بے گنہ کش وحق ناشناس ہیں (ص ۱۹۶)۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں غالبؔ کی ترمیم ہے، کاتب کی اصلاح ہے یا مرتّب کی لغزشِ قلم ہے۔ ہر ایک کا امکان ہے۔

(۲) ع: غم گیتی سے مرا سینۂ اَمر کی زنبیل (ص ۲۰۰)۔ یہ ''اَمَر'' کیا ہے۔ نسخۂ عرشی میں یہاں ''عُمَر'' ہے، گویا یہ مومنؔ کے ''شُمَر'' جیسا تصرّف ہے۔ [ع: محبّ حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا]۔ جب تک صراحت نہ ہو، بات صاف نہیں ہوگی۔

(۳) غالبؔ کی ایک مشہور رباعی ہے، جس کا دوسرا مصرع ساقط الوزن ہے۔ وہ مصرع یہ ہے: دم رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالب۔ مولانا عرشی نے یہ صراحت کردی ہے کہ تمام نسخوں میں ''رُک رک کر'' ہے (نسخۂ عرشی، ۴۶۳)۔ اِس دیوان میں یہ مصرع اِس طرح درج کیا گیا ہے: ع: دل رُک کر بند ہو گیا ہے غالب (ص ۲۱۲)۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مولانا عرشی کا قول صحیح ہے کہ تمام نسخوں میں ''رُک رُک کر'' ہے، تو نسخۂ نظامی پریس میں بھی اِسی طرح ہوگا۔ اگر ایسا ہے تو اِس ترمیم کا مرتّب کو کیا حق پہنچتا ہے؟ بہ صورتِ دیگر، جب تک اختلافِ نسخ میں مکمّل صراحت نہ ہو، اُس وقت تک پڑھنے والا اُلجھن بل کہ تشکیک کا شکار رہے گا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرتّب نے غالبؔ کے املا کے بجائے، نسخۂ نظامی پریس کے کاتب کے املا کو مستند اور مرجّح سمجھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ لفظوں کی عجیب عجیب شکلیں سامنے آتی ہیں۔ پڑھنے والا اِن سب کو غالبؔ کا املا سمجھے گا، حالاں کہ ایسا ہے نہیں۔ مرقّعِ غالب (مرتبہ پرتھوی چند) میں غالبؔ کے بہت سے خطوں کے عکس چھپے ہیں، عرشی صاحب نے مکاتیبِ غالب میں اِس پر تفصیل سے لکّھا ہے، اِن کی مدد سے غالبؔ کے املا کا بہ آسانی تعیّن کیا جاسکتا تھا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ یہاں اِس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ املا کے معاملے میں خود غالبؔ کے یہاں مکمّل التزام نہیں پایا جاتا۔ بعض الفاظ کا املا وہ خود صریحاً غلط لکّھا کرتے تھے (عرشی صاحب نے اِس کی بھی صراحت کی ہے)۔ بعض الفاظ کو دو طرح اُنھوں نے لکّھا ہے۔ بعض الفاظ میں آخر زمانے میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔ اب ہونا یہ چاہیے کہ ایسے الفاظ کو چھوڑ کر، جن میں کوئی بہت اہم صورت رونما ہو، باقی الفاظ کو اردو کے مسلّمہ املا کے مطابق لکّھا جائے اور مقدّمے میں تفصیل کے ساتھ اِن سب اُمور کا ذکر کر دیا جائے۔

''کیونکر'' کے معنی میں صحیح لفظ ہے ''کیونکے''، اِس کو بہت سے لوگ غلطی سے ''کیونکہ'' لکّھا

کرتے ہیں۔ اِس دیوان میں بھی اِس لفظ کا یہی غلط املا ملتا ہے (ص ۹۶، ص ۱۶۱)۔ پردہ، گلہ، اشارہ، کسی اختلاف کے بغیر ہ سے صحیح ہیں۔ اُن کو اکثر الف سے لکھا گیا ہے یعنی پردا، اشارا، گلا، کہیں اِس کے خلاف بھی ملتا ہے (ص ۱۶۱)۔ اوّل تو یہ غالبؔ کا املا نہیں، اور اگر بالفرض اُنھوں نے گلہ کو گلا لکھا بھی ہوتا، تب بھی متن میں یہ قابلِ قبول نہیں ہوسکتا تھا۔ غالبؔ نے ''بالکل'' کو ''باالکل'' (بہ اضافۂ الف) لکھا ہے (مکاتیبِ غالب، طبع ششم، ص ۲۳۲) تو کیا اس املا کو قبول کرلیا جائے گا؟

فارسی کی جمعیں جو ہا کے ساتھ آتی ہیں، اُن کو عموماً ملا کر لکھا گیا ہے۔ یہ جدید فارسی املا کے مطابق تو ہوسکتا ہے، اردو میں چلن کے خلاف ہے، جیسے: ع: میں اور اندیشہاے دورو دراز (ص ۶۱)۔ جن لفظوں کے آخر میں ہاے مختفی ہو، جیسے اندیشہ، اُن کو جمع کی صورت میں علاحدہ لکھا جانا چاہیے۔ خیر یہاں تو یہ لفظ ملا کر لکّھا جاسکتا تھا، لیکن جن مقامات پر ایسا نہیں، یعنی اسم اور حروفِ جمع ملا کر لکھے ہی نہیں جاسکتے، وہاں بھی ہاے مختفی کو حذف کردیا گیا ہے اور اس سے لفظوں کی شکل عجیب سی نظر آتی ہے، مثلاً:

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہاے گل (ص ۶۷)

وہ میوہاے تازہ و شیریں کہ واہ واہ

وہ بادہاے نابِ گوارا کہ ہاے ہاے (ص ۲۰۱)

خند، میو، باد، بالکل نئے لفظ معلوم ہوتے ہیں پھر ایسا بھی نہیں کہ اِس کی مکمّل پابندی کی گئی ہو اِس کے خلاف بھی ملتا ہے، مثلاً:

صفحہ ہاے لیالی وایام (ص ۱۹۳)

یاں اور واں، یہ دونوں لفظ بہ ہاے مخلوط بھی استعمال کیے جاتے تھے، خود غالبؔ کی تحریروں میں ان کا یہ املا بھی ملتا ہے۔ ان میں سے ایک صورت کو اختیار کرنا تھا، لیکن کہیں یاں ہے تو کہیں یہاں۔ پھر اگر ان کو بہ ہاے مخلوط یھاں اور وھاں لکّھا جاتا، تو پڑھنے والا کسی نہ کسی طرح سمجھ ہی لیتا، لیکن اُن کو یہاں اور وہاں ہی لکّھا گیا ہے جب کہ پڑھنے میں آتے ہیں یھاں اور وھاں۔ لطیفہ یہ ہے کہ ایک ہی مصرعے میں یہ دونوں صورتیں مل جاتی ہیں۔ مثلاً: وہاں اس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار (ص ۱۰۱)۔ اِس سے سخت اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔

املا کی طرف سے بے توجّہی نے بعض مقامات پر اچّھا خاصا مسئلہ پیدا کردیا ہے۔ صرف ایک

مثال: غالبؔ کا مصرع ہے: کیوں ترا راہ گذر یاد آیا۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ، اِس لفظ کو مذکّر سمجھتے تھے۔ اور چوں کہ اُنھوں نے کہیں اور اِس سے متعلّق اختلاف کا اظہار نہیں کیا، اور نہ اُن کے کلام میں اِس طرح آیا ہے جس سے اِس کا مختلف فیہ ہونا ظاہر ہو، تو جب تک ایسی کوئی صراحت سامنے نہ آئے، اُس وقت تک غالبؔ کے کلام کی حد تک، اس لفظ کو مذکّر مانا جائے گا۔ لیکن اس دیوان میں ص۸۱ پر یہ مصرع نظر آتا ہے: ع: اے کاش جانتا نہ تری رہگزر کو میں۔ یہاں ''تری'' نے اِس کو مونّث بنا دیا ہے۔ نسخۂ عرشی میں ''ترے رہ گزر'' ہے اور یہی صحیح ہے۔

اب یہ مسلّمات میں سے ہے کہ فارسی میں گذشتن اور پذیرفتن، ذال سے صحیح ہیں۔ غالبؔ اِن کو ز سے صحیح سمجھتے تھے۔ بہ قولِ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی: ''میرزا غالبؔ نے پہلے نادانی سے، پھر سخن پروری اور سینہ زوری سے ذ کو فارسی سے خارج کرنے کی کوشش کی''۔ اِس دیوان میں اِن مصادر کے مشتقات کو بہ تقلیدِ غالبؔ ز سے لکھا گیا ہے، لیکن ذال بھی موجود ہے: ع: جب ازل میں رقم پذیر ہوئے (ص۱۹۳) یہاں ''پذیر'' کو ذال سے لکھا گیا ہے۔

کاما اور اضافت کے زیر لگانے کا بہ ظاہر التزام کیا گیا ہے۔ یہ التزام، بے حد احتیاط کا طلب گار ہے، ورنہ معانی چوپٹ ہو سکتے ہیں۔ اِس دیوان میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ بے احتیاطی کی بنا پر، متن کی قرأت ہی بدل گئی ہے اور اُس سے معنویت پر اثر پڑا ہے۔ صرف دو مثالیں:

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا کس سے کہوں کہ داغِ جگر کا نشان ہے

(ص۱۱۳)

''داغِ جگر'' نے مصرعے کو بے معنی کر دیا ہے۔

دماغِ عِطر پیراہن نہیں ہے غمِ آوارگیہاے صبا کیا

(ص۲۶)

نسخۂ عرشی میں عطر کو مضاف قرار دیا گیا ہے پیراہن کی طرف۔ دماغِ عِطر پیراہن نہیں ہے (نسخۂ عرشی، ص۱۵۷)۔ مقدّمے کے آخر میں عرشی صاحب نے خاص طور سے اِس مصرعے کا ذکر کیا ہے۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

''اِس کے پہلے مصرعے کے الفاظ 'عطر پیراہن' کو بکسرۂ را اور بدونِ کسرہ، دو

طرح سے پڑھا جا سکتا ہے۔ مگر میرزا صاحب نے پہلے 'بوے پیراہن' لکھا تھا، جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مقصودِ شاعر مرکّبِ اضافی ہے اور اُس نے 'بوٗ' کی جگہ 'عطر' اِس لیے رکھا ہے کہ اوّل الذکر کی تعمیم دور ہو جائے، لہٰذا اگر یہاں علامتِ اضافت نہ لگائی جائے تو ہم مرادِ شاعر سے دور جا پڑیں گے''۔

(مقدّمہ نسخۂ عرشی، ص ۱۱۸، ۱۱۹)

نسخۂ عرشی کی اِس صراحت کے بعد، جب تک مرتّب کی صراحت سامنے نہ ہو، اُس وقت تک یہ مقام مشتبہ رہے گا۔ مشتبہ ہی نہیں، پریشان کُن۔

ع: شوق ہے ساماں ترازِ نازشِ اربابِ عجز (ص ۴۰)۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''تراز'' کا املا ت سے صحیح ہے یا یہ غالبؔ کا پسندیدہ املا ہے، لیکن ص ۲۰۶ پر یہ طؔ سے ملتا ہے: ''ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت''۔ غالبؔ خورشید کو خرشید (بغیرِ واو) لکھا کرتے تھے (مکاتیبِ غالب، ص ۲۲۲)۔ اِس دیوان میں ہر جگہ مع واو (خورشید) ملے گا۔ وہی نظامی پریس کے کاتب کے املا والی بات۔

ایک اور غضب یہ ہوا ہے کہ اِس دیوان میں دس بیس سے زیادہ مصرعے بحر سے خارج نظر آتے ہیں۔ یہ بڑا ستم ہے اور ایسے سارے مقامات پر محض املا کی طرف سے بے توجّہی اِس کا سبب بنی ہے۔ ایسے دو مصرعے یہ ہیں:

ایک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے (ص ۱۶۲)

آینہ فرشِ ششش جہتِ انتظار ہے (ص ۱۷۳)

اغلاطِ کتابت کی کثرت نے سخت پریشان صورت پیدا کر دی ہے اور کہیں کہیں تو گم راہی کا سامان مہیّا کر دیا ہے۔ غلط نامے کا نہ ہونا، مزید برآں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کم فرصتی نے دیکھنے بھالنے کی مہلت نہیں دی۔ شروع میں ایک صفحے پر تصانیفِ غالبؔ کی فہرست درج کی گئی ہے، اس میں نادراتِ غالب، مکاتیبِ غالب وغیرہ کے نام بھی ہیں۔ اگر یہ سب مجموعے غالبؔ کی اپنی تصانیف کے ذیل میں آتے ہیں تو پھر اِس قبیل کی اور کتابیں جیسے مآثرِ غالب، متفرقاتِ غالب، غالب کی نادر تحریریں وغیرہ کیوں نہیں اِس فہرست میں شامل ہو سکتیں۔ لفظِ تصنیف کا جو متعارف مفہوم ہے، اگر اُس سے مختلف کوئی مفہوم مراد لیا گیا ہے، تو اِس کی وضاحت ضروری تھی۔ ہاں اِس کتاب کی قیمت نسبتاً کم

ہے، یہ خوبی ضرور قابلِ ذکر ہے اور مرکزی کمیٹی ضرور اِس پر فخر و مباہات کا اظہار کر سکتی ہے اور شاید اس کی تسکین کے لیے یہی بات کافی ہوگی۔

پروفیسر محمد مجیبؔ صاحب کا مرتّب کیا ہوا، غالبؔ کے اُردو کلام کا انتخاب، مکتبۂ جامعہ نے شائع کیا ہے۔ اشعار کے انتخاب میں زیادہ حصّہ، غالبؔ کے دورِ اوّل کے اشعار کا ہے۔ شروع میں چالیس صفحے کا مقدّمہ ہے جو دو حصّوں میں منقسم ہے (۱) غالبؔ کا زمانہ (۲) غالبؔ کا اردو کلام۔ اِس کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مرتّب کا مقصد محض سلسلۂ غالبیات میں شامل ہو جانا نہیں تھا، نہ اپنے ذوقِ سخن سنجی کی نمایش منظور تھی، بل کہ اُنھوں نے شدّت کے ساتھ یہ محسوس کیا ہے کہ غالبؔ کے دورِ اوّل کا کلام جس کو بہت زیادہ توجّہ کی نظر سے اب تک نہیں دیکھا گیا ہے، واقعتاً گنجینۂ معنی کا طلسم ہے۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ اور لوگ بھی اِس طرف توجّہ کریں۔ مجیبؔ صاحب نے اپنی معنی یاب تشریحات سے یہ بات دلوں میں بٹھا دی ہے کہ غالبؔ کا یہ ابتدائی کلام، ابتدائی مشق کا ناتمام تجربہ نہیں ہے۔ نظر جما کر اور دل لگا کر اِس کو پڑھا نہیں گیا ہے، جن اشعار کو منتشر الفاظ کا مجموعہ سمجھا جاتا رہا ہے، اُن میں حقیقتاً گہرا ربط پنہاں ہے اور معنویت کی تہیں چھپی ہوئی ہیں جو رفتہ رفتہ کھُلتی ہیں۔ یہی اِس انتخاب کی سب سے بڑی وجہِ جواز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اِس حصّے میں ایسے اشعار بھی ہیں جن میں محض پیچیدگی آمیز مشکل پسندی ہے، لیکن ایسے اشعار بھی ہیں جن میں مشکل پسندی کے پردے میں فکر و خیال کی دنیا بسی ہوئی ہے۔ مجیبؔ صاحب کا یہ کارنامہ ہے کہ اُنھوں نے اچانک ذہنوں کو اِس طرف متوجّہ کیا اور بڑی کام یابی کے ساتھ یہ بات دلوں میں اُتار دی۔ صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ غالبؔ کی یہ غزل: ؏ گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے ــــ بس اُن کے اُسی اُلجھے ہوئے کلام کا ایک حصّہ سمجھی جاتی تھی۔ مجیبؔ صاحب نے جس نظر سے اُس کو دیکھا اور اُس تاثر کو دوسروں تک منتقل کیا، اُس کے اثر سے، اب ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ واقعی یہ بے مثال غزل، حمد بھی ہو سکتی ہے، انوکھی حمد، اور یہ معنویت کا طلسم کدہ ہے۔

مقدّمے کے کہنے کو چالیس صفحے ہیں، لیکن یہ اُن کی وسعتِ نظر کا مرقّع ہے۔ سخن طرازی، انشائیہ طرزِ نگارش، غیر متعلّق تفصیلات اور مرعوب کرنے والے اندازِ بیان سے پاک ہے، جن سے عموماً ہمارے ناقدین کے مضامین گراں بار ہوا کرتے ہیں۔ بس کام کی باتیں کہی گئی ہیں، جن میں مطالعے کی گہرائی، نظر کی وسعت، خوش مذاقی کی روشنی اور طرزِ ادا کی جامعیّت کارفرما ہے۔ مطالعۂ غالبؔ کے سلسلے

میں اِس مقدّمے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ پہلے حصّے میں نہایت اختصار کے ساتھ اُن محرکات و عوامل کی نشان دہی کی گئی ہے، جن کے اثرات غالبؔ کے ذہن وفکر پر اثر انداز ہوئے اور جو اُس عہد میں کارفرما تھے۔ اور دوسرے حصّے میں غالبؔ کے ایمائی اور استعاراتی اسلوب کے تہ نشین عناصر کی طرف اشارے کیے گئے ہیں، جن سے غالبؔ کے اُس دورِ اوّل کے کلام کے رنگ و آہنگ اور اسلوب و مدّعا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ سلسلۂ غالبیات میں یہ انتخاب ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انتخاب کے لیے کس نسخے کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ یہ بات کھٹکتی ہے۔ ماخذ کا ذکر نہ ہونے سے ہمیشہ اُلجھن پیدا ہوا کرتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص نسخۂ عرشی سے اِس کے متن کا مقابلہ کرے، اور اُس کو اختلافاتِ متن نظر آئیں، تو پریشان کُن صورت پیدا ہوگی۔ اغلاطِ کتابت کی زیادتی بھی بُری طرح محسوس ہوتی ہے۔ متعدّد مصرعے بحر سے خارج ہوگئے ہیں۔ املا میں یکسانیت نہیں اور کئی جگہ وہ صریحاً غلط ہے۔ اضافت کے زیر لگانے کا اہتمام کیا گیا ہے، اِس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جہاں جہاں یہ چھوٹ گئے ہیں، یا غلط جگہ لگے ہیں، وہاں غلط فہمی کی بڑی گنجایش پیدا ہوگئی ہیں۔

ہاں یہ بات خاص طور سے کہنے کی ہے کہ سلسلۂ غالبیات کی جتنی کتابیں میری نظر سے گزری ہیں، یہ اُن میں سب سے زیادہ خوب صورت کتاب ہے۔ بے حد سادہ لیکن پُرکار۔ کتابت میں حاشیوں کا جو تناسب رکھا گیا ہے، اُس نے خوش نمائی کے ساتھ نیاپن پیدا کر دیا ہے اور سادگی بھی برقرار رہی ہے۔ کتابت اور طباعت دونوں پاکیزہ اور دیدہ زیب ہیں۔ یہ تکلّف سے بری انداز، مجیبؔ صاحب کی پاکیزگیِ ذوق کا آئینہ دار ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر یہ اچھا انتخاب اُن برائیوں سے بھی پاک ہوتا جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور جو نظر میں بے طرح کھٹکتی ہیں، بل کہ چُبھتی ہیں۔

غالبؔ کے اردو کلام کا اور کوئی قابلِ ذکر مجموعہ میرے پیشِ نظر نہیں۔ یہ عجیب بات ہے اور افسوس ناک بھی کہ غالبؔ کی اردو نثر کا کوئی مستند اور مکمّل مجموعہ اِس زمانے میں شائع نہیں ہوا۔ فارسی کلام کا بھی یہی حال ہے۔ البتہ صد سالہ یادگارِ غالب کمیٹی نے، غالبؔ کی نثری تصنیف دستنبوؔ شائع کی ہے۔ یہ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے اور بلا تکلّف کہا جا سکتا ہے کہ اُس زمانے میں اِس قدر بے احتیاطی، بے پروائی اور بے دردی کے ساتھ کوئی ایسی اہم کتاب شائع نہیں ہوئی ہوگی۔ مرتّب کی حیثیت سے اس پر کسی کا نام درج نہیں، حد یہ ہے کہ آدھے صفحے کا پیش لفظ بھی نہیں، جس سے یہ تو معلوم ہو جائے کہ یہ

کس نسخے پر مبنی ہے، کس نے نگرانی کی ہے اور کیا کیا ہے۔ایک لحاظ سے یہ ٹھیک ہی ہے، کیوں کہ تدوین یا ترتیب کی پرچھائیں بھی اِس پر نہیں پڑی ہے۔ کسی معمولی تجارتی ادارے کی شائع کی ہوئی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ اِس کتاب کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے معیار، صحت، تدوین اور تحقیق پر سے ایمان اُٹھ چکا ہو۔ نہ کاما ہے نہ فل اسٹاپ، نہ پیراگراف۔ بنیے کے کچے کھاتے کی طرح کتاب شروع ہو جاتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے۔ ہاں کہیں کہیں اضافت کے زیر ضرور لگائے گئے ہیں اور اِن سے مفہوم اور چوپٹ ہو گیا ہے۔ پہلی ہی سطر میں اضافت کا ایک زیر، غلط فہمی کا اعلان کر رہا ہے۔ کُل پچاس صفحے کی کتاب ہے، جس کی قیمت ہے چار روپے پچاس پیسے۔ یادگار کمیٹی نے دیوانِ اردو کی قیمت میں جو کمی کی تھی کہ ۲۱۶ صفحات کی کتاب کی قیمت پانچ روپے تھی، اُس کی کسر یہاں نکال لی۔ غلط سلط کتاب اور اِس قدر گراں۔ اِس سے کمیٹی کے اندازِ نظر اور معیار کا بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مخدومی قاضی عبدالودود صاحب نے معرکۂ برہانِ قاطع کے سلسلے کے رسائلِ غالب کو مرتّب کیا ہے۔ اس مجموعے میں قاطعِ برہان، سوالاتِ عبدالکریم، لطائفِ غیبی، نامۂ غالب اور تیغِ تیز شامل ہیں۔ یہ جلدِ اوّل ہے۔ مفصّل مقدّمہ اور حواشی دوسری جلد میں ہوں گے، جو آیندہ شائع ہو گی۔ اس دوسری جلد کے اکثر مباحث، مختلف مضامین کی صورت میں، رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ بس کچھ اضافوں کے ساتھ اُن کو مرتّب کرنا ہے۔ قاضی صاحب قبلہ دُنیا کے سارے چھوٹے بڑے کام کرتے ہیں، یہی کام نہیں کرتے۔ مشکل یہ ہے کہ اِس دوسری جلد کے بغیر، یہ پہلی جلد اِس حد تک ناتمام ہے کہ اِس کے متعلّق کوئی رائے ظاہر نہیں کی جا سکتی۔ اصولِ تدوین کی وضاحت، طریقۂ کار، اور حواشی، یہی چیزیں اہم ہوتی ہیں اور اُنھیں کی بنیاد پر رائے قائم کی جا سکتی ہے، اور اُنھیں کی روشنی میں کتاب کو جانچا، پرکھا جاتا ہے اور یہی موجود نہیں۔ یہ دوسری جلد، مباحث کی نوعیّت کے لحاظ سے قاضی صاحب کے ''لائف ورک'' کا درجہ حاصل کر سکتی تھی، جو منتشر مضامین شائع ہوئے ہیں، اُن سے اِس کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ قاضی صاحب نے ایک مدّت صرف کی ہے اِن مباحث کی گُتھیوں کو سلجھانے میں۔ اِس کمان کو قاضی صاحب کے سوا، شاید ہی کوئی زہ کر سکے، لیکن بات وہی ہے کہ قاضی صاحب اِس طرف توجّہ ہی نہیں فرماتے۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قاضی صاحب، کسی ایک موضوع پر ایسی کتاب کی ذمّے داری سے بچے رہنا چاہتے ہوں، جس میں آیندہ موقعے کے لیے کچھ چھوڑا نہ گیا ہو، کم فرصتی کی

معذرت طلبی نہ ہو اور نا تمامی کا اعتراف نہ ہو۔ قاضی صاحب اپنے تبصروں میں جس بلند ترین معیار کا دوسروں سے مطالبہ کرتے ہیں، وہ خود اُس کا کوئی مکمل نمونہ پیش کرنا نہیں چاہتے، اگر چہ مضامین کی شکل میں وہ بلند ترین معیار کے نمونے پیش کر چکے ہیں۔ یہ اردو ادب کی واقعی بدنصیبی ہے کہ قاضی صاحب جیسا شخص، جن کا اِس وقت بعض اعتبارات سے تحقیق کے میدان میں کوئی مقابل نہیں جنھوں نے اِس عہد میں ایک نسل کی ذہنی تربیت کی ہے، جنھوں نے اپنے بے مثال تبصروں سے، تحقیق کی حرمت کی پاسبانی کی ہے، اور جنھوں نے تحقیق میں راست گفتاری کا معیار قائم کیا ہے، وہ شیرانی صاحب کی طرح کوئی کارنامہ اب تک پیش نہیں کر سکے ہیں، جب کہ اُن کا علم، مطالعہ، ذہانت اور نظر، اِس کی متقاضی ہے کہ اُن سے اِس کا مطالبہ کیا جائے اور توقّع قائم کی جائے۔ اِس زمانے میں غالبؔ سے متعلّق بے شمار مضامین لکّھے گئے، لیکن مستقل تصانیف کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ہمارے اکثر ناقدین، غزل گو شاعروں کی طرح ریزہ کاری کے عادی ہو کر رہ گئے ہیں۔ مضامین کے مجموعے دس بارہ ہوں گے، مستقل تصنیف کا خانہ خالی۔ بات یہ ہے کہ مستقل اور اچّھی تصنیف کے لیے یہ لازم ہے کہ موضوع کے مطالعے پر صبر اور استقلال کے ساتھ خاصا وقت صرف کیا جائے اور غور و فکر کو مسلسل ایک نقطے پر مرکوز رکھا جائے۔ اِس کے لیے فرصت اور ایمان داری کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور ہمارے اکثر ناقدین دنیا کے دوسرے دھندوں میں اِس طرح لگے ہوئے ہیں کہ اِن چیزوں کے لیے گنجایش ہی نہیں نکلتی۔ پھر کچھ دنوں کے بعد مختصر نگاری ہی طبیعت بن جاتی ہے، اور نقّاد غزل گو ہو کر رہ جاتا ہے۔

ہندستان میں گنتی کی جو چند کتابیں چھپی ہیں، اُن میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب غالب اور آہنگِ غالب قدرِ اوّل کی چیز ہے۔ اس کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جو اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کر سکتے ہیں۔ کتاب پانچ ابواب میں منقسم ہے۔ بعض عنوانات یہ ہیں: غالب کا زمانہ، سیاسی اور معاشرتی حالت، غمِ عزت اور غمِ روزگار، غمِ عشق، غالب کا تغزّل، حکیمانہ شاعری۔

غالبؔ کے عہد، غالبؔ کے مزاج، اندازِ فکر، اُن کی شاعری کے محرکات اور اُس کے عناصر کا نہایت خوبی کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ مجھے اِس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ معلوم ہوئی کہ اس کتاب میں عقیدت، تعصب، جانب داری، مصلحت اندیشی اور سخن آرائی کی پر چھائیں بھی نظر نہیں آتی۔ وہ غالبؔ سے مرعوب نہیں، متاثر ضرور ہیں اور آج تک غالبؔ کے ناقدین نے جو کچھ کہا ہے، اِس سے وہ

ہرگز متاثر نہیں۔ اُنھوں نے ہر جگہ واقعات کو نہایت درجہ منطقیانہ اسلوب سے دیکھا ہے اور کسی تکلّف کے بغیر نتائج نکالے ہیں۔ اور بالکل بے جھجک ہو کر، اپنی رائے پیش کی ہے۔ ایسی جچی تلی رائیں دی گئی ہیں اور اس وضاحت کے ساتھ اُن کو پیش کیا گیا ہے کہ کوئی حجابِ درمیاں باقی نہیں رہتا۔ گہرا مطالعہ، سنجیدہ فکر اور غیر جانب دارانہ اخذ نتائج اس کتاب کا سرمایہ ہے۔ خصوصاً جہاں اُنھوں نے غالبؔ کے اندازِ فکر، اُن کے ذہن اور اُن کے ابتدائی حالات کا تجزیہ کیا ہے، اور اُن کے عہد کے اُن محرکات کا جائزہ لیا ہے، جن کے اثرات غالبؔ کے یہاں کارفرما تھے، وہاں محسوس ہوتا ہے کہ ایک بلند پایہ تصنیف سامنے ہے، یہ بات بلاتکلّف کہی جاسکتی ہے کہ یہ کتاب غالبیات کے سرمایے میں سب سے زیادہ گراں قدر اضافہ ہے۔ اِس کے مباحث میں ایسی گہرائی اور گیرائی ہے کہ مطالعۂ غالبؔ کے سلسلے میں کوئی شخص اِس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ یہ کتاب سنجیدہ قارئین کی خاص توجّہ کی مستحق ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے بعض اقتباسات پیش کروں، لیکن تبصرے کی تنگ دامانی مانع ہے۔ اِس کتاب کو صحیح معنی میں ''اوریجنل ورک'' کہا جاسکتا ہے۔

یہ کتاب غالب اکیڈمی دہلی نے شائع کی ہے، جس کو حکیم عبدالحمید صاحب نے غالبؔ دوستی کے سچّے جذبے کے تحت قائم کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تنہا حکیم صاحب نے وہ کام کیا ہے جو دوسرے با جماعت نہیں کرسکے۔ غالب اکیڈمی کی عمارت، غالبؔ کے شایانِ شان لائبریری اور مطبوعات کا سلسلہ، حکیم صاحب کے ایسے کارنامے ہیں جن پر اُنھی کو نہیں، اردو کو ناز کرنا چاہیے۔ حکیم صاحب نے یہ ثابت کردیا ہے کہ خلوص کے ساتھ کام کیا جائے تو خواہ آدمی اکیلا ہو، پھر بھی اُس کا انداز و معیار کیا ہوگا۔ اور نمایش اور بوالہوسی یا مصلحت پسندی کی خاطر جو کام کیے جائیں گے، اور پورا طائفہ شریک ہوگا، تو اُن کا رنگ و آہنگ کیا ہوگا۔ یوسف حسین خاں صاحب کی یہ کتاب بھی، حکیم صاحب نے شائع کرکے، اکیڈمی کی قابلِ فخر چیزوں میں ایک اضافہ کیا ہے۔ ہندستان میں غالبؔ کے سلسلے میں یہ واحد معیاری تنقیدی کتاب ہے جو اِس زمانے میں شائع ہوئی ہے۔

عتیق صدّیقی صاحب کی کتاب غالب اور ابوالکلام بھی اسی زمانے میں شائع ہوئی ہے۔ غالبؔ سے متعلّق مولانا آزاد کی جو تحریریں اِس سے پہلے متفرّق طور پر شائع ہوچکی تھیں، عتیق صاحب نے سلیقے کے ساتھ اُن کو اِس کتاب میں یکجا کردیا ہے۔ شروع میں مقدّمہ بھی ہے اور جا بہ جا مفید حواشی کا

بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ واقعی اچّھا کام ہوا ہے کہ مولانا آزاد کی ایسی تحریریں یکجا مل جاتی ہیں جن کا غالبؔ سے تعلّق ہے۔ کتاب مکتبہ شاہراہ دہلی نے شائع کی ہے۔ مکتبہ شاہراہ کے مالک مرحوم یوسف صاحب کے انتقال کے بعد یہ خوف پیدا ہوگیا تھا کہ اس اشاعت گھر کا نہ جانے کیا حال ہوگا، لیکن اِس صاف سُتھری کتاب کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یوسف صاحب کے جواں سال صاحبزادے کے اندر کام کی لگن بھی ہے اور سلیقہ بھی۔ کتاب بہت اچھے کاغذ پر چھپی ہے۔ جلد خوب صورت اور مضبوط ہے۔ گرد پوش بھی بہت عمدہ اور پُر معنی ہے۔

پریم پال اشکؔ نے ''محاورہ و روزمرّہ غالب'' کے عنوان سے ایک کتاب مرتّب کی ہے جس میں بہ قولِ خود اُن محاورات اور روزمرّہ کو یک جا کر دیا ہے، جو کلامِ غالبؔ میں پائے جاتے ہیں۔ غالبؔ محاورہ بند شاعر نہیں تھے اور نہ اصطلاحاً زبان کے شعر کہتے تھے۔ ہاں اُن کے کلام میں اردو کے محاورے ہیں، ہونا ہی چاہیے، کیوں کہ یہ زبان کا مستقل جُز ہیں، لیکن ایک تو یہ کہ اِن کی تعداد زیادہ نہیں، دوسرے یہ کہ محاوروں کے استعمال میں اُنھوں نے کوئی خاص رویّہ اختیار نہیں کیا ہے۔ غالبؔ کے یہاں دراصل فارسی ترکیبیں اور استعارے، گنجینۂ معنی کا طلسم ہیں۔ ترکیبوں کی تراش میں غالبؔ نے واقعتاً ندرت و جدّت سے کام لیا ہے۔ اشکؔ صاحب نے ہر طرح کے الفاظ و مصادر کو، خواہ وہ اصل معنی میں مستعمل ہوں، درج فہرست کرلیا ہے۔ بہت سے مقامات پر وہ صحیح معنی تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ یہ کتاب ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ زیادہ سے زیادہ سو صفحے میں یہ سب کچھ آسکتا تھا، اغلاط کو نکال کر اور غیر متعلّق امور سے قطعِ نظر کر کے۔

غالبؔ کا کچھ نہ کچھ تعلّق مختلف مقامات سے رہا ہے۔ اِس سلسلے میں دو کتابیں شائع ہوئی ہیں (۱) غالب اور حیدرآباد (۲) بھوپال اور غالب۔ اوّل الذّکر کتاب کے مصنّف ہیں جناب ضیاءالدین شکیبؔ، موصوف نے غالبؔ کے حیدرآبادی احباب و تلامذہ کا تذکرہ یک جا کر دیا ہے اور حیدرآباد میں غالبؔ سے متعلّق جو کچھ مواد ہے، اُس کی نشان دہی کی ہے۔ اس میں سب سے زیادہ قابلِ قدر معلومات ایک کتاب شمشیر براں کے متعلّق درج ہے، جو معرکۂ برہانِ قاطع کے سلسلے کی تصنیف ہے اور جس سے اب تک لوگ ناواقف تھے۔ یہ مخطوطہ حیدرآباد کے آرکائوز میں محفوظ ہے۔ اِس طرح کے علاقائی جائزے فائدے مند ہوتے ہیں اور اُن سے کچھ نہ کچھ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ

احتیاط سے کام لیا جائے۔اور اکثر اِسی کی کمی ہوتی ہے۔شکیب صاحب نے اس کام کو سلیقے سے انجام دیا ہے۔

دوسری کتاب بھوپال اور غالب جناب عبدالقوی دسنوی کی تصنیف ہے۔اوّل الذ کر کتاب جس قدر احتیاط اور سلیقے کے ساتھ لکھی گئی ہے، اِس کتاب میں اُسی قدر بے احتیاطی کے ساتھ واقعات کو جمع کر دیا گیا ہے۔حشو و زوائد کی بھی بہتات ہے۔دراصل ایک مختصر سے مضمون کا مسالا تھا، جس سے ایک کتاب بنالی گئی ہے۔بے احتیاطی کا عالم یہ ہے کہ شوکت بھوپالی کے نام سے، ذوق کی ایک معروف غزل درج ہوئی ہے، معمولی سے تغیرات کے ساتھ مطلع یہ ہے:

ہوش و خرد گئے نگہِ سحر فن کے ساتھ
اب جو ہے بات اپنی سو دیوانہ پن کے ساتھ

بے احتیاطی کے ساتھ لکھی گئی ایسی کتابیں سخت گمراہ کُن ہوتی ہیں۔

گنجینۂ غالب ،مرکزی حکومت کے شعبۂ نشر و اشاعت کی شائع کردہ کتاب ہے۔رسالۂ آجکل میں وقتاً فوقتاً غالب سے متعلّق جو مضامین شائع ہوتے رہے ہیں اُن کو دو جلدوں میں یک جا کر دیا گیا ہے۔یہ دوسری جلد ہے۔پہلی جلد آئینۂ غالب ،اب سے پہلے شائع ہوئی تھی۔عرشی صاحب، قاضی عبدالودود صاحب اور مالک رام جیسے غالب شناسوں کے مضامین اِس مجموعے میں شامل ہیں۔اِس کی اہمیّت یہ بھی ہے کہ قاضی صاحب، عرشی صاحب، مالک رام صاحب کے مجموعۂ مضامین شائع نہیں ہوئے ہیں، اور اِس طرح یہ مضامین کتابی صورت میں یک جا ہو کر سامنے آگئے، بہ صورتِ دیگر بہت سے لوگوں کے لیے اِن کا مطالعہ مشکل تھا۔کتاب، خوب صورت ٹائپ میں چھپی ہے۔

نذرِ غالب ،جناب عطا کاکوی کا مجموعۂ کلام ہے۔عطا صاحب نے غالب کی زمینوں میں جس قدر غزلیں کہی ہیں، جو تضمینیں لکھی ہیں، اور غالب سے متعلّق جو نظمیں اور رباعیاں کہی ہیں، اُن سب کو یک جا کر دیا ہے۔شاعری کے نقطۂ نظر سے، حسنِ عقیدت کے سوا اُن میں اور کوئی خوبی نہیں۔غزل، پھر غالب کی زمین میں، یہ بہت بڑی بات ہے۔یہ لازم نہیں کہ ہر پڑھا لکھا آدمی شاعری بھی کرے۔لیکن اِس زمانے میں یہ وبا چلی ہے کہ ہر محقّق اور نقّاد، شاعری کرنا بھی ضروری سمجھتا ہے۔

تصویر کا دوسرا رُخ ،یہ تالیف ہے جناب مجسّس اعجازی کی، جس میں یگانہ چنگیزی، عبدالباری

آسی، عبدالمالک آروی وغیرہ کے اُن مضامین کو جمع کردیا ہے جن میں غالب پر کسی نہ کسی گوشے سے اعتراضات کیے گئے ہیں۔ یہ سب مطبوعہ مضامین ہیں، لیکن یک جانہیں ملتے تھے۔ یہ بھی ایک انداز ہے کام کرنے کا۔ اِس کی افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ مرتّب نے سرسری انداز سے اِس کام کو کیا ہے اگر وہ ذرا محنت، توجہ اور زیادہ سنجیدگی سے کام لیتے تو اِس انداز کا، اِس سے اچّھا مجموعہ تیّار ہوسکتا تھا۔ مرتّب نے اکثر مضامین سے متعلّق یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں سے ماخوذ ہیں۔ آخر میں مرتّب نے اپنے دو مضمون بھی شاملِ کتاب کردیے ہیں۔ یہ واقعی زیادتی ہے۔ یہ مضامین، باقی مضامین سے کسی طرح میل نہیں کھاتے۔ اِنھوں نے جس ناتمامی کے ساتھ اِس مجموعے کو مرتّب کیا ہے، اُس سے کچھ یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ اپنے مضامین کو شامل کرنا، اصل مقصود تھا۔ کسی کام کو محنت، صبر اور دیدہ ریزی کے ساتھ کرنا اور اُس کے آداب کی پوری طرح پابندی، اصل چیز ہے اور اِسی کی اِس مجموعے میں کمی نظر آتی ہے۔

ہندستان اور پاکستان کے متعدد مقتدر رسائل نے اپنی خاص اشاعتیں، غالب کے لیے وقف کی ہیں۔ ہندستانی رسائل میں سب سے زیادہ ضخیم نمبر شاعر اور فروغِ اردو کے ہیں۔ شاعر کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اُس نے ضخامت کے ساتھ انصاف بھی کیا ہے۔ یہ نمبر بہت سلیقے کے ساتھ مرتّب کیا گیا ہے۔ تحقیقی مقالوں میں قاضی عبدالودود صاحب کا مضمون ''جہانِ غالب'' اور عرشی صاحب کا مضمون ''غالب کے دربار اور خلعت'' قابلِ ذکر ہیں۔ میکش صاحب کا مضمون ''مرزا غالب کا مذہب'' خود اُن کی شرافتِ نفس کا آئینہ دار ہے، جس میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ وہ نہ سنّی تھے نہ شیعہ، وہ درحقیقت آزاد رو تھے۔ لیکن اِس سے اتّفاق نہیں کیا جاسکتا۔ مرزا کے کلام سے اُن کے مذہب کے متعلّق نہایت واضح دلائل پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اُنھوں نے جہاں جہاں اِس سے مختلف باتیں کہی ہیں، اُن میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور شامل ہے اور غالب اِس قسم کی مصلحت اندیشیوں کو بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کا مضمون ''نسخۂ عرشی: کچھ قرأتیں'' فکر انگیز مضمون ہے۔ شاعر کا یہ نمبر ہر لحاظ سے اچّھا ہے اور اِس کے اڈیٹر جناب اعجاز صدیقی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

فروغِ اردو کا غالب نمبر، ضخامت کے لحاظ سے بھاری بھرکم ہے، لیکن مشمولات کے اعتبار سے

سب سے زیادہ ہلکا پھلکا۔ بیش تر مضامین مطبوعہ ہیں، جن کو پھر سے شامل کر کے، ضخامت کا بھرم رکھ لیا گیا ہے۔ ان میں بھی قابلِ ذکر مضامین کم سے کم ہیں۔ رسالے کو دیکھتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ خالص تجارتی اغراض و مصالح کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور مختلف لیڈرانِ کرام کی تصویروں کو اہتمام کے ساتھ شائع کرنا اصل مقصود تھا۔ اِس کی قیمت پندرہ روپے ہے، جو اِس کے معیار اور ضخامت کے مقابلے میں سخت ظلم ہے۔

علی گڑھ میگزین نے اس بار پھر غالب نمبر شائع کیا ہے۔ اس نمبر کی خصوصیت یہ ہے کہ سارے لکھنے والے، یونی ورسٹی ہی سے متعلّق ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اِس میں شعبۂ اردو کے علاوہ اور شعبوں سے متعلّق حضرات نے بھی حصّہ لیا ہے۔ یہ اچھا انداز و رجحان ہے۔ اِس نمبر میں کئی مضمون کام کے ہیں۔ خلیل الرحمن اعظمی کا مضمون ''یک عمر نازِ شوخیِ عنوان اُٹھایئے'' اپنے انداز کا دل چسپ مضمون ہے۔ ''موجودہ صدی میں اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی کتابوں کے مناسب نام رکھنے کے لیے اسی شاعر کی طرف رجوع کیا ہے'' اِس خیال کے تحت ایسی کتابوں کی طویل فہرست پیش کی گئی ہے جن کے نام کلامِ غالب سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر آرزو، عتیق احمد صدّیقی، ڈاکٹر وارث کرمانی اور ابنِ فرید کے مضامین قابلِ ذکر اور قابلِ توجّہ ہیں۔ وارث صاحب نے بہت تفصیل سے اُن اثرات کا جائزہ لیا ہے جو فارسی کے بعض شعرا کے یہاں سے غالب تک آئے ہیں۔ یہ جائزہ جذباتیت سے بری اور سنجیدگیِ فکر سے مزیّن ہے۔ عتیق صاحب کا مضمون واقعی فکر انگیز ہے، اصل خیال یہ ہے کہ ''شاعری میں الفاظ کا استعمال کس طرح جادو جگاتا ہے'' بڑے سلیقے سے کلامِ غالب کا اِس نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اِس خاص نمبر کے اڈیٹر بشیر بدر صاحب ہیں اور یہ نمبر اُن کی خوش سلیقگی اور صلاحیتوں کا بہترین شاہد ہے۔

رسالۂ جامعہ کا غالب نمبر، بہت ضخیم تو نہیں، لیکن اِس میں کئی مضمون معلومات افزا ہیں۔ ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے بہت تفصیل کے ساتھ غالب کی فارسی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ اُنھوں نے کثرت سے اشعار کا انتخاب پیش کیا ہے، جس سے تفہیم کا ایک پہلو ضرور نکلتا ہے، لیکن مضمون میں جگہ جگہ تاثراتی انداز غالب آ گیا ہے۔

تحریک کا غالب نمبر، اُس کے عام شماروں کی طرح مقرّرہ صفحات ہی پر شائع ہوا ہے۔ اِس میں

کوئی نیا مضمون شامل نہیں، دستنبو کا ترجمہ جو اِس سے پہلے اُس کے غالبؔ نمبر میں شائع ہو چکا تھا، اُسی کو پھر سے اِس شمارے میں بھی شائع کیا گیا ہے۔ ترجمہ مخمورؔ سعیدی کا ہے اور بہت رواں اور شگفتہ ہے۔

نیا دور (لکھنؤ) کا غالبؔ نمبر کئی لحاظ سے اچھا ہے۔ اس میں عرشیؔ صاحب، قاضی صاحب، گیان چند، نثار احمد فاروقی، ابو محمد سحر اور نیّر مسعود صاحبان کے مضامین واقعی اچھے اور معلومات افزا ہیں۔ کم سے کم قیمت میں یہ اچھے سے اچھا نمبر ہے۔ ترتیب میں سلیقہ کارفرما ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اڈیٹر خورشید احمد صاحب نے بہت دل لگا کر اس کو مرتّب کیا ہے۔

دلّی کالج میگزین کا غالبؔ نمبر، اگر چہ کالج کا میگزین ہے، لیکن اچھا خاصا ہے۔ اس میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور نثار احمد فاروقی صاحب کے مضامین بہت اچھے ہیں۔ جاوید وشِشٹ صاحب کا مضمون ''غالب حیات اور شاعری کا جنسی پہلو'' دل چسپ ضرور ہے لیکن موصوف کو وہی مغالطہ ہوا ہے جو ڈاکٹر عندلیبؔ شادانی کو میرؔ کے کلام میں ہوا تھا، میرؔ کی امرد پرستی کے سلسلے میں۔ سیّد ضمیر حسن صاحب کا انشائیہ خاصا دل چسپ ہے۔ البتّہ تنویر علوی صاحب کا انشائیہ ''کہتے ہیں جس کو عشق'' اُن کے لیے باعثِ فخر نہیں۔ وہ جس قسم کا سنجیدہ کام کرتے ہیں، وہی اُن کے شایاں ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص ہر کام کر لے۔ ہر کسی را بہر کاری ساختند۔

آج کل کی یہ روایت رہی ہے کہ وہ ہر سال فروری میں غالبؔ سے متعلّق مضامین بہ طورِ خاص شائع کرتا ہے۔ اِس سال بھی یہ روایت برقرار رہی ہے۔ اس شمارے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا مضمون ''کلام غالب کے صوتی آہنگ کا ایک پہلو'' خاصے کی چیز ہے اور یہی مضمون اِس نمبر کا سرمایہ ہے۔

معروف رسائل میں اردو ادب کا غالبؔ نمبر شاید سب سے زیادہ کم رُتبہ ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کا ترجمان اردو ادب معیار کے لحاظ سے درجۂ اوّل کی چیز سمجھا جاتا تھا۔ آج بھی اِس کے پچھلے شمارے آنکھوں سے لگانے کی چیز ہیں۔ تقسیم کے بعد سے اِس کا جو حال بگڑا ہے تو بگڑتا ہی چلا جاتا ہے اور اب وہ اردو کا ایک معمولی رسالہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اُس کا یہ غالب نمبر، اس کی بیّن مثال ہے۔ ''نسخۂ حمیدیہ، چند غلط فہمیوں کا ازالہ'' جناب ابو محمد سحر کا مضمون ہے۔ موصوف نے اِس موضوع سے متعلّق کئی عنوانات سے کئی جگہ لکھا ہے... کیا اچھا ہوتا اگر وہ ایک مضمون لکھتے اور جامعیّت کے ساتھ سب باتیں اِس میں جمع کر دیتے۔ تکرار سے سطحیت آ جایا کرتی ہے اور وہ اُن کے اِس مضمون کا حصّہ ہے،

یہی بات ڈاکٹر گیان چند جین کے مضمون کے متعلق کہی جاسکتی ہے۔موصوف نے متعدّد رسائل کے غالب نمبروں میں طویل و مختصر مضامین لکھے ہیں، جن میں سے بعض بہت اچھے ہیں، مثلاً اُن کا وہ مضمون جو نقوش میں شائع ہوا ہے، بہت ہی کام کا مضمون ہے۔لیکن یہ اردو ادب میں شائع شدہ مضمون ''ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں'' بہت ہلکا ہے۔اُن کے شایانِ شان نہیں۔عنوان ہی اس انداز کا ہے۔کثرت کا نتیجہ یہ بھی ہوا کرتا ہے۔

شگوفہ ، زندہ دلانِ حیدرآباد کا ڈیڑھ ماہی مزاحیہ رسالہ ہے، جس کا خاص نمبر ''حیوانِ ظریف نمبر'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔خاصے دل چسپ مضامین ہیں۔اِس کے مضامین کا متنوّع اور منظومات کی رنگارنگی اِس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے اور اِس کے لیے، اِس کے اڈیٹر سیّد مصطفٰی کمال صاحب تحسین و آفریں کے مستحق ہیں۔اپنی نوعیت کا یہ منفرد غالب نمبر ہے۔جی چاہتا ہے کہ بہ طورِ نمونہ اشعارِ غالب کی چند تحریفات ضرور نقل کروں۔ایک ایک لفظ کی تبدیلی سے کیسی کیسی دل چسپ قیامتیں ڈھائی گئی ہیں۔''عقد نامہ'' کے یہ شعر دیکھیے:

عقد سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا　　درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا
ہوا ہوں عقد کی غارت گری سے شرمندہ　　سوائے حسرتِ تعمیر، گھر میں خاک نہیں
بے عقد عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں　　طاقت بہ قدرِ لذّتِ آزار بھی نہیں

ایک اور تحریف ملاحظہ فرمایئے۔غالب کا اصل شعر، آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے:

داڑھیاں بے سبب نہیں غالب　　کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

علم و فن اور شبستاں ، یہ دونوں ڈائجسٹ ہیں۔شبستاں میں دیوانِ غالب خوب صورتی کے ساتھ شائع ہوا ہے اور یہ عام دل چسپی کی چیز ہے۔لیکن سرِورق کی تصویر بہت بھدّی ہے۔البتّہ علم و فن نے دو بہت کام کی چیزیں پیش کی ہیں جن میں نیاپن بھی ہے اور افادیت بھی۔نئی دہلی اور علی گڑھ میں بہ سلسلۂ غالب دو سمینار ہوئے تھے، اُن دونوں کی بحثوں کو مکمّل پیش کیا گیا ہے لیکن اِس سے بھی زیادہ دل چسپ اور کار آمد، وہ انٹرویو ہیں جو ہندستان اور بیرونِ ہند کے اربابِ علم سے لیے گئے ہیں۔جناب ناز انصاری نے غالب سے متعلق کچھ سوالات مرتّب کر کے، ہندستان و بیرونِ ہند کے متعدّد

مشاہیر کے سامنے پیش کیے اور اُن کے جوابات کو قلم بند کرتے گئے۔ بعض سوالات کے جوابات بہت دل چسپ ہیں اور فکر انگیز۔ ایک ہی سوال کے دو مختلف جوابات اور ایک ہی سوال کے ایک سے جوابات، یہ دونوں پہلو دیکھنے کے ہیں۔ نازؔ صاحب کی ذہانت اور کاوش نے واقعتاً ایک عمدہ سلسلہ مرتّب کر دیا ہے۔ اور اس کے لیے وہ شکریے کے سزاوار ہیں۔

نقوشؔ نے روایت کے مطابق ۸۴۰ صفحوں کا ضخیم غالبؔ نمبر شائع کیا ہے اور یہ بھی بشارت دی ہے کہ یہ محض حصّۂ اوّل ہے۔ دوسرا حصّہ اِس کے بعد آئے گا۔ نقوشؔ کی شروع سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ اُس کی ضخامت، اُس کے معیار کے راستے میں کبھی حارج نہیں ہوسکی۔ اُس کے اڈیٹر محمد طفیلؔ صاحب کو اللہ جانے کیا جادو آتا ہے کہ وہ ہر نمبر کے لیے، عمدہ سے عمدہ مضامین حاصل کر لیتے ہیں۔ اِس نمبر کا بھی یہی حال ہے۔ اِس نمبر کے متعدّد مضامین بہت معلومات افزا ہیں۔ ڈاکٹر گیان چندؔ کا مضمون نسخۂ عرشی سے متعلّق، ڈاکٹر وحید قریشیؔ کا مضمون نسخۂ شیرانی سے متعلّق، ڈاکٹر سیّد عبداللہؔ کا مضمون ''غالب و ناسخ''، قاضیؔ صاحب کا مضمون ''غالبؔ کے بارے میں بعض وضاحتی امور''، فراقؔ کا مضمون ''غالبؔ ایک بے نیاز ناظر'' بہت اچھے مضامین ہیں بعض اور مضامین بھی کام کے ہیں۔

رسالۂ افکارؔ کا غالبؔ نمبر، اگر چہ اُس کے بعض اور نمبروں کے برابر ضخیم نہیں، لیکن اِس میں کئی مضمون کام کے ہیں۔ اس ہنگامۂ غالبؔ دوستی میں، جب کہ ہر رسالے کا اڈیٹر غالبؔ نمبر نکالنے کی فکر میں سرگرداں تھا، دو اچھّے مضامین کا حاصل کر لینا ہی بڑی بات ہے۔ پروفیسر احمد علیؔ کا مضمون ''مسائلِ اسلوب اور بیانِ غالب''، ڈاکٹر انعام الحقؔ کوثر کا مضمون ''غالب و ناطق'' اور مالک رامؔ صاحب کا مضمون ''ذکرِ غالب: کچھ نئے حالات'' معلومات افزا مضامین ہیں۔ دستنبوؔ کا اردو ترجمہ، رسالۂ اردوے معلّیؔ دہلی میں اب سے پہلے شائع ہوا تھا۔ یہ ترجمہ راقم الحروف نے کیا تھا۔ وہاں سے اِس کو نقل کیا گیا ہے اور مسرّت کی بات یہ ہے کہ بڑی فراخ دلی کے ساتھ حوالہ دیا گیا ہے۔ علی گڑھ میگزینؔ کی طرح، اس میں بھی ''گنجینۂ معنی'' کے عنوان سے ایسی کتابوں کے نام درج کیے گئے ہیں جو غالبؔ کے اشعار سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔

انجمن ترقّی اردو پاکستانؔ کے مجلّہ اردوؔ کا غالبؔ نمبر، اچھّے غالبؔ نمبروں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، اُس کے اڈیٹر مشفق خواجہؔ صاحب نے نہایت محنت کے ساتھ کئی واقعی اچھّے مضامین حاصل

کیے ہیں۔ قاضی صاحب کا مضمون ''مجموعۂ دہلی اور غالب''، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا مضمون ''غالب مرأۃ الاشباہ اور حکیم احسن اللہ''، مدیر کا مضمون ''غالب اور تلامذۂ غالب تذکرۂ بشیر میں''، جلیل قدوائی کا مضمون ''غالب کا الحاقی کلام ایک داستان''، کلب علی خاں فائق کا مضمون ''کچھ تلامذۂ غالب کے بارے میں''، ڈاکٹر عبدالغنی کا مضمون ''بوستانِ خرد غالب کی ایک غیر معروف شرح''، عرشی صاحب کی مرتبہ ''سبد باغ دودر'' (تعارف، تلخیص، حواشی)؛ یہ مضامین کسی نہ کسی لحاظ سے حقیقی معنی میں معلومات افزا ہیں۔ اتنے اچھے مضامین کا حاصل کرنا اور پھر سلیقے سے اُن کو پیش کرنا، مشفق خواجہ صاحب کا کارنامہ ہے۔ سیّد صمد حسین رضوی کا طویل مضمون غالب کی صحیح تاریخ پیدائش سے متعلق ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے علمِ نجوم سے اچھی واقفیت شرط ہے، افسوس ہے کہ میں اپنی لاعلمی کی وجہ سے اِس سے مستفید نہیں ہوسکا۔ مقالہ نگار کا یہ کہنا ہے کہ غالب کا سالِ ولادت عام طور سے ۱۲۱۱ھ مانا جاتا، لیکن اُن کے زائچے کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صحیح سالِ ولادت ۱۲۱۲ھ ہے۔ واقف کار حضرات اس کے متعلق کوئی صحیح رائے دے سکتے ہیں۔

رسالہ اوراق نے اپنے سال نامے کا ایک حصّہ غالب کے لیے مخصوص کیا ہے۔ اس میں غالب سے متعلق چھے تنقیدی مضامین ہیں، لیکن قابلِ ذکر چیز ہے صرف اِس کا مستقل سلسلۂ بحث ''سوال یہ ہے'' جس میں کئی حضرات نے حصّہ لیا ہے اور بعض لوگوں نے قاعدے کی باتیں کہی ہیں۔ نظیر صدیقی کا یہ جرأت مندانہ اور بلیغ اعتراف بھی اِس بحث میں شامل ہے: ''اِس موقعے پر ہمیں اس خود فریبی سے بچنا ضروری ہے کہ وہ مغربی ممالک جو اِس تقریب میں حصّہ لے رہے ہیں، اُنھوں نے غالب سے خود دل چسپی لی ہے۔ دراصل اُن کے اندر دل چسپی پیدا کی گئی ہے، جس میں پاکستان سے زیادہ ہندستان کا ہاتھ ہے''۔

دورانِ بحث میں اُنھوں نے یہ نہایت صحیح اور دوررَس بات بھی کہی ہے کہ: ''غالب فکر و اظہار دونوں کے اعتبار سے جدید ہیں، لیکن شعر و ادب بالخصوص شاعری میں جدّت اور جدیدیت، پایداری اور پایندگی کی ضمانت نہیں۔ زندگی کی طرح شاعری میں بھی پختگی سب کچھ ہے۔ فکر کی پختگی یہ ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کو اپنی گرفت میں لے لے اور اظہار کی پختگی اِس بات میں ہے کہ جو بات کہی جائے، اُسے غیر فانی اظہار مل جائے۔ دنیا کے جن بڑے شاعروں کی شاعری اِس معیار تک پہنچتی ہے، اُن میں غالب بھی ہیں''۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں مجلّہ صحیفہ (لاہور) کے معیار و وقار میں قابلِ لحاظ اضافہ ہوا

ہے اور اِس رسالے کا غالبؔ نمبر، اِس کا تازہ ثبوت ہے۔ اُس کے دو حصّے شائع ہو چکے ہیں، اور دو حصّے مزید شائع ہوں گے۔ یعنی اِس سال کے تین عام شمارے اور ایک ضخیم خاص شمارہ، یہ سب غالبؔ سے متعلّق ہوں گے۔ یہ بڑی ہمّت اور جرأت کی بات ہے اور اِس سے زیادہ اعتماد کی دلیل ہے۔

پہلے حصّے میں ''آبِ حیات کے مسوّدے میں غالب کے حالات'' (آغا محمد باقر)، ''یہ سلسلۂ غالب'' (اکبر علی خاں)، ''مرزا غالب کا اسلوبِ نگارش پنج آہنگ میں'' (عندلیب شادانی)، ''قاطع القاطع'' (قاضی عبدالودود)، ''مرزا غالب کا سفرِ کلکتہ اور بیدل'' (ڈاکٹر عبدالمغنی)، ''غالب کی فن کارانہ ہمہ گیری'' (نظیر صدیقی) قابلِ ذکر مضامین ہیں۔ اتنے اچھے مضامین جمع کر لینا واقعی بڑا کام ہے۔ دوسرے حصّے میں بھی ایک دو مضمون اچّھے خاصے ہیں۔ لیکن مجموعی طور سے یہ پہلے حصّے کو نہیں پہنچتا۔

مختلف رسائل میں، مختلف فن کاروں کی بنائی ہوئی غالبؔ کی تصویریں بھی شائع ہوئی ہیں۔ میری نظر میں اُن میں سب سے عمدہ دو تصویریں ہیں۔ ایک وہ جو نقوش میں شائع ہوئی ہے۔ یہ عبد الرحمن چغتائی کی بنائی ہوئی ہے۔ دوسری تصویر علی گڑھ میگزین میں شامل ہے، جس کو ستیش گجرال نے بنایا ہے۔ چغتائی کی تصویریں غالبؔ کے چہرے پر اندازِ سرشاری کی کیفیت چھائی ہوئی ہے۔ اور کلاسیکیت کا رنگ غالب ہے۔ گجرال کے یہاں فکر و احساس اور اَنا کے طاقت ور اثرات، اور اِن کی پیدا کی ہوئی کشمکش کا رنگ چہرے پر غالب ہے۔ یہ تصویر بہت اچھی ہے۔ لیکن چغتائی کے یہاں جس وسعت کا احساس ہوتا ہے اور جس وسعت آمیز عمق کا عکس سامنے آتا ہے، وہ اُس میں نہیں۔ لیکن مجموعی طور سے مجھے گجرال کی تصویر زیادہ پسند آئی۔

غالبؔ پر بے شمار مضامین لکھے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اِن میں سے بیش تر مضامین سطحی ہوں گے اور ہونا بھی چاہیے۔ اچّھے مضامین نہ جلد لکّھے جا سکتے ہیں اور نہ زیادہ لکّھے جا سکتے ہیں۔ لیکن اِن سب خاص نمبروں کو دیکھ کر یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ اِن میں سے اچّھے مضامین کو منتخب کر لیا جائے تو ایک اچھا مجموعۂ مضامین تیّار ہو سکتا ہے، جس میں غالبؔ کے فکر و فن اور سوانح سے متعلّق معلومات افزا سرمایہ جمع کیا جا سکے گا اور یہ بھی اندازہ ہو کہ ابھی غالبؔ پر مزید لکّھا جا سکتا ہے۔

[آجکل نئی دہلی، جولائی ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۷ تا ۳۸)

ooo

بہ سلسلۂ تدوینِ کلامِ غالبؔ

غالبؔ کے قلم سے لکھی ہوئی بہت سی تحریریں موجود ہیں۔ اُن کے عکس بھی چھپ چکے ہیں۔ میں اِس مختصر سے مضمون میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اُس کے لیے ساری خطّی تحریروں کو یا اُن کے عکسوں کو سامنے رکھنے کی ضرورت نہیں۔ مرزا صاحب کے قلم سے لکھی ہوئی ایک دوسطروں ہی سے کام چل جائے گا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے جونسخۂ دیوانِ غالبؔ (اُردو) شائع کیا ہے، اُس کے گرد پوش کے آخری صفحے پر ایک غزل کا عکس بھی چھاپا گیا ہے جو بہ خطِ غالبؔ ہے۔ اُس کا دوسرا شعر اظہارِ مدّعا کے لیے کافی ہوگا۔ شعر یہ ہے:

میں بُلاتا تو ہوں اُس کو، مگر اے جذبۂ دل
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بِن آئے نہ بنے

عکس میں ''ہوں'' اور ''میں'' معِ نونِ نقطہ دار ہیں۔ ''اوسکو'' اور ''اوس پہ'' معِ واو ہیں۔ ''اوسکو'' ملا کر لکھا گیا ہے اور ''اوس پہ'' الگ الگ۔ ''بن جائے'' کے آخر میں یاے مجہول ہے، اگر اِس پر ہمزہ موجود نہیں مگر ''بن آئی نہ بنی'' میں دونوں افعال کے آخر میں یاے معروف ہے اور ''آئی'' معِ ہمزہ ہے ''کچھہ'' میں ایک کہنی دارہ لکھی گئی ہے اور آخر میں ہاے مختفی بھی شامل کی گئی ہے۔ 'ایسی' کو معِ یاے مجہول (ایسے) لکھا گیا ہے۔ ''بلاتا''، ''تو'' اور ''ہوں'' تینوں لفظوں کے پہلے حرفوں پر پیش لگا ہوا ہے۔ ''کہ'' ایک خاص شکل میں بنا ہوا ملتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دیوانِ مطبوعہ میں موجودہ طریقِ نگارش کو ملحوظ رکھّا گیا ہے اور اِس طرح (ایسے اور مقامات کی طرح) اِس شعر میں بھی کئی لفظوں کی شکلیں بدل دی گئی ہیں۔ ''اوس'' کو بغیر واو کے لکھا گیا ہے۔ ''اوسکو'' کو الگ الگ ''اس کو'' لکھا گیا ہے وغیرہ۔ یہاں اگر کوئی شخص یہ پوچھے کہ مرزا صاحب کی تحریر میں لفظوں کی جو شکلیں ہیں، اِن کو کیوں بدل دیا گیا؟ اور یہ

بھی کہ کیا اِس کا حق حاصل تھا کہ املاے مصنّف کو بدل دیا جائے؟ تو اِس کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ املاے الفاظ میں جو تبدیلیاں کی گئی ہیں، اُن کا اصل مقصد یہ ہے کہ منشاے مصنّف کو صحیح طور پر پیش کیا جا سکے۔ چوں کہ اب ہم آخرِ لفظ میں واقع نونِ نقطہ دار اور نونِ بے نقطہ کے تلفّظ میں فرق کرتے ہیں؛ اِسی طرح آخرِ لفظ میں واقع یاے معروف اور یاے مجہول کی صورت کے لحاظ سے تلفّظ کا، اور تلفّظ کے واسطے سے معنی کا تعیّن کرتے ہیں؛ اِس لیے یہ تبدیلیاں ضروری تھیں۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا، تو غلط خواندگی کے نتیجے میں منشاے مصنّف کی خلاف ورزی ہو سکتی تھی۔

اِس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اصل چیز ہے منشاے مصنّف کا تعیّن اور اُس کی مطابقت۔ وہ تبدیلیاں جو اِس میں معاون ہو سکتی ہیں، یعنی صحیح طور پر منشاے مصنّف کی مطابقت اِن کی مدد سے حاصل ہو سکتی ہے، اِن کا عمل میں آنا ضروری ہے۔ مرزا صاحب نے جب یہ شعر پڑھا ہوگا تو ''بن آئی نہ بنی'' نہیں پڑھا ہوگا اور ''میں'' کا تلفّظ ''مَیں'' اور ''ہوں'' کا تلفّظ ''ہُوں'' نہیں کیا ہوگا۔ ''بن آئے نہ بنے'' کہا ہوگا۔ اور ''مَیں'' اور ''ہُوں'' کہا ہوگا۔ اُس زمانے میں یہ عام روشِ کتابت تھی کہ آخر لفظ میں شامل یاے معروف و مجہول کی صورت نگاری میں اُس امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا، جس کو آج لازماً ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اِس لیے اِس زمانے میں '' آئی نہ بنی'' سے اِن لفظوں کا تلفّظ نہیں بدلا تھا، مگر اب چوں کہ صورت نگاری کے فرق کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، اِس لیے اب '' آئی نہ بنی'' لکھنے سے تلفّظ بدل جائے گا اور اِس سے معنویت پر بھی اثر پڑے گا۔ یوں یہ تبدیلی لازم تھی۔

یہ طریقۂ کار بہ ظاہر بہت سیدھا سادہ نظر آتا ہے، اِس میں کچھ اشکال بھی نظر نہیں آتا؛ مگر واقعہ یہ ہے کہ اصل مشکل یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ میں ایک مثال سے اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ ہم ''خورشید'' لکھتے ہیں۔ مرزا صاحب نے نہایت وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ صحیح املا ''خرشید'' (واو کے بغیر) ہے۔ ''خورشید'' لکھا جائے یا ''خرشید'' اِس سے نہ تو لفظ کا تلفّظ بدلتا ہے اور نہ معنی پر کچھ اثر پڑتا ہے؛ اب یہاں یہ بات فیصلہ طلب قرار پاتی ہے کہ ایسی صورت میں کیا یہ لازم قرار دیا جائے گا کہ مرزا صاحب کے کلام میں ''خرشید'' ہی لکھا جائے۔ اگر اِسے لازم قرار دیا جائے گا، تو اِس کے لیے پہلے اِس بات کو اصول کے طور پر ماننا ہوگا کہ کسی مصنّف نے اگر وضاحتاً بعض الفاظ کے متعلق اپنے طریقِ نگارش کی صراحت کی ہے، اُس صورت میں اُس کے قول کی مطابقت لازم ٹھہرے گی، خواہ عام طور پر اِن

لفظوں کو مختلف طور پر لکھا جاتا ہو اور خواہ اِس مصنّف کا وہ قول بجائے خود غلط ہو۔ اگر اِس اصول کو مان لیا جائے، اُس صورت میں یہ بھی لازم ہوگا کہ مرزا صاحب کے ایسے جملہ اقوال کو پیشِ نظر رکھا جائے اور التزام کے ساتھ اِن کی مطابقت اختیار کی جائے، وہ بجائے خود صحیح ہوں یا غلط۔ اگر تحقیق اور تدوین کے طریقِ کار پر نظر رکھی جائے تو اِس اصول کو قطعیّت کے ساتھ ماننا ہوگا، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ اِس سلسلے میں بہت انتشار نظر آتا ہے۔ دو تین مثالوں سے اِس صورتِ حال کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔

ایک مثال تو اِسی لفظ ''خرشید'' سے دی جاسکتی ہے۔ مرزا صاحب نے اِس اِملا کی تائید میں مکتوب بہ نام میر مہدی مجروحؔ میں جو دلیل دی ہے، اہلِ علم نے اُسے درست نہیں مانا۔ بالتکرار یہ لکھا گیا ہے کہ مرزا صاحب کی راے درست نہیں تھی۔ ایک دوسری مثال فارسی میں ذال کی بحث سے دی جاسکتی ہے۔ مرزا صاحب کا کہنا تھا کہ فارسی میں ذال موجود نہیں، لہٰذا فارسی کے ایسے سب لفظوں میں زے لکھنا چاہیے۔ فارسی زبان سے عالمانہ واقفیت رکھنے والوں کا یہ کہنا ہے کہ مرزا صاحب کا یہ قول بھی درست نہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود اور پروفیسر نذیر احمد نے اپنے عالمانہ مقالات میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ مرزا صاحب غلطی پر تھے۔

تیسری مثال اِن دونوں مثالوں سے ذرا مختلف ہے۔ مرزا صاحب نے لکھا ہے کہ ''یہاں'' بروزن ''اَہاں''، فصیح نہیں، بےضرورت نہ چاہیے۔ ''یھاں'' بہ ہاے مخلوط التلفّظ افصح ہے'' (مقدمۂ مکاتیبِ غالب، طبعِ ششم، ص۱۵۴)۔ ''وہاں'' کے متعلّق مرزا صاحب نے کچھ نہیں لکھا، مگر ''یھاں'' کے قیاس پر ''وھاں'' کے مخفف کو بھی ''وہاں'' ماننا چاہیے۔ اس قیاس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ مولانا حالیؔ کی کتاب یادگارِ غالب کے پہلے اڈیشن میں [مطبوعۂ نامی پریس کان پور، سالِ طبع ۱۸۹۷ء] غالبؔ کے اشعار میں ایسے مواقع پر ہر جگہ التزام کے ساتھ ''یھاں'' اور ''وھاں'' (معِ ہاے مخلوط التلفّظ) ملتے ہیں۔ مگر دیوانِ غالب کے اہم نسخوں میں عموماً ایسے مواقع پر ''یاں'' اور ''واں'' نظر آتے ہیں۔

اب اِن تینوں مثالوں سے قطعی طور پر ایک مختلف صورتِ حال کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ مرزا صاحب نے جگہ جگہ یہ صراحت کی ہے کہ فلاں لفظ میں یاے مجہول ہے یا یاے معروف۔ مثلاً تفتہؔ کو ایک خط میں لکھا ہے کہ یاے مصدری معروف ہوتی ہے اور مثال میں لفظ آشنائی لکھا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ یاے توحید و تنکیر مجہول ہوگی اور مثال میں ''آشنائے''، یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا لکھا ہے۔ چودھری

عبدالغفور سرور کو ایک خط میں یہ سمجھایا ہے کہ ''گفتی'' اور ''گفتے'' میں کیا فرق ہے۔ اُنھی کو ایک اور خط میں لکھا ہے: اے کریے کہ از خزانۂ غیب۔ ہرگز یاے معروف نہیں ہے، یاے مجہول ہے۔ یاے معروف یہاں نا قبول ہے— خداے کہ بالا و پست آفرید۔ ایسا خدا، ایسا کریم اس تحتانی کو یاے وحدت کہو، یاے توصیف کہو، یاے تعظیم کہو، جس طرح کہو، یاے مجہول آئے گی''۔

مرزا صاحب نے قلق کو ایک خط میں لکھا ہے: ''صاحب بندہ! تحریر میں اساتذہ کا تتبع کرو، نہ مغل کے لہجے کا۔ لہجے کا تتبع بھانڈوں کا کام ہے، نہ دبیروں اور شاعروں کا۔ ایسی تقلید کو میرا سلام''۔ تیغِ تیز میں نونِ غنّہ کی بحث میں ایک جگہ لکھا ہے: ''اسی ۱۸ اور ۱۹ صفحے میں جہاں ''کندیدن'' کو غلط بتاتے ہیں اور ماند و خاند کو بروزنِ چاند غلط بتاتے ہیں اور مند و خند کو بروزن سُند و گند صحیح فرماتے ہیں...''۔ لاحول والاقوۃ الا باللہ! اہلِ ایران الف کو سلا دیتے ہیں اور یہ لہجہ ہے، نہ قاعدہ۔ شاعر اور منشی کو تتبع قواعد کا چاہیے، لہجے کی تقلید بہروپیوں اور بھانڈوں کا کام ہے'' [قاطعِ برہان و رسائلِ متعلقہ، مرتبہ قاضی عبدالودود، ص ۲۷۰]۔ ''خرشید'' کے املا اور فارسی میں ذال کے وجود کے متعلق تو یہ ثابت کر دیا گیا کہ غالب کی راے درست نہیں تھی، مگر فارسی الفاظ میں نونِ غنّہ اور مجہول و معروف آوازوں کے وجود کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا صاحب کی راے غلط تھی۔ اِس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، اِسے غلط نہیں کہا جا سکتا۔ یہ الگ الگ باتیں ہوئیں۔

اِس طرح مندرجۂ بالا امثال کی روشنی میں ایسی کئی اہم باتیں سامنے آتی ہیں جن سے تدوینِ کلامِ غالب کے سلسلے میں ہمہ وقت سابقہ پڑے گا۔ اب تک کلامِ غالب کے جو مختلف اہم نسخے شائع ہوئے ہیں، وہ انفرادی کارنامے ہیں۔ انفرادی کام میں یہ آسانی ہوتی ہے کہ مرتّب اپنی صواب دید کے مطابق ایک طریقۂ کار کو طے کر سکتا ہے اور اِس کی پابندی کو اپنے لیے لازم قرار دے سکتا ہے۔ اگر کوئی ادارہ کلامِ غالب کے تحقیقی اڈیشن مرتّب کرائے اور شائع کرے، اُس وقت یہ سوال پوری وسعت کے ساتھ سامنے آئے گا کہ اردو اور فارسی کلام کی تدوین میں کن اصولوں کو سامنے رکھا جائے۔ کیا فارسی کلام میں جدید ایرانی املا اور تلفّظ کو اختیار کیا جائے گا، جس کی تقلید کو مرزا صاحب نے بہروپیوں اور بھانڈوں کا کام بتایا ہے، یا ہندستانی روشِ عام کی پابندی کی جائے گی۔ اردو کلام میں 'یہاں'' اور 'وہاں'' لکھیں گے یا ''واں'' اور ''یاں''۔ ''خرشید'' لکھیں گے یا ''خورشید'' اور ''گذشتہ'' وغیرہ میں ذال لکھیں گے یا

زے (وغیرہ)، ان باتوں کا واضح طور پر طے کیا جانا یوں ضروری ہے کہ طریقِ کار میں یکسانی رہے اور تدوین کے طریقِ کار کی بھی خلاف ورزی نہ ہو۔

ہندستان میں غالب انسٹی ٹیوٹ، مرزا غالبؔ سے متعلق سب سے وقیع اور سب سے بڑا ادارہ ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ ایسے تین، یا چار، یا پانچ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل کی جائے جو افراد اِن مسائل سے بہ خوبی واقف ہوں اور وہ کمیٹی جس طریقِ کار کا تعین کرے، اس ادارے کی مطبوعات میں اِس کی پابندی کی جائے اِس طرح سب کاموں میں یکسانی بھی رہے گی اور تحقیق و تدوین کے اصولوں کی روشنی میں طریقۂ کار کا تعین بھی کیا جا سکے گا۔ اِس کی ضرورت کئی وجہوں سے ہے۔ سب سے بڑی وجہ تو یہی ہے کہ اِس ادارے کے مقاصد میں یہ شامل ہے کہ کلامِ غالبؔ کے معتبر اڈیشن شائع کیے جائیں۔ اِس کے لیے یہ لازم ٹھہرے گا کہ انفرادی طریقِ کار پر انحصار نہ کرتے ہوئے صحتِ متن کے سلسلے میں مختلف فیہ یا غیر مختلف فیہ اہم مسائل کا گوشوارہ بنا لیا جائے اور اِس ادارے کی طرف سے مرتب کرائے جانے والے مجموعہ ہائے نظم و نثرِ غالبؔ میں اِس مسلّمہ اور متفقہ طریقِ کار کی پابندی کو لازم قرار دیا جائے۔

دوسری وجہ، جس نے اِس طرف میری توجہ خاص طور پر مبذول کرائی ہے، یہ ہے کہ ہندستان اور پاکستان میں غالبؔ کے اردو فارسی نظم و نثر کے جو مجموعے بعض اداروں کی طرف سے شائع ہوئے ہیں یا وہ اہم افراد کے انفرادی کارنامے ہیں، اِن میں مختلف طریقِ کار نظر آتے ہیں۔ ایک ادارہ فارسی کلام کو جدید ایرانی بل کہ تہرانی لہجے کی مطابقت میں مرتب کراتا ہے اور دوسرا ادارہ اِس کے برخلاف ہندستانی لہجے کی پابندی کرتا ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ اصولوں کے اور طریقِ کار کے طے نہ ہونے سے ایک ہی مجلّد میں کہیں کچھ ہے اور کہیں کچھ۔ تیسری وجہ، جس کی بنا پر اِس ضرورت کا شدّت کے ساتھ احساس ہوا ہے، وہ ہے اقبالؔ کے کلام کی اشاعت۔ اقبال صدی کی مناسبت سے کلامِ اقبالؔ کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں، اِن میں سے دو نسخے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو وہ جسے جاوید اقبالؔ نے مرتّب کیا ہے اور دوسرا وہ جسے اقبال اکادمی لاہور نے شائع کیا ہے جو پاکستان میں اقبالیات سے متعلق اہم ادارہ ہے۔ یہ دونوں نسخے باہم اِس قدر مختلف ہیں کہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے اور اِس کی اصل وجہ وہی ہے کہ کسی ادارے نے کلام کو تحقیقی طور پر مرتّب کرانے سے پہلے تصحیح و ترتیبِ متن کے سلسلے میں اصولوں کا اور طریقِ کار کا تعین نہیں کیا، اِس سے ''کہیں کچھ کہیں کچھ'' والی صورتِ حال پیدا ہوئی۔ ابھی ایسے

لوگوں کا قحط نہیں جو اِن مسائل پر صائب راے دینے کے اہل ہوں۔ اور اِسے محض حسنِ اتفاق سمجھنا چاہیے؛ اگر اِس زمانے میں اِس بنیادی کام کو کرلیا جائے گا تو گویا بڑا کام کرلیا جائے گا؛ ورنہ یہاں بھی وہی صورت رہے گی جو دوسرے اداروں کی مطبوعات میں بہ طورِ عموم نظر آتی ہے۔

(شش ماہی ''غالب نامہ'' جولائی ۱۹۹۶ء، جلد: ۱۷، شمارہ: ۲، ص ۵۹ تا ۶۴)

○○○

غالبؔ کے خطوں میں
قواعدِ زبان، تلفّظ اور املا کے مسائل

اُردو کے بڑے اساتذہ، جیسے امیرؔ مینائی، داغؔ، جلالؔ (وغیرہ) کا یہ عام انداز تھا کہ وہ شاگردوں کے کلام پر اصلاح کے ضمن میں قواعدِ زبان یا قواعدِ شاعری سے متعلّق، یا مختلف الفاظ کے محلِ استعمال اور دوسرے متعلّقات کے سلسلے میں ایسے نکات لکھ دیا کرتے تھے، جن کو وہ مانتے تھے اور اُن کے شاگردوں کے لیے بھی جن کا ماننا لازم تھا۔ اِسی طرح جب کوئی ایسی بحث اُٹھتی تھی، تو ایسے اساتذہ کے پاس استفسارات بھیجے جاتے تھے، اور وہ اُن کا جواب لکھنا ضروری سمجھا کرتے تھے۔ عام استفسارات بھی آیا کرتے تھے۔ ایسے ہزاروں خط ابھی تک محفوظ ہیں جن کا مطالعہ کیے بغیر اِس سلسلے کی بہت سی باتوں سے آگاہی نہیں ہو پائے گی۔ اردو میں جو لوگ سنجیدگی کے ساتھ تعلیم اور تدوین میں مصروف رہتے ہیں اور اِن دونوں کا حق ادا کرنا اپنی ذمّے داری سمجھتے ہیں، اُن کے لیے اِس ذخیرے سے استفادہ ازبس ضروری ہے۔ جو لوگ قواعدِ زبان اور قواعدِ ادب کے متعلّقات کو کماحقہٗ نہیں جانتے، اور کلاسکی فارسی سے واقف نہیں، ایسے لوگ صحیح طور پر کلاسکی ادب کو نہیں پڑھا سکتے اور تدوین کا کام تو کر ہی نہیں سکتے۔ یہاں یہ وضاحت شاید غیر مناسب نہ ہو کہ موضوعِ بحث یہ نہیں کہ عام طور پر کیا ہو رہا ہے، بحث اِس سے ہے کہ کیا ہونا چاہیے۔

مرزا غالبؔ کے خطوں میں قواعد کی مختلف جہتوں سے متعلّق بہت کچھ ملتا ہے۔ حُسنِ اتّفاق سے اُن کے خطوں کا خاصا بڑا ذخیرہ محفوظ ہے اور عام دست رس میں بھی ہے۔ مرزا صاحب کا شمار امیرؔ مینائی،

داغؔ یا جلالؔ جیسے اساتذہ کے زمرے میں تو نہیں کیا جا سکتا۔ وہ شاعر تو اِن سب سے بڑے تھے اور بہت بڑے، مگر زبان اور بیان کے استناد کے معاملے میں اِن اساتذہ کے برابر نہیں تھے۔ اِس بنا پر مرزا صاحب کے ایسے فرمودات کی وہ عمومی استنادی حیثیت تو نہیں، جیسی اُن اساتذہ کی نوشتوں کی ہے، مگر اِس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اِن سے مرزا صاحب کے خیالات اور مختارات کا علم ہوتا ہے اور اِس علم کی تدوین کے نقطۂ نظر سے بہت اہمیّت ہے۔ اہمیت یہ ہے کہ جن امور کے متعلّق اُنھوں نے واضح طور پر اپنی رائے ظاہر کی ہے، اُن کے اردو اور فارسی کلام کو مرتّب کرتے وقت اُن کی رائے کو لازمی طور پر سامنے رکھا جائے گا اور اُن کے جملہ کلامِ نظم و نثر کی تدوین میں التزام کے ساتھ اُس کی پابندی کی جائے گی۔ اِس طریقِ کار کو ملحوظ رکھے بغیر اُن کے کلام کی تدوین کو ناقص قرار دیا جائے گا۔ سمینار کی نسبت سے اِس تحریر میں تفصیل کی گنجایش نہیں، اِس لیے چند حوالوں پر اکتفا کرنا ایک طرح کی مجبوری ہے، لیکن اِنھیں چند حوالوں سے صورتِ حال کی ضروری وضاحت ہو جائے گی۔

تفتہؔ کے نام ایک خط میں مرزا صاحب نے لکھا ہے کہ یاے مصدری معروف ہوتی ہے اور مثال میں لفظ ''آشنائی'' لکھا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ یاے توحید و تنکیر مجہول ہوگی اور مثال میں لکھا ہے: ''آشناے، یعنی ایک آشنا، یا کوئی آشنا''۔ منشی کیول رام ہشیارؔ کے نام خط میں فارسی کے ایک شعر میں لفظِ ''کِیائی'' کے متعلّق لکھا ہے: یاے تحتانی اگر مجہول ہے، تو تعظیمی ہے۔ اگر معروف ہے، تو مصدری ہے''۔

چودھری عبدالغفور سرورؔ کے نام ایک خط میں اِس کی وضاحت کی ہے کہ ''گفتی'' اور ''گفتے'' میں کیا فرق ہے۔ ''گفتی'' بہ یاے معروف، صیغۂ واحد حاضر ہے اور ''گفتے'' (شرط اور تمنّا کے لیے) بہ یاے مجہول ہے۔ اِنھی چودھری صاحب کے نام ایک خط میں یہ وضاحت کی ہے کہ یاے وحدت، یاے تعظیم، یاے توصیف، جس طرح کہو، مجہول آئے گی۔ ''اے کریمے کہ از خزانۂ غیب، ہرگز یاے معروف نہیں، یاے مجہول ہے۔ یاے معروف یہاں نا قبول ہے: خداے کہ بالا و پست آفرید، ایسا خدا، ایسا کریم، اِس تحتانی کو یاے وحدت کہو، توصیف کہو، یاے تعظیم کہو، جس طرح کہو، مجہول آئے گی''۔

یاے معروف اور یاے مجہول کی یہ تقسیم وہی ہے، جسے شروع سے یہاں کے قواعد نویس اور ادیب و شاعر مانتے آئے ہیں۔ ایران والے بھی پہلے اِسی تقسیم کو مانتے تھے۔ ہندستان میں یہ تقسیم وہیں سے آئی تھی۔ اب ایک زمانے سے ایرانی لہجے میں مجہول آواز باقی نہیں رہی، لیکن ہندستانی لہجے میں ایسی

کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ غالبؔ کی ایران دوستی بل کہ ایران پرستی سے سب واقف ہیں، اِس کی انتہا یہ تھی کہ وہ خسرؔو کے سوا کسی ہندستانی کو قابلِ استناد نہیں مانتے تھے، وہ ایران میں لہجے کی اِس تبدیلی سے بھی واقف تھے، اِنھیں معلوم تھا کہ اب ایران میں نہ غنّہ آواز ہے اور نہ مجہول آواز ہے، مگر وہ اِسے قاعدے کی یا تلفّظ کی مستقل تبدیلی نہیں، لہجے کی تبدیلی مانتے تھے۔ یعنی لہجے کو قاعدہ ماننے کے لیے تیّار نہیں تھے۔ لہجے کی تقلید کو اُنھوں نے ''بھانڈپن'' کہا ہے۔ قدؔر بلگرامی کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''صاحبِ بندہ! تحریر میں اساتذہ کا تتبّع کرو، نہ مغل کے لہجے کا۔ لہجے کا تتبّع بھانڈوں کا کام ہے، نہ دبیروں اور شاعروں کا۔ ایسی تقلید کو میرا سلام''۔

[خطوطِ غالب، مرتبہ مہیش پرشاد، ص ۱۷۹]

یہی بات اُنھوں نے اپنے رسالے تیغِ تیز میں لکھی ہے، وہاں نونِ غنّہ زیرِ بحث ہے۔ معترض کے اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اِسی ۱۸/ اور ۱۹/ صفحے میں، جہاں ''کندیدن'' کو غلط بتاتے ہیں اور ''ماند'' و ''خواند'' کو بروزنِ چاند غلط بتاتے ہیں، اور ''مُند'' و ''خُند'' بروزنِ تُند و گُند صحیح فرماتے ہیں... لاحولَ و لا قوّۃ الا باللہ! اہلِ ایران الف کو سُلا دیتے ہیں اور یہ لہجہ ہے، نہ قاعدہ۔ شاعر اور منشی کو تتبّع قواعد کا چاہیے۔ لہجے کی تقلید بہروپیوں اور بھانڈوں کا کام ہے''۔

[قاطعِ برہان و رسائلِ متعلّقہ، مرتبہ قاضی عبدالودود، ص ۲۷۰]

ضمنی طور پر عرض کروں کہ سیّد انشا نے بھی دریائے لطافت میں لہجے کی تقلید کا مذاق اُڑایا ہے اور اِسے ''تمغُّل'' کہا ہے۔ مرزا صدرالدین صفہانی اور مولوی عبدالفرقان ہندستانی کی گفتگو جہاں لکھی ہے، وہاں مولوی صاحب کے ایسے متعدد لفظوں کو بہ طورِ مثال لکھا ہے۔ مثلاً یہ کہ مولوی صاحب نے ''شما'' کو ''شمو''، 'تمغُّل' کی وجہ سے کہا۔ یا ''ایشاں'' کو ''ایشوں'' مغلیت کے غلیان کی وجہ سے۔ مرزا صاحب نے قاعدے اور لہجے میں جو تفریق کی ہے، وہ بجائے خود بالکل درست ہے۔ خود ایرانی خواہ ''ماند'' کو ''مُند'' کہیں، مگر اُسے ''گُند'' کا ہم قافیہ کبھی نہیں بنائیں گے اور ''شما'' کو ''شمو'' کہیں، مگر اُسے ''کو'' اور ''بو'' کے قافیے میں کبھی نہیں لکھیں گے۔ یعنی لفظ نہیں بدلا ہے، صرف لہجہ بدلا ہے۔

مرزا صاحب نے اپنی مختلف تحریروں میں بہت سے لفظوں کے تحت یہ صراحت کی ہے کہ اس میں واو یا ی معروف ہے یا مجہول۔ مثلاً قاطعِ برہان میں ''مدہوش'' کے متعلق یہ صراحت کی ہے کہ یہ مع واوِ مجہول ہے۔ لفظ ''شِکوہ'' کے متعلق صراحتاً لکھا ہے ''بہ کسرۂ شین وضمۂ کاف و واوِ مجہول'' [ایضاً]۔

اِسی طرح پُشتن، پُولہ، پاغوش کے متعلق صراحت کی ہے کہ یہ مع واوِ مجہول ہیں (فرہنگِ غالب)۔ ماضیِ تمنّائی اور ماضیِ استمراری کے سلسلے میں لکھا ہے: ہرگاہ خواہند کہ ماضیِ استمراری سازند، میم وتحتانیِ مجہول ماقبلِ صیغۂ ماضی آرند...وہمیں میم ویاے مجہول است کہ ماقبلِ صیغۂ ماضی معنیِ تمنّا و شرط دہد'' [ایضاً، ص ۲۳۵]۔

ے اور ہمزہ کے سلسلے میں تفتہ کے نام ایک خط میں مرزا صاحب نے لکھا ہے: ''یاد رکھو یاے تحتانی تین طرح پر ہے: (۱) جزوِ کلمہ، ع: ہمارے بر سرِ مرغاں ازاں شرف دارد۔ ع: اے سرِ نامہ نامِ تو عقل گرہ کشاے را۔ یہ ساری غزل اور مثل اِس کے جہاں یاے تحتانی ہے، جُزوِ کلمہ ہے، اِس پر ہمزہ لکھنا، گویا عقل کو گالی دینا ہے۔ (۲) تحتانیِ مضاف ہے، صرف اضافت کا کسرہ ہے، ہمزہ وہاں بھی مُخل ہے۔ جیسے: آسیاے چرخ یا آشناے قدیم۔ توصیفی، اضافی، بیانی، کسی طرح کا کسرہ ہو، ہمزہ نہیں چاہتا۔ فداے تو شوم، رہ نماے تو شوم، یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔ تیسری دو طرح پر ہے۔ یاے مصدری، اور وہ معروف ہوگی۔ دوسری توحید وتنکیر، وہ مجہول ہوگی۔ مثلاً مصدری: آشنائی، یہاں ہمزہ ضرور، بل کہ ہمزہ نہ لکھنا عقل کا قصور۔ توحیدی: آشنائے، یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے، دانا نہ کہلاؤ گے''۔

اِس سے مرزا صاحب کا یہ قطعی اصولِ کتابت معلوم ہوتا ہے کہ آخرِ لفظ میں واقع ے پر اضافت کے لیے ہمزہ کبھی نہیں لکھا جائے گا۔ اِسی طرح جن لفظوں میں ے کلمے کے جز کے طور پر آتی ہے، جیسے: راے، ہاے، واے، سراے، بجاے وغیرہ ایسے لفظ میں بھی ے پر ہمزہ کبھی نہیں لکھا جائے گا اور یہ لازم قرار پائے گا تا کہ مرزا صاحب کے کلام کی تدوین میں اِس طریقِ کتابت کی قطعیّت کے ساتھ پابندی کی جائے۔ اگر آخرِ لفظ میں واقع ایسی یاے مجہول پر ہمزہ لکھا جائے گا، تو مرزا صاحب کے الفاظ میں عقل کو گالی دی جائے گی۔

تدوین کا اصول یہ ہے کہ کسی مصنّف نے اگر واضح طور پر کسی طریقِ کتابت کی صراحت کی ہے،

تو خواہ مرتّب اُس طریقِ کتابت سے متفق نہ ہو، مگر اُس مصنّف کے کلام میں لازماً اُس کے بیان کردہ طریق کی مطابقت اختیار کی جائے گی۔ مثلاً یہی نونِ غنّہ اور یاے معروف و مجہول کی بحث ہے۔ مرتّب کی ذاتی راے کچھ بھی ہو، مرزا صاحب کے کلام میں غنّہ اور مجہول آوازوں کو قطعی طور پر برقرار رکھا جائے گا۔ مثلاً شخصے، کتابے، گفتے، کردے کو شخصی، کتابی، گفتی، کردی نہیں لکھا جائے گا اور پڑھا بھی اِسی طرح جائے گا۔ ایرانی کس طرح پڑھیں گے، یہ اُن کا معاملہ ہے، اگرچہ ہمیں خوب معلوم ہے کہ مرزا صاحب ہوں یا دوسرے ہندستانی شاعر، ایرانیوں کے لیے وہ شروع ہی سے نا قابلِ التفات رہے ہیں، غالبؔ ہوں یا بیدلؔ، اِن کے فارسی کلام کو ہمیں پڑھتے ہیں اور ہمیں پڑھیں گے۔

مرزا صاحب کے خطوں میں قواعد، تذکیر و تانیث، تلفّظ اور املاے الفاظ سے متعلّق بہت سی معلومات بکھری ہوئی ہے، جب تک اِس ساری معلومات کی شیرازہ بندی نہیں کی جائے گی، مکمّل گوشوارہ نہیں بنایا جائے گا، اور اُن سب مندرجات پر بحث کر کے طریقِ کار کا تعیّن نہیں کیا جائے گا، اُس وقت تک نہ تو اردو کلام کی تدوین صحیح طور پر ہو سکے گی اور نہ فارسی کلام کی۔

یہاں اِس طرف توجّہ دلانا ضروری ہے کہ مرزا صاحب کے ایسے خطوں کے منتخب اجزا سے متعلّق مفصّل حواشی کا لکھا جانا ازبس ضروری ہے۔ توضیحی حواشی کے بغیر بعض باتیں صحیح طور پر سامنے نہیں آ سکیں گی۔ میں صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ مرزا صاحب نے قدرؔ بلگرامی کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''فریاد، مونث، ''فریاد کرنی'' چاہیے۔ فریاد کرنا انگریزی بولی ہے'' [ادبی خطوطِ غالب، ص۱۷۲]۔

مرزا صاحب کا یہ لکھنا کہ ''فریاد کرنا'' انگریزی بولی ہے، درست نہیں۔ جب تک اِس اقتباس پر توضیحی حاشیہ نہیں لکھا جائے گا، اُس وقت تک صحیح بات سامنے نہیں آ سکے گی۔ مقدّمہ نور اللّغات میں اور اُس پر تبصرے کے تحت فرہنگِ اثر میں ''نا'' علامتِ مصدر کے بدلنے یا نہ بدلنے کی ضروری تفصیل موجود ہے، حاشیے میں اُسے نقل کیا جائے گا اور وضاحت کی جائے گی کہ ''کرنا'' اور ''کرنی'' میں دہلی اور لکھنؤ کا اختلاف ہے۔ اسمِ مونث کے ساتھ دہلی میں ''نی'' آتا ہے، جیسے: روٹی کھانی اور فریاد کرنی۔ بیش تر موخّر اساتذۂ لکھنؤ اسم کی مناسبت سے علامتِ مصدر ''نا'' کو بدلنے کے قائل نہیں اور اِس اعتبار سے ''فریاد کرنا'' بالکل درست ہے۔ داغؔ کے ایک معروف شاگرد مہرؔ گوالیاری کے دیوان شعاعِ مہر میں سندیلے کے ایک طرحی مشاعرے کی غزل ہے، جس کے ردیف و قوافی ہیں: اثر ہونا، سفر

ہونا؛ اُس کا مقطع ہے:

یہاں ہیں مہر اہلِ لکھنؤ بھی، اہلِ دہلی بھی
یہ کہتے ہیں ''سحر ہونی''، وہ کہتے ہیں ''سحر ہونا''

مرزا صاحب نے ایک خط میں ''خرشید'' اور ''خورشید'' پر اظہارِ رائے کیا ہے، اِس خط میں اُنھوں نے یہ بھی لکھا ہے: ''رہا خورشید، چاہو بے واو لکھو، چاہو مع الواو لکھو، میں بے واو لکھتا ہوں، مگر مع الواو کو غلط نہیں جانتا اور ''خُر'' کبھی بے واو نہ لکھوں گا، قافیہ ہو یا نہ ہو، یعنی نظم میں وسطِ شعر میں آپڑے، یا نثر کی عبارت میں واقع ہو، ''خور'' لکھوں گا'' [مکتوب بہ نام میر مہدی مجروح]۔

''خورشید'' کے سلسلے میں مرزا صاحب کی نگارش موضوعِ بحث رہی ہے اور اُن کی راے سے اختلاف کیا گیا ہے، مگر اِس بات کو نظر انداز کر دیا گیا کہ مرزا صاحب نے اور جو کچھ بھی لکھا ہو، لیکن اُنھوں نے ''خورشید'' مع واو کو غلط نہیں کہا، ہاں ''خرشید'' (بغیر واو) کو مرجّح قرار دیا ہے اور یہ وضاحت کی ہے کہ میں ''خرشید'' لکھتا ہوں، اور اس کے مخفف کو ''خور''۔ توضیحی حاشیے میں دوسری وضاحتوں کے ساتھ ساتھ یہ وضاحت شامل ہوگی کہ مرزا صاحب ''خورشید'' کو غلط نہیں، مرجّح سمجھتے تھے۔ اُن کے منقولۂ بالا واضح بیان کی روشنی میں اُن کے کلامِ نظم و نثر میں، وہ اردو کا ہو یا فارسی کا ''خرشید'' اور ''خور'' لکھے جائیں گے۔

قواعدِ زبان، قواعدِ شاعری اور لُغت سے متعلّق مسائل کے ساتھ ساتھ مرزا صاحب کے خطوں میں ایسے نکتے بھی ملتے ہیں جن کو نظر میں رہنا چاہیے۔ میں خاتمۂ سخن کے طور پر صرف ایک خط کے ایسے اندراج کو پیش کروں گا۔ اِس کا تعلّق ترجمہ کرنے کے طریقِ کار سے ہے۔ اگر مرزا صاحب کے فارسی کلام کا اردو میں ترجمہ کیا جائے، تو اِس بیان کو اور اُن کے بعض ایسے دوسرے بیانات کو ضرور پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ قدر بلگرامی کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

> ''اسما یا لغات کے واسطے یہ بات ہے کہ عربی میں ہے کہتے ہیں اور فارسی میں یہ اور ہندی میں یہ ... محاوراتِ ہندی کی فارسی یا فارسی کی ہندی کبھی نہیں ہوسکتی۔ مثلاً: چوری کا گُڑ میٹھا۔ اِس کی فارسی نہ پوچھے گا، مگر نادان۔ ''سہی'' اور ''تو سہی'' کی فارسی کیوں کر بنے، یہ روزمرّہ اُردو ہے۔ ع: گر نہیں وصل، تو حسرت ہی

سہی، اسی مطلب کے مطابق فارسی عبارت یوں ہوسکتی ہے: وصل اگر نیست، حسرت نیز عالمے دارد... اہلِ ہند کی فارسی اِسی طرح خام اور ناتمام رہی کہ اصول میں اُنھوں نے فارسی کے قواعد کی تطبیق عربی سے چاہی اور اردو کے خاص روزمرّوں کی فارسی بنایا کیے۔ ہندی میں ''کچھ نہیں'' کی جگہ ''خاک نہیں'' بولتے ہیں، فارسی میں ''ہیچ نیست'' کی جگہ ''خاک نیست'' کبھی کوئی نہ کہے گا''۔

[ادبی خطوطِ غالب، ص ۱۶۷]

میرا خیال ہے کہ اِس مختصر سی گفتگو سے یہ وضاحت بہ خوبی ہوگئی ہوگی کہ مرزا صاحب کے خطوں کا (اور اُن کی دوسری تحریروں کا) مطالعہ اِس لحاظ سے بھی ضروری ہے اور یہ بھی کہ جب تک بحث طلب الفاظ کا مکمل گوشوارہ نہیں بنایا جائے گا اور اُن کے خطوط اور تحریروں کو سامنے رکھ کر اُن پر توضیحی حواشی نہیں لکھے جائیں گے، اُس وقت تک اُن کے کلامِ نظم ونثر کی تدوین کا اہتمام اور انصرام کماحقہٗ نہیں ہو سکے گا۔ چوں کہ ابھی تک یہ اہتمام نہیں کیا جاسکتا ہے، یعنی اُن کی مطبوعہ اور خطّی تحریروں کو سامنے رکھ کر الفاظ کا اور مندرجہ قاعدوں کا گوشوارہ نہیں بنایا گیا، اِس وجہ سے اب تک اُن کے اردو یا فارسی کلام کے جو نسخے چھپے ہیں، اُن کا متن تدوین کے اصولوں کے مطابق نقائص سے خالی نہیں اور بہت سے مقامات بحث طلب ہیں۔

[غالب نامہ، جولائی ۱۹۹۹ء، جلد: ۲۰، شمارہ: ۲، ص ۹ تا ۱۶]

○○○

یادگارِ غالب

مقدمۂ شعر وشاعری کی طرح یادگارِ غالب کو بھی اپنے موضوع پر بنیادی کتاب کی حیثیت حاصل ہے۔ پچھلے پچاس ساٹھ برسوں میں مرزا صاحب کی شخصیت، اردو نثر اور اردو شاعری سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے، اِس کے باوجود سو برس سے زیادہ پرانی کتاب یادگارِ غالب کی اساسی حیثیت آج بھی برقرار ہے۔ اِس قول کے ساتھ اگر اِس جملے کو شامل کرلیا جائے کہ مرزا صاحب کی فارسی نثر اور فارسی شاعری سے متعلق حالؔی نے جو کچھ لکھا تھا، اُس پر ذرا سا بھی اضافہ نہیں کیا جاسکا ہے، تو بات مکمل ہوجائے گی۔ اسباب سے یہاں بحث نہیں، واقعہ یہی ہے۔ یہ واضح کردیا جائے کہ برہانِ قاطع سے تعلّق رکھنے والی بحثیں اِس قول کے دائرے سے باہر کی چیز ہیں۔ اِن کا تعلّق لسانی مباحث سے ہے، تنقید یا ادبی تحقیق سے نہیں۔

یادگارِ غالب کا پہلا حصّہ مرزا صاحب کے حالاتِ زندگی اور اُن کی اردو نثر و نظم کے تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔ حالاتِ زندگی سے متعلّق جو کچھ حالؔی نے لکھا ہے، وہ تحقیق کے ذیل میں آتا ہے اور اِس وقت اِس حصّے کا تحقیقی پہلو ہی پیشِ نظر ہے۔ تنقیدی پہلو اِس تحریر کے دائرے میں نہیں آتا۔

یہ بات ہمارے سامنے ضرور رہنا چاہیے کہ حالؔی کا ذہن تنقیدی مباحث سے جیسی قریب کی نسبت رکھتا تھا، تحقیقی مباحث سے اُن کے مزاج کو ویسا علاقہ نہیں تھا۔ اِسی وجہ سے اِس کتاب کا تحقیقی حصّہ خاصا کم زور ہے اور حالؔی کے بہت سے بیانات قابلِ قبول نہیں۔ ایک مشکل اور بھی تھی۔ مولانا کو مرزا صاحب سے بہ قولِ خود شاگردی کی نسبت بھی حاصل تھی، وہ برائے نام سہی، لیکن وہ مرزا صاحب کو اپنا

اُستاد مانتے تھے اور مرزا صاحب کے علمی کمالات کے ساتھ ساتھ اُن کی سماجی حیثیت اور خاندانی وقار کو بھی مانتے تھے۔ اِس کے اثرات اُن کے ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ ایسی کوئی بات نہیں لکھنا چاہتے تھے جس سے مرزا صاحب کی کوئی کم زوری یا بُرائی نمایاں ہو جائے۔ یہ میری رائے ہے کہ حالیؔ کو بہت سے واقعات کا علم تھا۔ وہ اگر اپنے طور پر اِن کو لکھتے تو بعض ایسی باتیں ضرور بیان میں آجاتیں جو اُن کے نزدیک وضاحت طلب نہیں تھیں۔ اِس الجھن اور اِس کشمکش سے چھٹکارا حاصل کرنے کا یہ طریقہ اُنھوں نے اختیار کیا کہ بعض اہم واقعات کے بیان میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے خود مرزا صاحب کے بیانات کو نقل کر دیا، اِس طور پر کہ سوانح نگار کی حیثیت سے اُن کے کسی بیان کا جائزہ نہیں لیا۔ اس طریقۂ کار نے کئی واقعات کی حقیقی شکل صورت کو سامنے نہیں آنے دیا۔

اِس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ یہ کتاب انیسویں صدی کی آخری دہائی کی یادگار ہے۔ تب سے اب تک مرزا صاحب کے حالاتِ زندگی سے متعلّق بہت سی نئی معلومات ہمارے سامنے آئی ہے جو مولانا حالیؔ کی دسترس میں نہیں تھی۔

اِس صورتِ حال کے تحت یہ بات بہت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ یادگارِ غالب کے پہلے حصّے کو ایک مستقل کتاب کے طور پر جدید طریقۂ تدوین کے تحت مرتّب کیا جائے۔ اِس میں مفصّل توضیحی حواشی ہوں، جن میں وہ ساری معلومات بہ قدرِ ضرورت شامل کر دی جائے جس کی مدد سے اِس کتاب کے مندرجات صحیح طور پر اور بہتر طور پر سامنے آ سکیں۔

پہلے حصّے کی تدوین کے سلسلے میں دو تین باتوں کو خاص طور پر مرتّب کے ذہن میں رہنا چاہیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مرزا صاحب زندگی بھر اِس کش مکش کا شکار رہے کہ خاندانی وقار اور حالات کے تقاضوں کے تحت بات کیسے بنائی جائے۔ یہ درست ہے کہ خاندانی وقار اور اپنے کمال کا احساس کبھی کبھار اِن کی مصلحت شناسی پر غالب آجاتا تھا۔ ایسا ہوتا تو تھا، مگر کم؛ عموماً مصلحت کے تقاضوں کو وہ ملحوظ رکھا کرتے تھے۔ اِس کے نتیجے میں بھی اِن کے کچھ بیانات باہم مختلف ہیں۔ اِسی دباو کے تحت وہ ایسی باتیں کہنے پر بھی مجبور ہوئے جو بجائے خود صحیح نہیں تھیں۔ ایسے مقامات حاشیہ نگار کی توجّہ کے خاص طور پر مستحق ٹھہریں گے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مرزا صاحب عادتاً جھوٹ بولا کرتے تھے اور یہ کہ وہ طبعاً راست گفتار نہیں تھے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ جن غیر موافق حالات سے وہ زندگی بھر دو چار رہے، جس کش مکش نے اُن کو مبتلائے پیچ و

تاب رکھا، یہ اِس کے نشانات ہیں۔ ہاں تحقیق کی نگاہ میں غلط بیان اور باہم مختلف بیانات ہر صورت میں تصحیح طلب ہوتے ہیں؛ اِس بنا پر حواشی میں ایسے جملہ بیانات کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔

مولانا کے لکھے ہوئے بعض واقعات کے تحت ایسی تشریحی عبارتوں کا اضافہ ضروری معلوم ہوتا ہے جن سے وہ باتیں اپنے مالہٗ و ماعلیہ کے ساتھ نظروں کے سامنے آسکیں۔ اِس سلسلے کی تیسری بات یہ ہے کہ اِس کتاب کے لکھے جانے کے بعد جو معلومات سامنے آئی ہے، وہ ہمارے علم میں تو ہے، مگر بکھری ہوئی ہے؛ کچھ اِس مضمون میں، کچھ اُس کتاب میں۔ جو حواشی لکھے جائیں گے، اِن کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ بہت سی معلومات ترتیب کے ساتھ یک جا ہو جائیں گی۔ اِس طرح توضیح، تکمیل اور تصحیح؛ اِن تینوں عنوانات کے تحت اضافوں کے ساتھ اِس کتاب کے پہلے حصّے کا یہ جدید اڈیشن اساتذہ، طلبہ اور دوسرے ادب دوستوں اور مرزا صاحب کے کمالات کا اعتراف کرنے والوں کے لیے دستاویزی حیثیت کا بیش قیمت تحفہ ہوگا۔

حواشی کی تسوید اور ترتیب کا انداز کیا ہونا چاہیے، اِس کا تعلّق تو مرتّب کے طریقۂ کار سے ہوگا۔ اِن میں کس طرح کے اجزا شامل ہو سکتے ہیں، اُس کا موٹا سا اندازہ کرنے کے لیے محض بہ طورِ مثال ذیل میں ایسے چند مقامات کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

حالاتِ زندگی کے تحت حالؔی نے جُوے کے سلسلے میں مرزا صاحب کے قید ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ پورا بیان حقائق کے خلاف ہے اور یہاں مولانا حالؔی سوانح نگار کے بجائے محض سعادت مند شاگرد نظر آتے ہیں جس کی کوشش یہ نظر آتی ہے کہ استاد پر الزام نہ آنے پائے۔ اِس کے لیے اِنھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اپنی طرف سے کچھ لکھنے کے بجائے خود مرزا صاحب کے ایک فارسی خط کا ترجمہ درج کر دیا۔ اُس کے مندرجات کا جائزہ لیے بغیر جس میں مرزا صاحب نے یہ لکھا ہے کہ کوتوال میرا دشمن تھا اور مجسٹریٹ مجھ سے ناواقف تھا، یعنی مرزا صاحب کے لکھنے کے مطابق وہ بے گناہ تھے، حالاں کہ یہ واقعے کے خلاف ہے۔ حالؔی نے قید کا جو سنہ لکھا ہے، وہ بھی درست نہیں۔ حالی نے یہ بھی نہیں لکھا کہ مرزا صاحب اِس واقعے سے چند برس پہلے بھی ایک بار اِسی علّت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ مولانا عرشؔی نے مکاتیبِ غالب کے مقدّمے میں اِس سلسلے کی بیش تر تفصیلات کو یک جا کر دیا ہے۔ مالک رام صاحب نے (ذکرِ غالب میں) اور مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی (نقشِ آزاد میں) اِس سلسلے میں کچھ ضروری

باتیں لکھی ہیں۔ یادگارِ غالب کے حاشیہ نگار کو اِس اندراج کے تحت جملہ ضروری تفصیلات کی نشان دہی کرنا چاہیے اور صحیح تاریخ اور سنہ کا بھی تعیّن کیا جانا چاہیے۔ اِس سلسلے میں ایک ضمنی بات بھی ایسی ہے جسے شاملِ حاشیہ کیا جانا مناسب بھی ہوگا اور شاید ضروری بھی۔ جو کچھ ہوا، وہ حادثے سے کم نہیں تھا، مگر ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ ہاں پہلے وہ جرمانے کی رقم ادا کر کے قید سے بچ گئے تھے۔ توجہ طلب بات یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایسی کوئی شہادت موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ پہلے واقعے کے بعد اُن کی عزّت و وقار میں کسی طرح کی کمی ہوئی تھی۔ دوسری بار واقعہ سخت تھا، مگر اُس کے بعد بھی ایسا نہیں ہوا کہ اُن کی سماجی یا علمی حیثیت پر حرف آیا ہو۔ مغل بادشاہ نے اُس کے بعد یعنی اُس واقعۂ قید و بند کے بعد اِن کو ''نجم الدّولہ، دبیر الملک، نظام جنگ'' کے خطابات، چھے پارچے کے خلعت اور تین رقومِ جواہر کے ساتھ عطا کیے تھے۔ اُس کے بعد اُنھوں نے اُستادِ شاہ ہونے کا شرف پایا، جو اُس زمانے کی روایت کے مطابق معمولی بات نہیں تھی۔ پھر فرماں روائے رام پور کا استاد بننے کی عزّت بھی اُن کو حاصل ہوئی تھی۔ یہ باتیں اِسی پر دلالت کرتی ہیں کہ مرزا صاحب کے معاشرے نے، جو طبقۂ اشرافیہ کا معاشرہ تھا، قماربازی کے جُرم میں اِس قید اور اِس جرمانے کو کوئی ایسی چیز نہیں سمجھا تھا جس کی بنا پر مرزا صاحب کی سماجی اور علمی حیثیت ختم ہو جائے یا کم ہو جائے۔ اِس سلسلے میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے یہ الفاظ بھی ہمارے سامنے رہنا چاہیے:

> ''مجھے مرزا صاحب سے عقیدت اُن کے زُہد و اتّقا کی بنا پر نہ تھی، فضل و کمال کی بنا پر تھی۔ گرفتاری کے بعد بھی اُن کا فضل و کمال ایسا ہی ہے جیسا پہلے تھا''۔

آج اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ مرزا صاحب کا جُوا کھیلنا، یا اپنے مکان پر جُوا کھیلنے کا انتظام کرنا، اُن کا شراب پینا یا جُوے کی علّت میں قید ہونا بجائے خود جو بھی حیثیت رکھتا ہو، ان کی شاعرانہ عظمت اور اُن کی شخصیت پر ان باتوں سے ذرا بھی حرف نہیں آتا؛ یہ دو قطعی طور پر مختلف باتیں ہیں؛ تو یہ بات صرف ہم اِس زمانے میں نہیں کہتے، مرزا صاحب کے زمانے کے اربابِ اعتبار بھی اِس بات کو مانتے تھے اور وہ سب لوگ جو خوش ذوقی سے محروم نہیں اور تنگ نظری سے بے تعلّق رکھتے ہیں، ایسے لوگ ہر زمانے میں اِس بات کو مانیں گے۔ یادگارِ غالب کے پہلے حصّے کا حاشیہ نگار اِس پورے واقعے کے ذیل میں اِس ضمنی بات کو بھی شاملِ تحریر کرلے گا تو یہ بہتر ہوگا کہ اِس طرح ایک قابلِ توجہ پہلو روشنی میں آجائے گا۔

مولانا حالؔی نے وضاحت کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ ایک شخص پارسی نژاد جس کا اصلی نام ''ہُرمُز د'' تھا اور اسلامی نام عبدالصمد، وہ آگرے میں اور پھر دلّی میں مرزا صاحب کے ساتھ دو برس تک مقیم رہا تھا۔ ''میرزا نے اُس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی'' [ص۱۴]۔ اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ مرزا صاحب کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ ''عبدالصمد'' محض ایک فرضی نام ہے۔ مولانا عرشؔی، قاضی عبدالودود اور مالک رام صاحب کی تحریریں اِس بحث سے متعلق موجود ہیں۔ قاضی صاحب اور عرشؔی صاحب دونوں یہ مانتے ہیں کہ عبدالصمد وجودِ خارجی سے محروم تھا، وہ مرزا صاحب کے ذہن کی تراشی ہوئی ایک شکل ہے اور یہی بات درست معلوم ہوتی ہے۔ بہ ہر طور، ایک مفصّل حاشیے میں اِس سے متعلّق تحریروں کے ضروری اجزا کو یک جا کر دیا جانا چاہیے۔ ساتھ ہی اِن مختلف اجزا کا تجزیہ کر کے صحیح صورتِ حال معلوم کرنے کی کوشش کی جانا چاہیے۔ اِس سلسلے کی یہ دو باتیں ہمیں معلوم ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک مالک رام صاحب کے سوا باقی اربابِ نظر نے جنھوں نے اِس موضوع پر مضامین لکھے ہیں، یہ مانا ہے کہ مرزا صاحب کی مصلحت اندیشی نے معترضوں کا منہ بند کرنے کے لیے اِس وجودِ ذہنی کی تشکیل کی تھی، اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ مالک رام صاحب ہر طرح کی روایتوں کو بہ آسانی قبول کر لیا کرتے تھے۔ اُن کی کتاب تذکرۂ ماہ وسال میں اور تذکرۂ معاصرین کی چاروں جلدوں میں جو بے شمار غلطیاں ہیں، اُس کی بڑی وجہ اُن کی یہی کم زوری ہے۔

اپنے کمال اور خاندانی وقار کا احساس مرزا صاحب کے ذہن میں ہمیشہ رہتا تھا۔ دوسری طرف اُن کی کبھی نہ ختم ہونے والی معاشی ضرورتیں تھیں جو مصلحت پسندی پر آمادہ کر دینے کے لیے ہمہ وقت کارفرما رہا کرتی تھیں۔ اِس طرح کشاکش کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ وجود میں آ گیا تھا۔ مرزا صاحب دُنیاوی معاملات میں خاصے مصلحت شناس تھے؛ مگر جذبۂ بے اختیارِ شوق کے دباو کے تحت کبھی کبھی یہ عالم نمایاں ہو جاتا تھا کہ: سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا۔ قیامِ لکھنؤ کا واقعہ اِس کی بہترین مثال ہے اور اِسی لیے اِس واقعے کو اُن کے سوانح میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ مولانا حالؔی نے لکھا ہے:

> ''جب مرزا نے دلّی سے کلکتے جانے کا ارادہ کیا تھا، اُس وقت راہ میں ٹھہرنے کا قصد نہ تھا؛ مگر چوں کہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدّت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں، اِس لیے کان پور پہنچ کر اُن کو خیال آیا کہ

لکھنؤ بھی دیکھتے چلیں۔ اُس زمانے میں نصیرالدین حیدر فرماں روا اور روشن الدّولہ نائب السلطنت تھے... روشن الدّولہ کے یہاں بہ عنوانِ شایستہ اُن کی تقریب کی گئی...لیکن مرزا صاحب نے ملاقات سے پہلے دو شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں۔ایک یہ کہ نائب میری تعظیم دیں۔ دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھا جائے''۔[ص ۲۷]

یادگارِ غالب کے حاشیہ نگار کے لیے اِس بیان میں چار باتیں خاص طور پر توجّہ طلب ہیں۔اِن میں دو تصحیحات ہوں گی، ایک اضافہ ہوگا اور ایک وضاحت ہوگی۔حالؔی نے اِس اہم واقعے کے ذیل میں کہیں بھی تاریخ نہیں لکھی کہ یہ کب کا واقعہ ہے۔سند کا تعیّن ضروری تھا۔سفرِ کلکتہ کے سلسلے میں تاریخوں کے تعیّن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔یہ ضروری ہوگا کہ اس بیان سے متعلّق حاشیے میں لکھنؤ میں مرزا صاحب کے ورود اور پھر وہاں سے کلکتے کی طرف جانے کی تاریخوں کا تعیّن کیا جائے۔

حالؔی نے لکھا ہے:''اُس زمانے میں نصیرالدّین حیدر فرماں روا اور روشن الدّولہ نائب السلطنت تھے''۔دیگر شواہد کے سوا خود مرزا صاحب کا قول موجود ہے کہ اُن دنوں معتمدالدّولہ وزیرِ اعظم تھے:

لائی ہے معتمد الدّولہ بہادر کی اُمید
جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

اِس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اُس زمانے میں نصیرالدین حیدر نہیں، غازی الدین حیدر فرماں روا تھے۔حاشیے میں اِس کی وضاحت ضروری ہے اور یہ بھی کہ جب معتمدالدّولہ سے ملاقات نہ ہو سکی، تو مرزا صاحب نے منقولۂ بالا مصرعے کو بدل دیا۔متداول دیوان میں یہ مصرع اس شکل میں ملتا ہے: لیے جاتی ہے کہیں ایک توقّع غالبؔ۔

حالؔی کے لکھنے کے مطابق مرزا صاحب کو کان پور پہنچ کر یہ خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیں۔ حالؔی کے اِس بیان سے اختلاف کیا گیا ہے۔مالک رام صاحب نے مرزا صاحب کی طویل فارسی عبارت کے حوالے سے لکھا ہے کہ میں کان پور پہنچ کر سخت بیمار ہو گیا۔چوں کہ کان پور میں مناسب علاج کا انتظام نہیں تھا، یوں اُسی بیماری کے عالم میں لکھنؤ آ گیا۔لکھنؤ میں وہ کئی مہینے مقیم رہے تھے، اِس سے بہ ظاہر مرزا صاحب کے قول کی تائید ہوتی ہے، مگر ایک یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا لکھنؤ

پہنچ کر مرزا صاحب کو خیال آیا کہ فرماں روائے اودھ کی مدح میں قصیدہ لکھنا چاہیے؟ کئی اُمور بہ ظاہر اِس پر دلالت کرتے ہیں کہ مرزا صاحب جب دہلی سے چلے ہیں، تو لکھنؤ میں قیام کا اور فرماں روائے ملک سے ملنے کا خیال اُن کے ذہن میں موجود تھا۔ حاشیے میں اِن سب باتوں پر روشنی ڈالی جانا چاہیے۔

اِس واقعے کے سلسلے میں ایک ذیلی سوال اور پیدا ہوتا ہے جو اہمیّت سے خالی نہیں اور حاشیہ نگار کے لیے خاص طور پر نظر طلب ہے۔ مرزا صاحب اپنے ہی الفاظ میں اُن دنوں مصیبت، بے بسی اور قرض کے افسوس ناک حالات میں مبتلا تھے۔ دربارِ اودھ سے یافت کی توقّع ہوسکتی تھی اور یہ بات اُن کے ذہن میں تھی۔ اُنھوں نے نائب السلطنت کی مدح میں نثر لکھی، شاہِ وقت کی مدح میں قصیدہ لکھا؛ یعنی قاعدے کے مطابق حُسنِ طلب کا پورا اہتمام کرلیا۔ یہ ایک پہلو تھا۔ دوسری طرف مرزا صاحب کا احساسِ برتری تھا، جس کی بنیاد تین نقطوں پر قائم تھی: شاعرانہ کمال، خاندانی وقار اور دہلی سے نسبت جو اُس مغل سلطنت کا مرکز تھا جہاں سے اودھ کی حکومت کو سندِ حکومت ملتی رہی تھی۔ مرزا صاحب نے جو اِس پر اصرار کیا کہ مجھے نذر پیش کرنے سے معاف رکھا جائے اور یہ کہ نائب السلطنت کھڑے ہوکر میری پذیرائی کریں، غالباً یہ اِسی احساس کا شاخسانہ تھا۔ نذر پیش کرنے کا مطلب ہوتا ہے زیردستی کا اعتراف اور اعلان، اور مرزا صاحب اِس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اُن کا ذہن اِس حقیقتِ واقعہ کو نہیں قبول کرسکا کہ اب دربارِ اودھ پچھلے دنوں کی طرح نوّاب وزیر کا دربار نہیں، ایک بادشاہ کا دربار ہے اور آغا میر اُسی بادشاہ کے وزیرِ اعظم ہیں۔ مرزا صاحب اُس نئی صورتِ حال سے واقف تو تھے، مگر اُن کا ذہن اُس کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مرزا صاحب کے الفاظ میں ''گدا طبع سلطان صورت'' آغا میر مرزا صاحب کی

دونوں شرطیں ماننے کے لیے تیار نہیں ہوا اور وہ بہ قولِ خود اِس سے کم کو ''آئینِ خویشتن داری'' کے خلاف خیال کرتے تھے۔ یہ واقعہ ایک مفصّل حاشیے کا طلب گار ہے۔

مرزا صاحب نے اردو میں خط لکھنا کب سے شروع کیا، اِس سلسلے میں مولانا حالؔی کا بیان یہ ہے: ''معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط کتابت کرتے تھے''۔ اِس کی ایک وجہ بھی اُنھوں نے لکھی ہے۔ پچھلے پچاس برسوں میں اِس سلسلے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اِس سے متعلّق مفصّل حاشیہ لکھا جانا ضروری ہے جس میں اِس مبحث سے متعلّق دست یاب تحریروں کے ضروری اقتباسات کو یک جا

کر کے، اُن کا جائزہ لے کر بعض اُمور کا تعیّن کیا جا سکتا ہے یا نشان دہی کی جا سکتی ہے۔

اِن چند مقامات کا حوالہ اِس وضاحت کے لیے کافی ہوگا کہ اِس کتاب کے پہلے حصّے کا ایک نیا اڈیشن مرتّب کیا جانا کس قدر ضروری ہے اور یہ کہ حواشی کا انداز کیا ہو سکتا ہے۔ادب کے عام خوش ذوق قارئین کے لیے، طالبِ علموں کے لیے اور بیش تر اساتذہ کے لیے یہ نیا اڈیشن ایک نعمتِ غیر مترقّبہ سے کم نہیں ہوگا۔

(غالب نامہ، جولائی ۲۰۰۲ء، جلد: ۲۳، شمارہ: ۲، ص ۱۹ تا ۲۸)

○○○

قابلِ اعتماد متن کی تلاش

[غالبؔ کے دیوان میں کتنے لفظ ہیں؟ الفاظ شماری کے لحاظ سے یہ جائزہ بھی کام کی چیز ہے۔ وہ لفظ کیسی کیسی معنوی جہتوں کے نشانات ہیں؟ اگر یہ بھی معلوم ہوتا رہے تو لفظ شماری کا سادہ سا کام غالبؔ کے الفاظ میں ''سادہ و پُرکارتر'' بن جائے گا۔ اِس کے لیے ضروری ہوگا کہ ہر لفظ کے ساتھ متعلّقہ شعر بھی نظر کے سامنے آجائے اور یہ بھی ضروری ہوگا کہ ہر شعر کا متن قابلِ اعتماد ہو۔ بس یہاں قلم رُک جاتا ہے اور سوالات پریشان کرنے لگتے ہیں۔ یہ تحریر جو زیرِ ترتیب کتاب گنجینۂ معنی کا طلسم کے مقدّمے کا ابتدائی حصّہ ہے، متنِ دیوانِ غالبؔ سے متعلّق پریشان کرنے والے کچھ سوالوں کے بیان پر مشتمل ہے۔ پہلے تمہید، پھر اصل بات]۔

کسی لفظ کو ہم کاغذ پر لکھیں تو وہ محض ایک نقش معلوم ہوگا، ایک شکل ہوگی غیر متحرک۔ اُس وقت ہم صرف اُس کے معنی سے واقف ہوں گے۔ اُسی لفظ کو جب ہم کسی شعر میں پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اُس کے باطن میں چھپی ہوئی معنویت نمایاں ہونے لگی ہے۔ اِس کی وجہ شاید یہ ہوتی ہے کہ شعر میں وہ لفظ ایک خاص انداز سے، کسی طرح کی باہم مناسبت رکھنے والے الفاظ کے ساتھ آیا ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ کسی اچّھے شعر کا ایک لفظ یادداشت میں محفوظ نہیں رہا، مفہومِ شعر اور وزن کی مناسبت سے کوئی دوسرا لفظ شامل کر کے شعر مکمّل کرلیا گیا؛ مگر ایک نامعلوم سی عدمِ مناسبت کا احساس ذہن میں خلش پیدا کرتا رہا۔ جب اصل لفظ یاد آ گیا تو یہ محسوس ہوا جیسے روشنی کی ایک کرن شاملِ مفہوم ہوگئی ہے۔ اصل لفظ کی جگہ ایک اجنبی لفظ کے آجانے سے جو مناسبتیں بگڑ گئی تھیں، اُن کا رشتہ بحال ہوگیا ہے۔

بہت سے اشعار پہلی خواندگی میں اپنی تہ داری کو ذہن کی سطح پر پوری طرح روشن نہیں کرتے۔ کبھی دوبار اور کبھی بار بار پڑھنے پر معنویت کی تہیں کھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ شاید اِسی بات کو غالبؔ نے اپنے انداز میں کہا ہے:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے　　جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

کسی بڑے شاعر (اور یہاں ''بڑے'' حقیقی معنی میں استعمال کیا گیا ہے) کے مجموعۂ کلام میں کتنے لفظ ہیں، اُن کا اشاریہ بنانا بھی دل چسپ کام ہے؛ مگر اِس سے زیادہ دل چسپ اور ضروری کام ہے یہ معلوم کرنا کہ مختلف لفظوں نے کیسی کیسی معنوی جہتوں کی تشکیل کی ہے۔ اِس طرح لفظ شماری کا سادہ عمل وسیلہ بن سکتا ہے رنگا رنگ معنویت کی بازیافت اور مفاہیم کی دریافت کا۔ یہ اِسی صورت میں ہو سکتا ہے جب نگاہیں صرف لفظوں کی ظاہری شکل صورت کو نہ دیکھیں، اُن کے متعلّقات کے ساتھ اُنھیں پڑھیں بھی۔ اِس کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ ہر مفرد اور مرکّب لفظ کے ساتھ متعلّقہ شعر بھی سامنے رہے اور یہ بھی لازم ہوگا کہ ہر شعر کا متن درست ہو، ہر لفظ صحیح طور پر اپنی جگہ آیا ہو۔ ایک لفظ بھی نادرست ہوگا تو شعر کا مفہوم بگڑ سکتا ہے اور لفظ شماری کا عمل بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

غالبؔ صدی کے سلسلے میں فروری ۱۹۷۰ء میں شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی کی طرف سے ایک کتاب اشاریہ کلام غالبؔ شائع ہوئی تھی جس میں مرزا صاحب کے اردو فارسی کلام کے منتخب مرکّبات کو یک جا کیا گیا تھا۔ ہر لفظ کے ساتھ متعلّقہ مصرع بھی لکھا گیا تھا۔ اِس کے پیش لفظ میں لکھا گیا تھا:

> ''غالبؔ کے ذہن کے نقش و نگار بغیر اُن کی شاعرانہ ترکیبوں کے سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ اُن میں جو ندرت اور طرفگی ہے، وہ ہمارے ادب کی دولت اور شاعری میں اِن کی وسعتِ فکر کی دلیل ہے''۔

یہ نا تمام کام تھا مگر اپنے انداز کی منفرد کتاب تھی۔ اُس وقت تک ایسا کوئی جائزہ کتابی شکل میں سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ نا تمام کام ایک مکمّل کام کا اشاریہ نما تھا۔

میرے ذہن میں اُسی وقت یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ یہ کام بھی کرنے کا ہے۔ اِسی خیال کے تحت میں نے اب سے دو سال پہلے اِس کام کا ڈول ڈالا۔ اِس کے لیے نسخۂ عرشی طبعِ اوّل کو بنیاد بنایا گیا۔ یہ

نسخہ پہلی بار ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا۔ پھر ۱۹۸۲ء میں اِس کا دوسرا اڈیشن شائع ہوا۔ اصولِ تحقیق کے مطابق اشاعتِ ثانی کو بنیاد بنایا جانا چاہیے تھا اور سارے اشعار اسی نسخے سے نقل کیے جانا چاہیے تھے۔ اصول کی بات تو یہی تھی، مگر جب طبعِ ثانی کے اشعار کا تقابل کیا گیا تو معلوم ہوا کہ طبعِ ثانی میں بہت سے اشعار کا متن نادرست ہے یا بحث طلب ہے، اُسے بنیادی نسخے کے طور پر سامنے نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ بجائے خود پریشان کُن صورتِ حال تھی۔ اِس لیے یہ لازم آیا کہ بنیادی نسخے کی حیثیت سے طبعِ اوّل کو سامنے رکھا جائے۔

میں نے اپنی کتاب املاے غالب میں لکھا تھا:

''اردو اشعار کے لیے بہ طورِ عموم دیوانِ غالب نسخۂ عرشی......کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ یہ وضاحت کردی جائے کہ اشاعتِ اوّل کے حوالے دیے گئے ہیں۔ ایک دو ضمنی حوالوں سے قطع نظر اشاعتِ ثانی کو بہ طورِ کتابِ حوالہ استعمال نہیں کیا گیا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اس اشاعت کے سرورق پر بہ طورِ مرتّب نام تو عرشی صاحب ہی کا چھپا ہوا ہے؛ مگر یہ مجھے معلوم ہے کہ اشاعتِ اوّل پر نظرِ ثانی کا کام اُن کی طویل علالت کے دوران ہوتا رہا جو مکمّل طور پر اُن کا کام نہیں۔ اِس نسخے میں کچھ اضافے بھی ہیں اور اُن کے ذمّے دار بھی وہ نہیں۔ بعض کمیوں اور کچھ فروگذاشتوں کے باوجود کتابِ حوالہ کی حیثیت نسخۂ اشاعتِ اوّل کو حاصل ہے جو مکمّل طور پر عرشی صاحب کا مرتّب کیا ہوا ہے''۔ (ص ۱۹)

دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کی اشاعتِ ثانی میں ''گزارش'' کے تحت عرشی زادہ (اکبر علی خاں فرزندِ عرشی صاحب) نے جو کچھ لکھا ہے، اِس سے صورتِ حال کسی حد تک سامنے آجاتی ہے۔ اِس تحریر کے آخر میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے:

''یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ طباعتِ دیوان کا بڑا حصہ مولانا عرشی کی موجودہ علالت کے دوران میں انجام پایا ہے اور اِس کے پروف میں نے پڑھے ہیں۔ اُس زمانے میں ڈاکٹروں کی ہدایت کی وجہ سے میں بعض دریافت طلب مقامات کے بارے میں مولانا عرشی سے ہدایت بھی نہ لے سکا تھا اِس لیے کچھ غلطیاں

میری وجہ سے بھی راہ پا گییں''۔ (ص ۴٦۷)

نسخۂ عرشی طبعِ ثانی کا مقدّمہ ایک بار پڑھ لیا جائے تو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ اِس نسخے میں عرشی زادہ نے کس قدر دخل اندازی کی ہے۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ طبعِ ثانی کے لیے اِس کے سرورق پر عرشی زادہ نے عرشی صاحب کے نام کے نیچے اپنا نام بھی لکھا۔ مالک رام صاحب اُن دنوں انجمن ترقی اردو کے صدر تھے۔ انجمن کے سکریٹری خلیق انجم صاحب نے اِس پر عرشی زادہ سے شدید اختلاف کیا اور پھر مالک رام صاحب سے مشورہ کیا۔ خلیق صاحب اور مالک رام صاحب دونوں کی متفقہ رائے تھی کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے اور نہیں ہوا، ورنہ صورتِ حال مزید واضح ہو جاتی۔

اِس کتاب میں نقلِ اشعار کے لیے میں نے نسخہ ٔ عرشی طبعِ اوّل کو بنیاد بنایا ہے؛ مگر یہ التزام کیا ہے کہ ہر شعر کے اشاعتِ ثانی کے متن سے مقابلہ کر لیا جائے (اِس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ذاتی طور پر یہ بات میرے علم میں ہے کہ طبعِ اوّل کے متن سے متعلّق بعض مضامین پڑھ کر عرشی صاحب نے چند مقامات پر متن میں تبدیلی کا ارادہ کر لیا تھا۔ ایک بار رام پور میں میرا قیام مہینا بھر سے کچھ زیادہ رہا، رضا لائبریری میں کچھ کام کرنا تھا، اُس زمانے میں اُنھوں نے اِس خیال کا اظہار کیا تھا۔ (یہ اُن کی طویل عدالت سے پہلے کی بات ہے)۔ یہ بات اِس تقابلی مطالعے سے معلوم ہوئی کہ دونوں نسخوں کا متن بہت سے مقامات پر باہم مختلف ہے۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ بعض اختلافات بہت پریشان کُن ہیں، اِس وجہ سے کہ اشاعتِ ثانی کے حواشی میں ایسے مقامات پر ضروری وضاحت موجود نہیں۔ یوں قاری یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ صحیح صورتِ حال کیا ہے۔

اِس پریشانی میں اضافہ اِس طرح بھی ہوتا ہے کہ اشاعتِ ثانی میں اغلاطِ طباعت بہت ہیں۔ اِس وجہ سے بھی قاری کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اُس تبدیلی کو ترمیم قرار دے یا غلطیِ کتابت مانے۔ میں ایک مثال سے اِس کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ اشاعتِ ثانی میں ص ۴۵۲ پر ایک شعر یوں چھپا ہوا ہے:

نقشِ سطرِ صد تبسم ہے بر آبِ زیرِ گاہ　　　حُسن کا خط پر نہاں خندیدنی انداز ہے

ڈاکٹر گیان چند جین نے تفسیرِ غالب میں پہلے مصرعے کو اِس طرح لکھا ہے: نقشِ صد سطر تبسم ہے بر آبِ زیرِ کاہ (ص ۵۵۱)۔ یہ شعر نو دریافت دیوانِ غالب میں ہے جس کا عکس نقوش (لاہور) میں بھی شائع

ہوا تھا۔ فی الوقت یہ پیشِ نظر نہیں۔ میرے استفسار پر ڈاکٹر حنیف نقوی نے مطّلع کیا کہ 'نقوش' کے عکسی نسخے میں پہلا مصرع اُسی طرح ہے جس طرح تفسیرِ غالب میں ہے۔ یعنی کتابت (کمپوزنگ) کی غلطی سے ''نقشِ صد سطرِ تبسّم'' بگڑ کر ''نقشِ سطر صد تبسّم'' بن گیا اور ''آب زیرِ کاہ'' نے ''آبِ زیرِ گاہ'' کا روپ دھار لیا۔

دیوانِ غالب نسخۂ گپتا رضا میں (آئندہ اسے نسخۂ رضا لکھا جائے گا) مصرعِ اوّل اشاعتِ ثانی کے مطابق ہے۔ ہاں مرتّب نے پہلے مصرعے کے حوالے سے یہ ضرور لکھا ہے: ''نخ: صد سطرِ تبسّم (شاید سہوِ کتابت)'' (ص ۲۳۹)۔ ''نخ'' سے مراد ہے نسخۂ بھوپال قدیم بہ خطِّ غالب'' (ایضاً ص ۱۳)۔ یعنی اصل نسخے کا متن ''صد سطرِ تبسّم'' اُن کی رائے میں سہوِ کتابت ہے اور بظاہر اِس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ نسخۂ عرشی طبعِ ثانی میں ''نقشِ سطرِ صد تبسّم'' لکھا ہے۔ ہاں ''آبِ زیرِ گاہ'' کو اُنھوں نے درست خیال کیا ہے (یوں کہ نسخۂ عرشی کی اشاعتِ ثانی میں یہی لکھا ہوا ہے)۔

میں نے یہ طریقۂ کار اختیار کیا ہے کہ جن مقامات پر طبعِ ثانی کا متن طبعِ اوّل سے مختلف ہے اور حاشیے میں یا ضمیموں میں اُس اختلاف کا صحیح طور پر حوالہ دیا گیا ہے، وضاحت کی گئی ہے، ایسے مقامات پر طبعِ ثانی کے متن کو اختیار کیا ہے، یہ مان کر کہ یہ ترمیم فرمودۂ عرشی صاحب کے مطابق ہوگی۔ جن مقامات پر اختلافِ متن سے متعلّق ایسے حوالے موجود نہیں، ایسے مقامات پر طبعِ اوّل کے متن کو ترجیح دی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے ایسے اہم مقامات کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ اِن مثالوں سے یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ طبعِ اوّل کے بعض مقامات بھی توجہ طلب ہیں۔ آئندہ نسخۂ عرشی طبعِ اوّل کے لیے صرف 'طبعِ اوّل' اشاعتِ ثانی کے لیے صرف 'طبعِ ثانی' اور نسخۂ کالی داس گپتا رضا کے لیے 'نسخۂ رضا' لکھا جائے گا۔

(۱) چمن زارِ تمنّا ہو گیا صرفِ خزاں، لیکن بہارِ نیم رنگِ آہِ حسرت ناک باقی ہے

(ص ۱۰۷)

طبعِ اوّل میں اِسی طرح ہے۔ طبعِ ثانی میں ''چمن زارِ تمنّا ہو گئی'' ہے (ص ۱۱۴)۔ اِس نسخے کے غلط نامے، حواشی اختلافِ نسخ یا استدراک میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ 'ہو گیا' کو 'ہو گئی' کیوں لکھا گیا۔ اِس صورت میں اِسے کتابت کی غلطی مانا جائے گا۔ میں نے طبعِ اوّل کے مطابق 'ہو گیا' لکھا ہے۔ تفسیرِ غالب میں بھی 'ہو گیا' ہے۔ نسخۂ رضا میں 'ہو گئی' ہے اور یہ طبعِ ثانی کی نقل ہے۔

شان الحق حقی نے اپنے قابلِ قدر مضمون کلامِ غالب کا لسانی تجزیہ میں اِس شعر میں 'ہوگئی' لکھا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے: ''ممکن ہے کہ کتابت میں 'ہوگئے'، 'ہوگئی' بن گیا ہو'' (غالب- جدید تنقیدی تناظرات، مرتبۂ اسلوب احمد انصاری ،ص۱۳۹)۔ حقی صاحب نے طبعِ ثانی یا نسخۂ رضا سے شعر نقل کیا، یوں متن کی یہ غلطی بھی نقل ہوگئی۔

(۲) طبعِ اوّل میں ص ۳۰۵ پر یہ شعر ہے:

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ کہنا اسداللہ خاں قیامت ہے!

اِسی نسخے میں ص ۳۲۰ پر بھی یہ شعر موجود ہے اور وہاں اِس شعر میں 'ریختہ لکھنا' ہے؛ مگر غلط نامے میں اِس کے متعلّق یہ ہدایت ملتی ہے کہ اِس سطر کو (جس میں یہ شعر لکھا ہوا ہے) اِس سے پہلے کی سطر کے ساتھ یہاں سے قلم زد کردیا جائے۔ اِس سے بہ ظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرتّب نے 'ریختہ کہنا' کو برقرار رکھا ہے۔ طبعِ اوّل (نیز طبعِ ثانی) کے دیباچۂ مرتّب میں بھی یہ شعر ملتا ہے (طبعِ اوّل، ص۲۳، طبعِ ثانی ص۱۴) اور وہاں اِس شعر میں 'ریختہ کہنا' ہے۔ اِس طرح یہ مسلّم ہوجاتا ہے کہ مرتّب نے اِس شعر میں 'ریختہ کہنا' کو درست قرار دیا ہے۔ طبعِ ثانی میں بھی 'ریختہ کہنا' ہے (ص ۴۲۷)۔

طبعِ اوّل میں ص ۳۲۰ پر اِس شعر کے ذیل میں یہ بھی لکھا گیا ہے: ''اِس مقطعے کو میرزا صاحب نے اپنے ایک مکتوب بہ نامِ مولی عبدالرزاق شاکرؔ میں اِس تمہید کے ساتھ نقل کیا ہے: ''قبلہ! ابتدائے فکرِ سخن میں بیدلؔ و اسیرؔ و شوکتؔ کی طرز پر ریختہ لکھتا تھا، چناں چہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا''۔ اِس خط کے لیے حوالہ دیا ہے عودِ ہندی کا۔ یہی عبارت طبعِ ثانی میں بھی ہے (ص ۴۲۷)۔ اِس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اِس شعر کا واحد ماخذ مرزا صاحب کا محوّلۂ بالا خط بہ نامِ شاکرؔ ہے جو پہلی بار عودِ ہندی میں شائع ہوا تھا۔ اِس کتاب کا پہلا اڈیشن میرے پاس نہیں۔ میرے استفسار پر حنیف نقوی صاحب نے مطلع کیا کہ عودِ ہندی کی اشاعتِ اوّل میں اِس شعر میں 'ریختہ لکھنا' ہے۔

مرزا صاحب کا یہ خط خطوطِ غالب مرتّبۂ ڈاکٹر خلیق انجم میں شامل ہے۔ مرتّب کی وضاحت کے مطابق یہ عودِ ہندی طبعِ اوّل سے منقول ہے؛ اِس میں بھی اِس شعر میں 'ریختہ لکھنا' ہے (جلدِ دوم، ص ۸۴۶)۔

اِس طرح یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ زیرِ بحث شعر میں 'ریختہ لکھنا' ہے اور 'ریختہ کہنا' قابلِ قبول نہیں

ہوسکتا۔ میں نے اِسی بنا پر اِس شعر میں 'ریختہ لکھنا' کو برقرار رکھا ہے۔ ایک ضمنی بات ——: مرزا صاحب نے اِس خط میں ایک جگہ 'ریختہ لکھتا تھا' لکھا ہے: ''بیدلؔ...... کی طرز پر ریختہ لکھتا تھا''، پھر زیرِ بحث شعر لکھا ہے اور اُس کے بعد لکھا ہے: ''پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامینِ خیالی لکھا کیا''۔ یعنی مرزا صاحب نے اپنے قلم سے نثر میں ریختہ کہنا کے مفہوم میں 'لکھتا تھا' اور 'لکھا کیا' لکھا ہے۔ یہ بھی تائیدِ مزید کے ذیل میں آتا ہے۔ جب تک اِس خط کے مقابلے میں کوئی ایسی مضبوط سند نہ پیش کی جائے جس سے 'ریختہ لکھنا' کے بجائے 'ریختہ کہنا' کا ثبوت ملے، اُس وقت تک اِس شعر میں 'ریختہ لکھنا' کو درست مانا جائے گا اور 'ریختہ کہنا' کو نا درست کہا جائے گا۔

نسخۂ رضا میں بھی 'ریختہ کہنا' ہے (ص ۱۳۸)۔ اُنھوں نے بھی اِسی مکتوبِ غالبؔ بہ نامِ شاکر کا حوالہ دیا ہے۔ لکھا ہے: ''دیکھیے مکتوب بہ نامِ عبدالرزاق شاکرؔ۔ عودِ ہندی ص ۱۵۹''۔ یعنی اُنھوں نے بھی حوالہ دیتے وقت عودِ ہندی میں اِس خط کو پڑھا نہیں، نسخۂ عرشی سے حوالہ نقل کیا۔

(۳) اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

طبعِ اوّل میں ''رونق منہ پر'' ہے (ص ۲۳۹)۔ حاشیے میں لکھا گیا ہے کہ یہ غزل 'آخرِ ما' سے ماخوذ ہے۔ 'ما' سے مراد ہے دیوانِ غالبؔ طبعِ دوم، مطبوعۂ ۱۸۴۸ء۔ عرشی صاحب نے مقدّمۂ طبعِ اوّل میں اِس نسخے کا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا: ''اِس کے آخری سادہ اوراق پر مرزا صاحب کا وہ کلام نقل کیا گیا ہے جو اُنھوں نے اِس دیوان کی اشاعت کے بعد کہا تھا'' (ص ۹۷)۔ عرشی صاحب نے اِس کلام کی تفصیل بھی لکھی ہے، اُس میں یہ غزل بھی شامل ہے (کمال اچھا ہے۔ جمال اچھا ہے)۔ عرشی صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ یہ کلام آخری سادہ اوراق پر غالبؔ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اِس سے لازماً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ کسی دوسرے شخص کے قلم کا لکھا ہوا ہے، اِس اہم پہلو کو پیشِ نظر رکھا جانا چاہیے تھا۔

عرشی صاحب نے طبعِ اوّل کے ضمیمۂ اختلافِ نسخ میں اِس غزل کے زیرِ بحث شعر کے حوالے سے لکھا ہے کہ دیوانِ غالبؔ کے تیسرے اور چوتھے مطبوعہ اڈیشن میں اِس شعر میں 'منہ پر رونق' ہے۔ چوتھا اڈیشن (مطبوعۂ مطبعِ نظامی کانپور، سالِ طبع ۱۸۶۲ء) میرے سامنے ہے، اُس میں ''منہ پر رونق'' ہے۔ نسخۂ عرشی طبعِ ثانی میں بھی ''رونق منہ پر'' ہے۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ 'رونق منہ پر' دیوانِ غالبؔ کے صرف اُس نسخے میں ہے جس کے آخر میں شامل سادہ اوراق پر کسی مجہول الاحوال شخص نے اِس غزل کو اپنے قلم سے لکھا ہے اور دیوانِ غالبؔ کے تیسرے اور چوتھے اڈیشنوں میں، جو غالبؔ کی تصحیح کے ساتھ چھپے ہیں، 'منہ پر رونق' ہے۔ صاف طور پر اور واضح طور پر اِن دو نسخوں کے مقابلے میں ایک مجہول الاحوال شخص کی تحریر کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

نسخۂ رضا میں دیوانِ غالبؔ کی اشاعتِ سوم و چہارم کے مطابق ''منہ پر رونق'' ہے۔ یہاں نسخۂ رضا کا متن لازماً مرجّح حیثیت رکھتا ہے اور کسی دوسرے معتبر ماخذ کی عدم موجودگی میں اِسی کو اختیار کیا جائے گا۔ میں نے اپنی کتاب میں اِسی بنا پر اِس شعر میں ''منہ پر رونق'' کو جگہ دی ہے۔

(۴) جامِ ہر ذرّہ ہے سرشارِ تمنّا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم میں لگایا ہے مجھے

طبعِ اوّل میں یہی ہے (ص ۱۰۸)۔ طبعِ ثانی میں 'دو عالم سے' ہے (ص ۱۱۵)۔ دونوں نسخوں میں اِس شعر کے مصرعِ ثانی میں کسی طرح کے اختلافِ نسخ کا حوالہ نہیں ملتا؛ اِس صورت میں طبعِ ثانی کے متن کو کس بنا پر قبول کیا جا سکتا ہے؟ ہاں، نسخۂ رضا میں 'دو عالم سے' ہے (ص ۲۵۳)۔ یہ طبعِ ثانی کی نقل ہے۔ میں نے طبعِ اوّل کے مطابق 'دو عالم میں' لکھا ہے۔

(۵) سبحہ گرداں ہے اُسی کے کفِ اُمّید کا ابر
بیم سے جس کے صبا توڑے ہے صد جا زُنّار

طبعِ اوّل میں یہی ہے (ص ۴)۔ طبعِ ثانی میں 'اُسی کی' ہے (ص ۴)۔ بہ ظاہر یہ غلطیِ کتابت ہے جس کی تصحیح نہیں کی جا سکی۔ ''چکنی ڈلی'' والے قطعے میں ''صاحب کے کفِ دست'' ہے اور طبعِ ثانی میں بھی یہی ہے (ص ۱۳۱)۔ اِس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے 'اُسی کی کفِ اُمّید' میں 'کی' کتابت کی غلطی ہے۔ نسخۂ رضا میں طبعِ ثانی کے مطابق 'اُسی کی' ہے (ص ۳۰۷) اور یہ نتیجہ ہے طبعِ ثانی کی نقل کا۔ طبعِ اوّل سے مقابلہ کر لیا جاتا تو معلوم ہو جاتا کہ یہاں 'اُسی کے' ہونا چاہیے۔ ہاں، 'چکنی ڈلی' والے قطعے میں نسخۂ رضا میں 'صاحب کے کفِ دست' ہی ہے (ص ۳۷۸)۔

(۶) جلوۂ ریگِ رواں دیکھ کے، گردوں ہر صبح
خاک پر توڑے ہے آئینۂ نازِ پرویں

طبعِ اوّل میں اسی طرح (دیکھ کے) ہے۔ طبعِ ثانی میں اِس طرح چھپا ہوا ہے: جلوۂ ریگِ رواں دیکھ کہ گردوں ہر صبح (ص ۸)۔ طبعِ ثانی کے حواشی میں اِس مصرعے میں کسی طرح کے اختلافِ نسخ کی نشان دہی نہیں ملتی؛ اِس صورت میں لامحالہ اِسے کتابت کی غلطی مانا جائے گا۔ یہ کتابت کی ایسی غلطی ہے جسے طبعِ اوّل سے مقابلے کے بغیر معلوم نہیں کیا جا سکتا، یوں کہ شعر میں 'کہ' سے بھی مفہوم کا ایک پہلو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ایسے مقامات قاری کے لیے اور اشعار نقل کرنے والوں کے لیے خاص طور پر پریشان کُن ثابت ہوتے ہیں۔ ہر شخص ہر وقت مختلف نسخوں سے متن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نسخۂ رضا میں یہاں طبعِ اوّل کے مطابق 'کے' ہے (ص ۳۱۴)۔ تفسیرِ غالب میں بھی 'کے' ہے (ص ۴۷)۔

(۷) نظّارہ دیگر و دلِ خونیں نفس دگر
آئینہ دیکھ، جوہرِ برگِ حنا نہ مانگ

طبعِ اوّل میں یہی ہے (ص ۵۱)۔ طبعِ ثانی میں 'جوہرِ برگِ دعا' ہے (ص ۵۴)۔ 'برگِ حنا' کو حاشیے میں اختلافِ نسخ کے ذیل میں لکھا گیا ہے۔

طبعِ اوّل کے ضمیمۂ اختلافِ نسخ میں 'برگِ دعا' ہے (ص ۴۰۸)، یعنی عرشی صاحب نے 'برگِ حنا' کو مرجّح قرار دیا تھا۔ طبعِ ثانی میں یہ نہیں لکھا گیا کہ اب اِس اشاعت میں ''برگِ دعا'' کو کیوں ترجیح دی گئی ہے۔ پہلے مصرعے کے ''خونیں نفس'' کی رعایت اور مناسبت سے 'برگِ حنا' مناسبت تر معلوم ہوتا ہے۔ میں نے طبعِ اوّل کی مطابقت اختیار کی ہے۔

(۸) آتشِ رنگِ رُخِ ہر گل کو بخشے ہے فروغ
ہے دمِ سردِ صبا سے گرمیِ بازارِ باغ

طبعِ اوّل میں یہی ہے (ص ۴۸)۔ طبعِ ثانی میں 'دلِ سردِ صبا' ہے (ص ۵۱)۔ اِس کے غلط نامے میں یا حواشیِ اختلافِ نسخ میں اِس تبدیلی کا کوئی حوالہ نہیں ملتا، ایسی صورت میں طبعِ ثانی کے 'دلِ سردِ صبا' کو لازماً غلطیِ کتابت مانا جائے گا۔ معناً بھی 'دم' کا محل ہے 'صبا' کی نسبت سے۔ نسخۂ رضا میں بھی یہاں طبعِ اوّل کے مطابق 'دم' ہے۔ تفسیرِ غالب میں بھی 'دم' ہے۔ اُس میں لکھا گیا ہے: ''ٹھنڈی ہوا سے باغ میں رونق ہے...... دمِ سرد اور گرمیِ بازار میں تضاد ہے'' (ص ۲۳۴)۔ میں نے طبعِ اوّل کے مطابق 'دمِ سردِ صبا' لکھا ہے۔

(۹) چمن زارِ تمنّا ہوگیا صرفِ خزاں، لیکن
بہارِ نیم رنگِ آہ حسرتناک باقی ہے

طبعِ اوّل میں اِسی طرح (ص ۱۰۷)، طبعِ ثانی میں 'چمن زارِ تمنا ہوگئی' ہے (ص ۱۱۴)۔ اِس کے غلط نامے یا ضمیمہ/استدراک میں اِس کا کوئی حوالہ نہیں ملتا، یوں اِسے غلطیِ کتابت مانا جائے گا؛ لیکن اُلجھن کی بات یہ ہے کہ نسخۂ رضا میں بھی 'ہوگئی' ہے (ص ۲۳۴) اور یہ طبعِ ثانی کی نقل ہے۔

(۱۰) شادی سے گزر کہ غم نہ رہوے
اُردی جو نہیں تو دَے نہیں ہے

طبعِ اوّل میں یہی ہے (ص ۲۲۹)۔ اِس کے ضمیمۂ اختلافِ نسخ میں کئی نسخوں کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں 'ہووے' ہے؛ لیکن عرشی صاحب نے 'ہووے' کو اختلافِ نسخ میں درج کیا، متن میں 'رہوے' لکھا۔ طبعِ ثانی میں اِس شعر میں 'ہووے' ہے (ص ۲۹۹)۔ حاشیے میں اِس کے لیے اُن نسخوں کا حوالہ دیا گیا ہے جن کا حوالہ عرشی صاحب نے دیا تھا۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ کیا عرشی صاحب نے اپنی رائے بدل دی تھی؟ کسی طرح کی وضاحت کے بغیر اِس تبدیلی کو کیسے مانا جائے گا۔ کھوے، رہوے، ہووے؛ یہ سب شکلیں مرزا صاحب کے یہاں پائی جاتی ہیں، صرف ایک مثال:

یہ کون کھووے ہے آباد کر ہمیں، لیکن
کبھی زمانہ مرادِ دلِ خراب تودے

(طبعِ اوّل ص ۳۲۰، طبعِ ثانی ص ۱۲۴)۔ نسخۂ رضا میں طبعِ ثانی کے مطابق 'ہووے' ہے (ص ۳۶۶)۔ میں نے اپنی کتاب میں طبعِ اوّل کی مطابقت اختیار کی ہے۔

(۱۱) اضطرابِ عمر بے مطلب نہیں آخر، کہ ہے
جستجوے فرصتِ ربطِ سرو زانو مجھے

طبعِ اوّل میں 'سرِزانو' ہے (ص ۸۷)۔ طبعِ ثانی میں بھی یہی ہے (ص ۸۴)۔ لیکن اِس نسخے کے ضمیمۂ استدراک میں 'سروزانو' ہے (ص ۲۳۶)۔ یعنی مرتّب نے نسخۂ ثانی کے متن کو دیکھا، اُس کے ضمیمۂ استدراک کو نہیں دیکھا۔ اِس میں اصل لطیفہ یہ ہے کہ مرتّب نے 'سروزانو' کو اختلافِ نسخ کے تحت حاشیے میں لکھا ہے۔ متن میں 'سرِزانو' لکھا اور حاشیے میں غیر مرجّح صورت کے طور پر 'سروزانو' کو جگہ دی!

(۱۲) صبا! لگا وہ تپانچہ طرف سے بلبل کے
کہ روے غنچۂ گل سوے آشیاں پھر جائے

طبعِ اوّل کے متن میں مصرعِ اوّل یوں لکھا ہوا ہے: صبا، لگا وہ طمانچہ طرف سے بلبل کی (۳۰۵)۔ لیکن اِس نسخے کے غلط نامے میں لکھا گیا ہے کہ 'بلبل کی' غلط ہے، صحیح 'بلبل کے' ہے۔

طبعِ ثانی کے متن میں یہ مصرع یوں چھپا ہوا ہے: صبا، لگا وہ طپانچے طرف سے بلبل کے (ص۴۲۷)۔ اِس نسخے کے استدراک میں یا متعلقہ حاشیے میں یہ نہیں لکھا گیا کہ طبعِ اوّل کے غلط نامے میں 'بلبل کے' کو صحیح لکھا گیا ہے۔ یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ اُسے نہ ماننے کی وجہ کیا ہے۔ یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ طبعِ اوّل میں 'طپانچہ' ہے، اُسے طبعِ ثانی میں 'طپانچے' کیوں بنایا گیا۔ اِس عدمِ وضاحت کی بنا پر طبعِ ثانی کے متن کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔

ایک بات اور: عرشی صاحب نے مقدّمۂ مکاتیبِ غالب میں لکھا ہے: ''بیتابؔ نے 'طمانچہ' لکھا تھا، میرزا صاحب نے 'طمانچہ' کو 'تپانچہ' بنادیا (طبعِ ششم، ص۲۲۳)۔ یہ مرزا صاحب کا وہی نقطۂ نظر ہے کہ فارسی لفظوں میں ت لکھنا چاہیے، ط نہیں لکھنا چاہیے۔ مرزا صاحب کی اِس اصلاح کو دیکھنے اور ان کے اُس قول کو جاننے کے باوجود اُن کے شعر میں 'طپانچہ' یا طپانچے' نہیں لکھا جاسکتا۔ تپانچہ لکھا جائے یا تپانچے۔ میں نے اِسی بنا پر 'تپانچہ' اور 'بلبل کے' لکھا ہے۔ ہاں، نسخۂ رضا میں زیرِ بحث مصرعے کا متن طبعِ ثانی کے مطابق ہے (ص۱۳۸)۔

اِسی سلسلے کا ایک مسئلہ الفاظ کی شکل صورت (املا) کا بھی ہے۔ دیوانِ غالبؔ طبعِ اوّل کا اگر نیا اڈیشن مرتّب ہو تو اُس میں اِس طرف توجّہ کرنا ازبس ضروری قرار پائے گا۔ میں اِس تحریر میں محض بہ طورِ مثال ایک لفظ کے اختلافِ املا کی نشان دہی کرتا ہوں۔

مرا شمول ہر اک دل کے پیچ و تاب میں ہے میں مدّعا ہوں تپش نامۂ تمنّا کا

طبعِ اوّل میں 'پیچ و تاب' ہے (ص۱۷)۔ طبعِ ثانی میں 'پیچ تاب' ہے (ص۱۷)۔ اِس نسخے کے حاشیے میں اختلافِ نسخ کے تحت 'پیچ و تاب' لکھا گیا ہے۔ اِس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرتّب کے نزدیک مرجّح صورت 'پیچ تاب' ہے؛ لیکن آگے بڑھ کر اِس کی تردید ہوجاتی ہے، یوں کہ اِس نسخے میں پانچ اشعار کے

متن میں 'پیچ وتاب' ملتا ہے۔

یہ لفظ طبعِ اوّل میں شامل پندرہ اشعار میں آیا ہے۔ طبعِ اوّل میں اِن میں سے گیارہ اشعار میں 'پیچ وتاب' لکھا ہوا ہے: مراشمول ہراک دل کے پیچ وتاب میں ہے (ص ۱۷)، جو ہرِ شمشیر کو ہے پیچ وتاب آئینے پر (ص ۴۰)، پیچ وتابِ جادہ ہے خطِّ کفِ افسوس وبس (ص ۴۶)، پیچ وتابِ جادہ ہے یہاں جو ہرِ تیغِ عسس (ص ۴۵)، پیچ وتابِ دل نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے ص ۹۳)، ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ وتاب میں (ص ۱۸۹ء)، جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ وتاب میں (ص ۱۸۹)، بہ پیچ وتابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ (ص ۲۱۴)، دل نے سُن کر، کانپ کر، کھاپیچ وتاب (ص ۲۶۶)، معافِ پیچ و تابِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے (ص ۸۵)، ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ وتاب (ص ۳۳۲)۔

چار اشعار میں 'پیچتاب' لکھا ہوا ہے: ہے پیچتابِ رشتۂ شمعِ سحر گہی (ص ۷۶)، مبادا ے پیچتابِ طبع نقشِ مدّعا گم ہو (ص ۶۸)، اسدؔ کو پیچتابِ طبعِ برق آہنگ مسکن سے (ص ۲۲)، تدبیرِ پیچتابِ نفس کیا کرے کوئی (ص ۸۸)۔

طبعِ ثانی کا احوال یہ ہے کہ اُس میں منقولۂ بالا پندرہ مصرعوں میں سے چھے مصرعوں میں 'پیچ وتاب' ہے، پانچ مصرعوں میں 'پیچ تاب' ہے اور چار مصرعوں میں 'پیچتاب' لکھا ہوا ہے۔ طبعِ ثانی کے حصّۂ 'باد آورد' (یا نودریافت دیوانِ غالبؔ) کے ایک مصرعے میں یہ لفظ آیا ہے اور اُس میں 'پیچتاب' لکھا ہوا ہے: جورِ زلف کی تقریر پیچتابِ خاموشی (ص ۴۵۳)۔ اِس طرح طبعِ ثانی میں چھے جگہ 'پیچ وتاب' ہے، پانچ مصرعوں میں 'پیچ تاب' ہے اور پانچ مصرعوں میں 'پیچتاب' ملتا ہے۔ ایک لفظ کی تین شکلیں۔

اِس اُلجھن میں یوں اور اضافہ ہوتا ہے کہ طبعِ اوّل کے ص ۱۷ پر جس شعر میں 'پیچ وتاب' لکھا ہوا ہے، اُس کے حوالے سے ضمیمۂ اختلافِ نسخ میں لکھا گیا ہے کہ 'ق' (نسخۂ بھوپال قدیم) میں یہاں 'پیچتاب' ہے۔ اِس کے بعد لکھا گیا ہے: ''یہی غالبؔ کا پسندیدہ لفظ ہے'' (ص ۴۰۲)۔ اگر 'پیچتاب' غالبؔ کا پسندیدہ لفظ ہے تو متن میں اُسی کو ہونا چاہیے تھا۔ اِسے متن میں نہ لکھنے کی وجہ کیا ہے، یہ معلوم نہیں ہوتا۔ پھر یہ کیسے معلوم ہوا کہ لفظ کی یہ شکل غالبؔ کی پسندیدہ صورتِ املا ہے؟ جب تک اِس کی وضاحت نہ کی جائے، اِس قول کو کس بنا پر مانا جائے گا؟

دیوانِ غالبؔ کا نسخۂ لاہور بہ قولِ عرشی صاحب نوّاب فخرالدین محمد خاں دہلوی کا لکھا ہوا ہے جو

مرزا صاحب کے مشہور کاتب تھے (مقدمۂ نسخۂ عرشی طبع اوّل، ص۸۴)۔ اِس نسخے کا عکس شائع ہو چکا ہے۔ اِس نسخے میں یہ لفظ چار جگہ آیا ہے اور ہر جگہ 'پیچ وتاب' لکھا گیا ہے: ص۱۳۲، ص۱۳۲، ص۱۸۲، ص۲۲۸۔

بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عدمِ تعیّن اور عدمِ وضاحت نے کس قدر اُلجھن کا سامان پیدا کر دیا ہے اشعار نقل کرنے والوں کے لیے-------اصل لفظ (بہ لحاظِ لغت) 'پیچ وتاب' ہے 'پیچ وخم' کی طرح اور طبعِ اوّل میں بھی بیش تر یہی املا ہے اِس لفظ کا، یوں میں نے اِس لفظ کے اِسی املا کو ترجیح دی ہے۔

ایسی بہت سی مثالوں میں سے یہاں اختلافِ متن کی بارہ اور اختلافِ املا کی ایک مثال کو پیش کیا گیا ہے؛ صورتِ حال کا اِنھی مثالوں سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جب تک نسخۂ عرشی طبعِ اوّل کا جدید اڈیشن شائع نہیں ہوگا، یہی صورتِ حال برقرار رہے گی اور غالبؔ کے بہت سے اشعار کو اعتماد کے ساتھ نقل نہیں کیا جاسکے گا۔ کیا اربابِ انجمن، خاص کر ڈاکٹر خلیق انجم اِس اہم مسئلے کی طرف توجّہ مبذول کرنا ضروری سمجھیں گے؟ میری یہ بھی تجویز ہے کہ اشاعتِ ثانی کو کالعدم تصوّر کرلیا جائے۔

[سہ ماہی اردو ادب، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، جنوری تا مارچ ۲۰۰۵ء، ص۴۹]

○○○

غالبؔ

(مختصر حالات اور انتخابِ کلام مع شرح)

''غالب'' کالی داس گپتا رضاؔ صاحب کی مختصر سی کتاب ہے جو ۸۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ میں نے پہلی بار جب اِس مختصر کتاب کو دیکھا تو تعجب ہوا، یوں کہ رضا صاحب نے غالبیات سے متعلق اہم کتابیں لکھی ہیں جن کی اہمیّت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اُن کتابوں کے سامنے یہ کتاب بہت ہلکی پھلکی معلوم ہوتی ہے، لیکن جب اِس کا مختصر سا دیباچہ ''حرفے چند'' پڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ کیوں لکھی گئی ہے اور اِس کا انداز دوسری کتابوں سے مختلف کیوں ہے۔ ''حرفے چند'' میں اُنھوں نے لکھا ہے:

> ''میں نے یہ کتاب پونے کے چند دوستوں کی فرمایش پر لکھّی تھی۔ اُن کی خواہش تھی کہ میں ایک ایسی کتاب غالبؔ سے متعلق لکھوں جس میں غالبؔ کی زندگی کے حالات بھی آ جائیں اور غالبؔ کے لگ بھگ دوڈھائی سو اُردو اشعار کا انتخاب بھی شامل ہو نیز اُن اشعار کے معنی بھی سلیس زبان میں بیان کر دیے جائیں تا کہ پڑھنے والوں کے لیے آسانی ہو۔ اِس فرمایش سے مراد یہ تھی کہ اُن اشعار کی شرح کو مراٹھی میں ترجمہ کر کے شائع کیا جائے۔ چناں چہ یہ مختصر کتاب اِسی شدید خواہش کا نتیجہ ہے''۔

گیارہ صفحوں میں غالبؔ کی زندگی کے ''مختصر حالات'' لکھے گئے ہیں جن میں بیشتر ضروری باتیں اختصار کے ساتھ آ گئی ہیں۔ اِس کے بعد دوسو پچھتّر اشعار کے معنی بیان کیے گئے ہیں سادہ اور سلیس زبان میں۔ اِس کے لیے نسبتاً سادہ اور صاف شعروں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اندازِ بیان ایسا ہے کہ معمولی استعداد رکھنے والا بھی اِن شعروں کے معنی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ یہاں میں یہ وضاحت کر دوں کہ رضاؔ صاحب نے اشعار کے معنی لکھّے ہیں شرح نہیں لکھّی ہے تا کہ اِس کا فرق نظر میں رہے۔ اِن

۲۷۵ اشعار میں ۲۲۴ شعر تو اُس دیوان سے لیے گئے جسے متداول دیوان کہا جاتا ہے اور ۵۱ شعر'' وہ ہیں جو غالبؔ کے مروّجہ دیوان میں نہیں''۔

شاعری سے لطف اندوز ہونے کا حق تو سبھی کو ہے اِس لحاظ سے دیکھیے تو یہ چھوٹی سی کتاب ایک بڑے طبقے سے غالبؔ کو متعارف کراتی ہے اور اِسی اعتبار سے بجائے خود اِس کی اہمیّت بھی ہے اور ضرورت بھی۔

رضاؔ صاحب نے معنی و مفہوم کی اُن تفصیلات سے سروکار نہیں رکھا جو کلامِ غالبؔ کی شرحوں سے ملتی ہیں۔ اُنھوں نے اشعار کی شرح نہیں لکھّی ہے بل کہ آسان زبان میں معانی بیان کیے ہیں۔ جن لوگوں کے لیے اُنھوں نے یہ کتاب مرتّب کی ہے اُن کے لحاظ سے اِسی طریقِ کار کو اختیار کیا جانا چاہیے تھا۔

توقّع کی جاتی ہے کہ عام لوگوں کے لیے یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔ خواہ وہ گجرات اور مہاراشٹر کے ہوں خواہ کسی اور علاقے کے۔ بڑے کاموں کے سامنے چھوٹے کاموں کی اہمیّت کم نہیں ہوتی۔ رضاؔ صاحب نے یہ وضاحت کردی ہے کہ:

> ''میں نے پہلے خود اشعار کے معنی لکھّے پھر بعض دوسری شرحوں سے مقابلہ کر کے اپنے معانی کی تصدیق کی''۔

اور اِس سے اتّفاق کیا جائے گا کہ یہ، صحیح طریقۂ کار ہے۔ (۱۹۹۹ء)

[''سُپوتنک'' لاہور، مئی ۲۰۰۱ء، ص ۱۱۶، ۱۱۷]

یہ مضمون ۱۹۹۹ء میں رشید حسن خاں صاحب نے لکھا ہے۔ پروفیسر سیّد معین الرحمٰن نے اِسے اپنی کتاب'' کالی داس گپتا رضاؔ کی یاد میں راضی بہ رضا'' میں شامل کیا ہے۔

○○○

اِنشاے غالب کا خطّی نسخہ

مرزا غالبؔ کے منتخب کلامِ نظم ونثر پر مشتمل یہ ایک مختصر سی کتاب[1] ہے۔ یہ انتخابی مجموعہ کئی لحاظ سے اہم ہے۔ اِس کی ایک اہمیّت تو یہ ہے کہ یہ خود مرزا صاحب کا مرتّب کیا ہوا ہے۔ یہ اہمیّت بھی ہے کہ ''یہ خطوطِ غالبؔ کا سب سے پہلا مجموعہ ہے'' اور یہ بھی کہ کلامِ غالبؔ کے بعض اجزا کے لیے اِس کی حیثیت واحد ماخذ کی یا پھر اوّلین ماخذ کی ہے۔ مرزا صاحب نے اِس انتخابی مجموعے کی تمہیدی عبارت میں لکھا ہے:

> ''یہ کتاب جو دو باب کی ہے، حقیقت یہ اس کتاب کی ہے کہ پہلے باب میں دو دیباچے اور کئی لطیفے اور کئی مکتوب ہیں۔ اگر میرے لکھے ہوئے نہ ہوتے تو میں کہتا کہ بہت خوب ہیں۔ دوسرا باب اشعار کا ہے کہ وہ بھی کلام اِسی خاکسار کا ہے۔ اگر کوئی خط اردو زبان میں لکھا جائے، اُن اشعار میں سے شعر محلّ ومقام کے مناسب درج کیا جائے''۔

یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اختصار کے ساتھ اِس انتخابی مجموعے کی وجہِ ترتیب پر کچھ روشنی ڈالی جائے اور اِس پر بھی گفتگو کی جائے کہ اِس کا خطّی نسخہ اصلاً کہاں تھا۔ کیا مولوی ضیاء الدین خاں دہلوی کے پاس تھا۔ یہ اِس لیے ضروری ہے کہ اِس گفتگو کے بغیر اصل موضوع کی وضاحت نہیں ہو پائے گی۔

شمس العلما ڈاکٹر مولوی ضیاء الدین خاں دہلوی، مرزا غالبؔ کے ہم عصر تھے۔ اُنھوں نے انشاے اردو کے نام سے ایک نصابی مجموعہ مرتّب کیا تھا۔ میں نے یہ کتاب نہیں دیکھی۔ مالک رام صاحب نے دیکھی تھی اور اِس سے متعلّق کچھ ضروری باتیں انشاے غالب (شائع کردۂ مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی) کے مقدّمے میں لکھی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی عبارت کے ضروری اجزا کو نقل کر دیا جائے۔

> ''۱۸۶۶ء میں حکومت کی طرف سے مولوی ضیاء الدین خاں کو ایما ہوا کہ وہ

اردو کا ایسا نصاب مرتّب کریں جو نوواردفوجی افسروں کو اردو پڑھانے کے لیے موزوں ہو۔ اِس پر اُنھوں نے مختلف نثر نگاروں کی تحریروں سے مضامین منتخب کیے اور غالبؔ سے درخواست کی وہ اپنے چند خطوط اور کچھ نثر عنایت کریں کہ اُنھیں مجوّزہ نصاب میں شامل کیا جاسکے۔ اِس پر غالبؔ نے یہ زیرِ نظر مجموعہ (انشاے غالب) مرتّب[2] کیا...اُنھوں نے یہ کتابچہ کاتب سے خوش خط لکھوایا اور نظرِ ثانی کے بعد اسے مولوی ضیاء الدین خاں کے حوالے کر دیا...یہی غالبؔ کا مرسلہ خطّی نسخہ مولوی ضیاء الدین خاں نے اپنی انشاے اردو کے لیے مسوّدے کے طور پر استعمال کیا تھا اور اِسی سے کاتب نے کتابت کی تھی۔ اِس میں بعض جگہ حاشیے پر صفحات کے نمبر اب بھی موجود ہیں جو بالعموم کاتب اپنی یادداشت کے لیے حاشیے میں لکھ دیتا ہے...مولوی ضیاء الدین خاں نے صرف دس خط انشاے اردو میں لیے ہیں، بقیّہ تمام موادِ نظم و نثر اُنھوں نے نظر انداز کر دیا...مولوی صاحب موصوف نے خطوں کی عبارت میں حسبِ منشا تبدیلی کر لی تھی۔ بعض الفاظ کاٹ دیے، کچھ بدل ڈالے۔ بعض جگہ سطروں کی سطریں خارج کر دیں''۔

حُسنِ اتّفاق سے مرزا صاحب کا مرتّب کیا ہوا اور تصحیح کیا ہوا وہ خطّی نسخہ دہلی میں محفوظ رہا اور ۱۹۲۴ء کے آس پاس کسی وقت دہلی سے حیدرآباد پہنچا اور وہاں سے ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر عبدالسّتار صدیقی کے پاس پہنچا جو اُس زمانے میں ڈھاکہ یونی ورسٹی میں تھے۔ یہی خطّی نسخہ ہمارا موضوعِ بحث ہے۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اور جو ضروری تفصیلات پیش کی گئی ہیں، اُن سے یہ تو واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ خطّی نسخہ اصلاً مولوی ضیاء الدین خاں کے پاس تھا؛ مگر قطعیّت کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انشاے اردو کی ترتیب کے بعد بھی وہ اُنھی کے پاس رہا۔ البتہ قیاس یہی کہتا ہے کہ یہ نسخہ مولوی صاحب ہی کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ رہا اور اُس ذخیرے کی کتابیں جب بہ غرضِ فروخت بالاقساط حیدرآباد لائی جانے لگیں تو یہ خطّی نسخہ بھی اُسی سلسلے میں حیدرآباد پہنچا تھا۔ (میرے قیاس کی بنیاد عبدالرّزاق صاحب کے بیان پر ہے جس کو اِس عبارت کے بعد ہی نقل کیا گیا ہے)۔

اِس خطّی نسخے کے سلسلے میں سب سے پہلا بیان ہمارے سامنے محمد عبدالرّزاق صاحب کا ہے،

جنھوں نے اِس نسخے کو مکمل صورت میں پہلی بار ۱۳۴۵ھ (۲۷-۱۸۲۶ء) میں ''چشتیہ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد دکن'' میں چھپوایا تھا (اِس اشاعت سے متعلّق ضروری باتیں اِس تحریر کے آخری حصّے میں لکھی جائیں گی)۔ اُنھوں نے تقریب کے عنوان سے اپنے پیش لفظ میں لکھا تھا:

''اِس کا مسوّدہ دہلی کالج کے پروفیسر ضیاءالدین ایل ایل ڈی کے وسیع کتب خانے میں ہے۔ جناب موصوف عثمانیہ یونی ورسٹی میں اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ آپ کو اردو کے قدیم سرمایے کی حفاظت کا خاص ذوق ہے۔ ہم آپ کے نہایت ممنون ہیں کہ آپ نے یہ مجموعہ اشاعت کی غرض سے ہمیں عنایت فرمایا ہے...ہم نے اِس کا نام ''انتخابِ غالب'' تجویز کیا ہے''۔

عبدالرّزاق صاحب کے اِس بیان سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ (۱) اصل خطّی نسخہ سیّد سجاد صاحب کے قبضے میں تھا۔ (۲) یہ نسخہ مولوی ضیاءالدین خاں کے وسیع کتب خانے سے برآمد ہوا ہے۔ (۳) سیّد سجاد صاحب نے اشاعت کی غرض سے یہ نسخہ عبدالرّزاق صاحب کو دیا تھا (اِن بیانات کا جائزہ ابھی لیا جائے گا)۔

زمانی ترتیب کے لحاظ سے اِس سلسلے کا دوسرا بیان ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی کا ہے۔ صدّیقی صاحب نے مالک رام صاحب کے نام ایک خط میں لکھا تھا:

''رقعاتِ غالب (انتخاب) میرے پاس بہت مدّت سے ہے۔ جب وہ نسخہ میری ملک میں آرہا تھا، اُسی دوران میں ایک صاحب نے اسے مستعار لے کر نقل کرلیا (چھوٹا سا تو رسالہ ہے) اور چھپوا ڈالا۔ جو شخص میرے ہاتھ بیچ رہا تھا، اُس نے مجھے خبر کی۔ میں نے باوجود اِس سانحے کے اُسے لیا۔ بعد کو چھپا ہوا نسخہ دیکھا، غارت کر کے چھاپا تھا۔ پھر ایک شخص نے اُن حضرت کی اجازت سے لاہور میں چھاپا۔ صورت بہتر، لیکن غلط جیسا وہ تھا ویسا یہ۔ اب میں خود چھپوانے کا ارادہ کررہا ہوں''۔[۳]

یہ خط ۸/فروری ۱۹۵۴ء کا ہے۔ صدّیقی صاحب نے بہت اختصار سے کام لیا اور اِس کی وضاحت نہیں کی کہ ''جو شخص میرے ہاتھ بیچ رہا تھا'' وہ کون تھا۔ اِس طرح قیاس آرائی کے لیے گنجایش نکل آئی۔ اِس کا حق ادا کیا مالک رام صاحب نے اور اِس طرح کہ اُس مبہم واقعے کے بیان میں کہانی جیسی دل چسپی پیدا

ہوگئی۔ مالک رام صاحب نے اِس سلسلے میں لکھا ہے:

''حُسنِ اتّفاق سے غالبؔ کے انتخاب کا یہ خطّی نسخہ انشاے اردو کی ترتیب و اشاعت کے بعد مولوی ضیاءالدین خاں کے ذخیرے میں محفوظ رہا۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کی کتابوں سے یہ برآمد ہوا اور ایک صاحب اِسے لے کر حیدرآباد پہنچے۔ وہاں اُنھوں نے اسے محمد عبدالرّزاق راشد کو دکھایا اور انھیں بتایا کہ وہ اسے بیچنا چاہتے ہیں...وہ نسخے کو دیکھ کر اس کی اہمیّت تو بھانپ گئے، لیکن وہ اس کے لیے کچھ دینا نہیں چاہتے تھے، اُنھوں نے مالک سے کہا کہ اِتنے مختصر وقت میں اسے دیکھنا محال ہے، آپ اِسے چھوڑ جایئے، میں اطمینان سے دیکھ کر فیصلہ کرسوں گا کہ آیا اِس میں کوئی نئی چیز ہے یا نہیں اور اِس کی قیمت کیا ہونا چاہیے۔

بات معقول تھی، مالک اِس پر راضی ہوگیا اور نسخہ اُن کے حوالے کر کے چلا آیا۔ مختصر سی چیز تھی، راشد صاحب نے راتوں رات اس کی نقل لے لی اور جب مالک اگلے دن اُن کی خدمت میں حاضر ہوا، تو یہ کہ کر کہ اس میں کوئی اہم اور نئی چیز نہیں ہے، اُنھوں نے خطّی نسخہ اسے واپس کر دیا۔

اُس کے دو چار دن بعد وہ شخص اسے لے کر ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی کے پاس پہنچا۔ یہ اُن دنوں وہاں عثمانیہ یونی ورسٹی کالج کے پرنسپل تھے۔ اُنھوں نے الٹ پلٹ کر اسے دیکھا تو فوراً جان گئے کہ یہ مجموعہ خود غالبؔ کا مرتّب کیا ہوا ہے ...اُنھوں نے مالک کو اس کے لیے دس روپے پیش کیے...اُس نے ان ۲۹ صفحات کے لیے ڈاکٹر صدّیقی سے یہ دس روپے بھی بہت غنیمت خیال کیے اور اُن کی پیش کش قبول کر لی۔ یوں یہ نسخہ ڈاکٹر صاحب کی تحویل میں آ گیا''[۲۴]

(مقدّمہ انتخابِ غالب، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۳۴، ۳۵)

تفصیلات اور جزئیات اِس طرح مرتّب صورت میں سامنے آئی ہیں کہ اُن پر یقین کر لینے کو جی چاہتا ہے، مگر مالک رام صاحب نے یہ کہیں نہیں بتایا کہ یہ تفصیلات اُنھیں معلوم کیسے ہوئیں اور کب معلوم ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ حوالے کے بغیر اِن تفصیلات کی کوئی حیثیت نہیں تھی، اُنھیں تسلیم نہیں کیا جا سکتا تھا؛ لیکن اِس سلسلے میں

کہیں اور تفصیلات نہیں ملتی تھیں، اِس لیے اُن کے اِس بیان کے لیے یہ فرض کر لیا گیا کہ وہ درست ہوگا۔

صدّیقی صاحب کے ذخیرے میں بہت سے معروف لوگوں کے خطوط اچھی خاصی تعداد میں محفوظ تھے۔ اُن کے فرزند جناب مسلم صدّیقی نے کچھ خطوط میرے پاس بھیج دیے، مگر یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں انتخابِ غالب کو مرتّب کر کے برائے اشاعت بھیج چکا تھا۔ اُن خطوں میں سیّد سجاد دہلوی (استادِ شعبۂ اردو، عثمانیہ یونی ورسٹی کالج حیدرآباد) کے بھی چھے خط تھے۔ یہ سب خط ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی کے نام ہیں۔ بعض خط طویل ہیں۔ فُل اسکیپ سائز کے کاغذ پر باریک لکھائی کے کُل ۲۲ صفحے ہیں۔ پہلا خط ۲۴/اگست ۱۹۲۶ء کا ہے اور آخری خط ۲۹/جنوری ۱۹۲۷ء کا۔ میرے پاس خطوں کا جو پُلندا آیا تھا، اُس میں کئی حضرات کے خط تھے۔ کچھ وقت تو اُن کے پڑھنے میں نکل گیا۔ جب سیّد سجاد صاحب کے خط پڑھنے بیٹھا تو اُس وقت تک

انشائے غالب چھپ کر آ چکی تھی۔ بہت قلق ہوا، خاص کر یوں کہ میں نے عدمِ واقفیت کی بنا پر مالک رام صاحب کی روایت کو درست سمجھ لیا تھا اور عبدالرّزاق صاحب کے بیان کو یکسر غیر معتبر فرض کر لیا تھا۔ اگر اِن خطوں کو پہلے دیکھ لیا ہوتا تو اُن دونوں باتوں سے متعلّق تفصیلات کسی اور طرح معرضِ بیان میں آتیں اور صورتِ حال کی وضاحت کی جاتی۔ اِن خطوں کو پڑھنے سے معلوم ہوا کہ یہ تو داستان ہی دوسری ہے، بات ہی بدلی ہوئی ہے اور یہ کہ اِس قضیّے میں مرکزی حیثیت سیّد سجاد صاحب کی تھی۔ صدّیقی صاحب کے خط میں ''جو شخص میرے ہاتھ بیچ رہا تھا'' سے مراد سیّد سجاد صاحب ہیں۔

اِن خطوں سے کئی باتیں معلوم ہوئیں: (۱) دہلی سے کوئی صاحب سیّد صاحب کے پاس کتابیں بہ غرضِ فروخت حیدرآباد بھیجا کرتے تھے اور سیّد صاحب اُن کتابوں کو مختلف افراد اور کتاب خانوں کو دیا کرتے تھے۔ (۲) سیّد صاحب نے ایک ایک دو خطوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کتاب اِس وقت تو یہاں موجود نہیں، جب میں دہلی جاؤں گا تب تلاش کروں گا یا لاؤں گا۔ (۳) سیّد صاحب نے اُن صاحب کا نام نہیں لکھا جو کتابیں بہ غرضِ فروخت بھیجا کرتے تھے (یا جن سے سیّد صاحب کتابیں منگایا کرتے تھے) مگر اندازِ بیان سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب کوئی قابلِ ذکر حیثیت رکھتے تھے۔ (۴) ایک خط کے ساتھ دو صفحوں پر مشتمل ۳۴ کتابوں کی فہرست بھی ہے۔ اِس فہرست میں ۳۴ نمبر پر ''غالب کے دو خطوط'' بھی ہیں جن کے لیے لکھا گیا ہے کہ یہ غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں اور ''جہاں تک میں سمجھتا ہوں

نامطبوعہ''۔(۵) جس خط کے ساتھ یہ فہرست منسلک ہے اُس میں ایک جگہ سیّد صاحب نے لکھا ہے:

''آپ کے ارشاد کے مطابق اب کے پھیرے میں ساطعِ برہان، تیغِ تیز، سعادت علی اور سیّاح کی تحریریں دہلی میں تلاش کروں گا اور کامیابی ہوئی تو آپ کی خدمت میں عرض کروں گا، لیکن یہ جملہ امور دہلی جانے پر موقوف ہیں''۔

یعنی لوگ سیّد صاحب سے کتابوں کی فرمایش بھی کیا کرتے تھے اور سیّد صاحب خود بھی دہلی میں قابلِ فروخت کتابوں (وغیرہ) کی تلاش کیا کرتے تھے۔ ۳۰ ستمبر کے خط میں لکھا ہے:

''آپ کی مطلوبہ کتب میں سے تین کتابیں... حیدرآباد میں موجود نہیں ہیں۔ اِن کا مجھے دہلی سے انتظار تھا..اِن کے مالک نے گذشتہ تین ماہ میں اِن کے بھیجنے کے متعلق دو مرتبہ لکھا...مگر وعدہ پورا نہ کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنی پہلی کتابوں کی فروخت اور اِن کی رقم پہنچ جانے کے منتظر ہیں...یہ کتابیں اُن کے پاس موجود ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ اُن کو میرے سوا کسی کے ہاتھ نہیں بیچیں گے''۔

اِن اقتباسات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سیّد سجاد صاحب کتابوں کی باقاعدہ خرید وفروخت کیا کرتے تھے اور عموماً کتابیں دہلی سے آتی تھیں یا وہ خود جا کر تلاش کر کے لاتے تھے۔

انشائے غالب کے خطّی نسخے کا ذکر اُن کے ۲۴ راگست کے خط میں موجود ہے۔ غالب کے دو خطوں اور بعض دوسری کتابوں کے متعلق اطّلاع دیتے ہوئے لکھا ہے:

''میرے پاس غالب کے رقعات و تقاریظ اور اشعار کا ایک مختصر سا انتخاب پہنچا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں اپنے سابقہ عریضے میں اِس کا ذکر کر چکا ہوں یا نہیں۔ یہ انتخاب خاص غالب کی قلم کا لکھا ہوا تو نہیں ہے لیکن کیا ہوا انھیں کا ہے۔ اِس لیے کہ اِس کے شروع میں غالب نے اپنی طرزِ خاص میں ایک دیباچہ اور آخر میں ایک خاتمہ تحریر فرمایا ہے۔ دیباچے میں وجہ یا ضرورتِ انتخاب کی صراحت کی ہے۔ یہ دونوں عبارتیں بالکل نئی چیزیں ہیں۔ تقاریظ تمام مطبوعہ ہیں، لیکن خطوط میں ایک خط اردوے معلّی کی کسی اڈیشن میں نہیں اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ بھی نیا ہے۔ یہ بھی خدمتِ والا میں مرسل کرتا ہوں۔ چاہے آپ اِس کو خرید لیں

یا اِس کی نقل لے لیں یا نقول کی ایک قلیل سی قیمت ادا فرما دیں اور اصل کو واپس فرما دیں۔ خطوط و انتخاب کے مالک پر میرا تھوڑا سا زور ہے میں اِس سے کام لے سکتا ہوں۔ یا آپ کی اجازت ہو تو میں ان کی قیمت ادا کر دوں...''

یہ خط تین ورق یعنی چھے صفحے کا ہے۔ آخری صفحے پر ختمِ عبارت کے بعد حاشیے پر یہ عبارت لکھی گئی ہے: ''خط آج ڈاک میں ڈال رہا ہوں۔ کل رجسٹری کے ذریعے سے (۱) غالب کے اصل خطوط (۲) خطوط مطبوعۂ ۱۸۶۵ء (۳) انتخاب (۴) برہانِ قاطع بھیجوں گا۔ آج رجسٹری کا وقت نہیں رہا''۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ انشاے غالب کے زیرِ بحث مخطوطے کو سیّد صاحب نے ۲۵/اگست ۲۶ء کو بہ ذریعۂ رجسٹری بھیجا ہوگا۔ صدّیقی صاحب اُس زمانے میں ڈھاکہ یونی ورسٹی میں تھے۔

اگلا خط ۳۰/ستمبر ۲۶ء کا ہے، اُس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ (اور کتابوں کے ساتھ) یہ خطّی نسخہ بھی صدّیقی کے پاس پہنچ گیا تھا۔ صدّیقی صاحب نے اِس دوران قیمت کے متعلّق دریافت کیا ہوگا، اِس خط میں اُس سلسلے میں یہ عبارت ملتی ہے:

''انتخاب، خطوطِ نامطبوعہ اور نامۂ غالب کی قیمت میں نے دریافت کی تھی۔ یہ جواب آیا کہ اِن کی قیمت ہی کیا، اِس کا دار و مدار خریدار کی ضرورت اور ذوق پر ہے۔ گویا قیمت مجھے پھر نہ معلوم ہو سکی۔ میری راے میں آپ اپنے اندازے سے اِن سب کی ایسی قیمت مقرر فرما کر بھیج دیجیے جس میں آپ کو نقصان کا اندیشہ نہ ہو، اُس کے بعد دیکھا جائے گا''۔

زیرِ بحث خطّی نسخے کے سلسلے میں سب سے اہم خط ۱۸/نومبر ۱۹۲۶ء کا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیّد صاحب نے یہ خطّی نسخہ پہلے عبدالرّزاق صاحب کو دیا تھا اور بعد کو اِسے صدّیقی صاحب کے پاس بھیجا۔ جب عبدالرّزاق صاحب نے اُسے چھاپ لیا تو اُس کے فوراً بعد اُنھوں نے اِس کی اطّلاع صدّیقی صاحب کو دی۔ سیّد صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

''انتخابِ رقعات و اشعارِ مرزا غالب، جس کا مسوّدہ آپ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں، اس کے متعلّق ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہے اور اِس کی اطّلاع مجھے کل ہی ملی ہے۔ یہ مسوّدہ میرے پاس دو ڈھائی سال سے تھا۔ گذشتہ سال مولوی

عبدالرّزاق صاحب... میرے پاس تشریف لائے اور اپنے پرچے کے لیے ...
مضمون مانگا۔ میں اُن ایّام میں حیدرآباد کے باہر جارہا تھا۔ عجلت میں مضمون تو کیا لکھ سکتا تھا، میں نے یہ مسوّدہ اُن کے حوالے کیا اور کہا یہ نایاب چیز ہے، آپ اِسے دیکھ کر اِس پر ایک نوٹ مرتّب فرمالیجیے۔ وہ اِسے لے گئے اور بجائے نوٹ ترتیب دینے کے، مسوّدے کی پوری نقل لے لی اور بغیر میری اجازت کے اپنے پرچے میں، جو کل ہی شائع ہوا ہے، اِسے نقل کردیا۔ اور نہ صرف اِسی مہربانی پر قناعت کی، بل کہ اِس کے سو نسخے علاحدہ چھپوا کر اِسے دکن کی ایک انجمن اربابِ ادب کے سلسلے میں داخل کردیا۔ اِس کے شائع ہونے کا تو مجھے رنج نہیں ہے، لیکن اشاعت نے جو صورت اختیار کی، وہ قابلِ افسوس ہے۔ بہ ہر حال وہ مسوّدہ اب آپ کے لیے بے کار ہوگیا، آپ اِسے اپنے مجموعے میں شامل نہ فرمائیں اور عنایت فرما کر اِسے واپس فرمادیں۔ نیز خط وغیرہ کی قیمت میں سے اِس کی قیمت وضع فرمالیں''۔

سیّد صاحب کے لکھنے کے مطابق یہ خطّی نسخہ ''دو ڈھائی سال سے'' اُن کے پاس تھا، یعنی ۲۴ء کے آغاز میں آیا ہوگا۔ اُنھوں نے ''گذشتہ سال'' اسے عبدالرّزاق صاحب کو دیا تھا، یعنی یہ واقعہ ۲۵ء کا ہے۔ یہاں مجھے دو باتوں پر تعجب ہے۔ سیّد صاحب خطّی نسخوں کی عمومی قدر و قیمت سے خوب واقف تھے اور اِس نسخے کی اہمیّت سے بھی بے خبر نہیں تھے۔ اِس صورت میں ایسے اہم مخطوطے کو اِس آسانی کے ساتھ کسی کے حوالے کردینا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ معذرتی الفاظ کس قدر کم زور اور کس قدر رسمی ہیں۔ اِسی سلسلے میں یکم دسمبر ۲۶ء کے خط میں سیّد صاحب نے لکھا ہے:

''اِس وقت تو مجھے اِس کے متعلّق ایک خفیف سی پریشانی یہ ہے کہ عبدالرّزاق نے نہ اِس کے چھاپنے کی اجازت لی اور نہ اِس کے دام ادا کیے ...اور مسوّدہ ایک بڑے جھگڑالو حضرت کا ہے۔ اِن کو معلوم ہوا کہ مسوّدہ اِس طرح چھاپ لیا گیا ہے اور اِس کے بعد اُنھیں نہ دام پہنچیں اور نہ مسوّدہ، تو ممکن ہے کہ وہ کچھ سر اُٹھائیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ عبدالرّزاق اِس کی کچھ قیمت ادا کردیں۔ اگر وہ وصول

ہوگئی تو پھر مسوّدہ آپ اپنے ہی پاس رکھیے گا''۔

''اور نہ اِس کے دام ادا کیے..سے بہ ظاہر تو یہ مترشّح ہوتا ہے کہ شروع ہی میں مخطوطے سے متعلّق داموں کی کچھ بات اُن سے ہوئی تھی، یہ الگ بات ہے کہ عبدالرّزاق صاحب زیادہ سمجھ دار نکلے اور اُنھوں نے مسوّدہ واپس کر دیا، خریدا نہیں، اور پھر کچھ وقفے کے بعد اُسے چھاپ لیا۔ جنوری کے خط سے میرے اِس شک کی تائید ہوتی ہے:

> ''انتخاب کا معاملہ طے شدہ تصوّر نہ فرمایئے۔ عبدالرّزاق صاحب کے پاس سے مجھے ہنوز کچھ نہیں وصول ہوا۔ دو ایک بار آدمی بھی بھیجا، مگر اُنھوں نے یہ کہلوا دیا کہ میں خود آ کر ملوں گا اور اِس کا جواب دوں گا''۔

سیّد سجاد صاحب کے بیانات سے واقعے کی مکمّل صورت گری نہیں ہو پاتی۔ یقین کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ واقعہ اُسی طرح واقع ہوا تھا جس طرح اُسے سیّد صاحب نے لکھا ہے۔ سیّد صاحب حیدرآباد میں موجود تھے، عبدالرّزاق صاحب بھی حیدرآباد میں تھے، جب عبدالرّزاق صاحب نے انتخابِ غالب کے پیش لفظ میں یہ لکھا تھا کہ یہ مخطوطہ، جو مولوی ضیاءالدین خاں کے کتب خانے سے آیا ہے، اب سیّد سجاد صاحب کے ''قبضے میں ہے'' اور:

> ''ہم آپ کے نہایت ممنون ہیں کہ آپ نے یہ مجموعہ اشاعت کی غرض سے ہمیں عنایت فرمایا ہے''۔

اِس سے یہ بات تو واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ عبدالرّزاق صاحب کو معلوم تھا کہ سیّد صاحب کے پاس دہلی سے کتابیں آتی ہیں۔ اُنھیں سے یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ یہ خطّی نسخہ مولوی ضیاءالدین خاں کے کتب خانے کا ہے۔ اِس صورت میں اِس خیال کا پیدا ہونا ناگزیر سا معلوم ہوتا ہے کہ سیّد صاحب نے یہ خطّی نسخہ محض نوٹ تیار کرنے کے لیے نہیں دیا ہوگا۔ کچھ اور بات ہوئی ہوگی، جس کا فی الوقت ہمیں علم نہیں۔

سیّد سجاد صاحب کے بیانات میں ایک اور اُلجھن سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اُنھوں نے ۱۸/نومبر کے خط میں صدّیقی صاحب کو مطّلع کیا ہے کہ گذشتہ سال میں نے عبدالرّزاق صاحب کو ''انتخابِ رقعات و اشعارِ مرزا غالب'' کا مسوّدہ دیا تھا اِس غرض سے کہ وہ اپنے رسالے میں چھاپنے کے لیے اُس پر ایک نوٹ مرتّب کرلیں۔ اُنھوں نے نوٹ مرتّب کرنے کے بجائے مسوّدے کی پوری نقل لے لی اور

اُسے چھاپ دیا اس کے بعد یکم دسمبر ۱۹۲۶ء کے خط میں اِسی خطّی نسخے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''میں نے اِس کے متعلّق عبدالرّزاق صاحب کو ایک نوٹ دیا تھا۔ اُنھوں نے اِسے بھی اپنے نام سے چھاپ ڈالا۔ اور جب مجھ سے ملے تو فرمایا کہ میں نے ایسا کیا ہے۔ چاہے اسے سرقہ سمجھیے یا کچھ اور''۔

پہلے خط میں سیّد صاحب نے اِس نوٹ کا ذکر نہیں کیا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ اُنھوں نے اِس مخطوطے سے متعلّق ایک نوٹ بھی تیار کر کے دیا تھا، تو پھر اُن کے اُس بیان سے کیا مطلب نکالا جائے گا جس میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ میں نے یہ مسوّدہ عبدالرّزاق صاحب کو اِس لیے دیا تھا کہ وہ اِس سے متعلّق ایک نوٹ مرتّب کر لیں۔ جب نوٹ مرتّب کر کے دے دیا گیا تھا تو پھر نوٹ مرتّب کرنے کا مطلب کیا تھا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیّد صاحب نے پورا واقعہ اُس طرح نہیں لکھا جس طرح وہ واقع ہوا تھا۔ ہمارے لیے فی الوقت یہ معلوم کرنے کی کوئی صورت نہیں کہ اصلاً کیا بات ہوئی تھی اور کیا طے ہوا تھا۔

ایک بات اور: سیّد صاحب کے اِس بیان کی روشنی میں کہ نوٹ میں نے مرتّب کر کے دیا تھا اور عبدالرّزاق صاحب نے ''اُسے بھی اپنے نام سے چھاپ ڈالا'' بہ ظاہر تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ عبدالرّزاق صاحب کے چھاپے ہوئے انتخابِ غالب میں اُن کے نام سے جو پیش لفظ بہ عنوانِ تقریب ہے، اُس کا بیش تر حصّہ اُن کا لکھا ہوا نہیں، بل کہ سیّد سجاد صاحب کا مرتّب کیا ہوا ہے، جسے اُنھوں نے اجازت کے بغیر چھاپ لیا۔

اب رہی مالک رام صاحب کی روایت، سُو وہ محض کہانی معلوم ہوتی ہے۔ سب سے بڑی بات اُس میں یہ ہے کہ اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبدالستّار صدّیقی صاحب اُن دنوں حیدرآباد میں تھے جب وہ شخص اُن کے پاس خطّی نسخہ بہ غرضِ فروخت لایا تھا اور دس روپے پر قناعت کر لی تھی! لیکن صدّیقی صاحب اُن دنوں ڈھاکہ یونی ورسٹی میں تھے، حیدرآباد میں تھے ہی نہیں۔ یہ بات خود مالک رام صاحب نے بھی لکھی ہے۔ تذکرۂ معاصرین کی دوسری جلد میں صدّیقی صاحب کے حالات کے ذیل میں اُنھوں نے لکھا ہے:

''۱۹۲۴ء میں وہ حیدرآباد سے ڈھاکہ یونی ورسٹی کے بلاوے پر شعبۂ عربی و علومِ اسلامی کے صدر بن کر وہاں چلے گئے... ڈھاکے میں تقریباً چار برس کے

قیام کے بعد وہ ۱۹۲۸ء میں صدرِ شعبۂ عربی و فارسی کی حیثیت سے الٰہ آباد آئے‘‘۔(ص۶۴)

مقالاتِ صدّیقی جلدِ اوّل کے آغاز میں اُس کے مرتّب اور صدّیقی صاحب کے صاحب زادے جناب مسلم صدّیقی نے بھی یہی لکھا ہے۔ سیّد سجاد صاحب کے خط میں صراحتاً مذکور ہے کہ یہ خطّی نسخہ (بعض اور کتابوں کے ساتھ) ڈاک سے رجسٹری کے ذریعے اُن کے پاس بھیجا گیا تھا۔ اِس صورت میں ایک صاحب کا مخطوطہ لے کر آنا، پہلے عبدالرّزاق صاحب کے پاس جانا، اُن کا رات بھر میں اُس کی نقل لے لینا اور پھر اُسے لوٹا دینا، دوسرے دن اُن صاحب کا صدّیقی صاحب کے پاس آنا، پوری کہانی سنانا اور پھر دس روپے قبول کر لینا؛ یہ سب داستانی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ صدّیقی صاحب تو حیدرآباد میں تھے ہی نہیں، دس روپے کس نے دیے اور بات کس سے ہوئی۔ معلوم نہیں یہ کہانی مالک رام صاحب کو کس نے سنائی تھی۔ مرحوم کی یہ عادت تھی کہ وہ سُنی سُنائی روایتوں پر بہ آسانی اعتبار کر لیتے تھے، اُنھیں درجِ کتاب کر لیا کرتے تھے اور حوالہ دیتے نہیں تھے۔ میں نے ایک بار اِس پر اعتراض کیا تھا تو اُنھوں نے اُس کا جواب یہ دیا تھا کہ اپنا اپنا طریقۂ[۲] کار ہے۔ اِسی طریقۂ کار کے باعث (جو سراسر غیر تحقیقی ہے) تذکرۂ معاصرین کی چاروں جلدوں میں بہت سی کم زور یا غیر معتبر روایتیں شامل ہو گئی ہیں اور اِس نے اِن کتابوں کی (اور اُن کی اور بہت سی تحریروں کی) استنادی حیثیت کو بے حد مشکوک بنا دیا ہے۔ وہی صورتِ حال یہاں بھی رونما ہوئی ہے۔

اِس بحث کی تلخیص اِس طرح کی جا سکتی ہے: (۱) انشاے غالب کا مخطوطہ سیّد سجاد صاحب کے بیان کے مطابق ۱۹۲۴ء میں کسی وقت اُن کے پاس آیا ہوگا۔ (۲) یہ مخطوطہ دہلی سے آیا تھا اور اِس کے مالک کوئی عام تاجرِ کتب نہیں تھے، کوئی خاص حیثیت رکھتے تھے۔ اگر عبدالرّزاق صاحب کے بیان کو تسلیم کر لیا جائے (اور جس کے ماننے میں بہ ظاہر کوئی قباحت نظر نہیں آتی) تو یہ خطّی نسخہ دہلی سے مولوی ضیاءالدین صاحب کے کتب خانے سے آیا تھا۔ (۳) سیّد سجاد صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے ۲۵/اگست ۱۹۲۶ء کو (یا اس کے ایک دو دن بعد) اُس خطّی نسخے کو ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی کے پاس بہ غرضِ فروخت بہ ذریعۂ ڈاک بھیجا تھا۔ (صدّیقی صاحب اُس زمانے میں ڈھاکہ یونی ورسٹی میں تھے)۔ (۴) ۱۸/نومبر ۱۹۲۶ء کے خط میں سیّد صاحب نے صدّیقی صاحب کو مطّلع کیا کہ میں نے

عبدالرّزاق صاحب کو وہ خطّی نسخہ ''گذشتہ سال'' (یعنی ۱۹۲۵ء میں کسی وقت) دیا تھا اور اب اُنھوں نے اِسے اپنے رسالے میں چھاپ لیا ہے میری اجازت کے بغیر اور اُس کے سو نسخے الگ سے بھی چھاپ لیے ہیں۔ (۵) عبدالرّزاق صاحب کا بیان یہ ہے کہ سیّد صاحب نے وہ خطّی نسخہ مجھے چھاپنے کے لیے دیا تھا۔ (۶) یہ بات اِن خطوں سے معلوم نہیں ہوسکی کہ جب صدّیقی صاحب نے اِس ''حادثے'' کے باوجود مخطوطے کو اپنے پاس رکھنا چاہا (اور رگھا) اُس کے لیے کتنی رقم ادا کی تھی؟

اِس سلسلے کی دو باتیں وضاحت طلب ہیں۔ پہلی بات انشائے غالب کی وجہِ تالیف سے متعلق ہیں۔ مالک رام صاحب نے اِس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، اُسے ابتدائے مضمون میں نقل کیا جاچکا ہے۔ اُس سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی ضیاء الدین خاں کی فرمائش کے نتیجے میں غالبؔ نے اِس کتاب کو مرتّب کیا تھا۔ میں یہ بات پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ مولوی صاحب کی مرتّب کی ہوئی نصابی کتاب انشائے اردو میں نے نہیں دیکھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ مولوی صاحب نے اُس کے دیباچے میں اِس سلسلے میں کچھ لکھا ہے۔ اگر وہاں کچھ مرقوم نہیں، تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ اِس سلسلے میں محوّلۂ بالا عبارت میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ کہاں سے معلوم ہوا؟

سب سے بڑھ کر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ مولوی صاحب نے اگر مرزا صاحب سے محض نثر کی فرمائش کی تھی، تو پھر مرزا صاحب نے یہ طریقہ کیوں اختیار کیا کہ نثر اور نظم، دونوں پر مشتمل با قاعدہ ایک کتاب مرتّب کی، اُس پر مقدّمہ لکھا اور مقدّمے میں یہ بھی لکھا:

> ''یہ مجموعہ نذر اُس جنابِ رفعت مآب کی ہے جس سے عزّت و توقیر فنانشل کمشنری پنجاب کی... حضرت فلک رفعت مکلوڈ صاحب بہادر''۔

یہی نہیں، یہ بھی لکھا:

> ''پس یہ کتاب اگر اُن کے حکم سے چھاپی جائے گی، تو صاحبانِ تازہ واردِ ولایت کے پڑھنے کے کام آئے گی''۔

اِس کے بعد اپنے چچا کی ''سرداری اور ریاست'' کا کچھ حال لکھا اور پھر اِس خواہش کا اظہار کیا: ''البتہ میں اس کا مستحق ہوں کہ کوئنس پوئٹ گنا جاؤں''۔

مرزا صاحب نے اِس کے لیے لفظِ ''مجموعہ'' اور پھر لفظِ ''کتاب'' استعمال کیا ہے۔ اُن کے

مقدّمے کی عبارت کو پڑھ کرنا گزیر طور پر یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ مرزا صاحب نے اصلاً ایک باقاعدہ ''نصابی مجموعہ'' مرتّب کیا تھا، جسے پنجاب کے فنانشل کمشنر کے نام معنون کیا۔ اِس کا امکان ہے کہ اُن کو کسی ذریعے سے یہ معلوم ہوا ہو کہ حکومتِ وقت نو وارد انگریز افسروں کے لیے ایک نصابی مجموعہ مرتّب کرانا چاہتی ہے۔ اُنھوں نے اِسے ''مدّعا برآری'' کا ایک اچھا وسیلہ سمجھا ہو اور اِس خیال کے تحت اِس کتاب کو مرتّب کیا ہو۔

ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی نے عرشی صاحب کے نام ایک خط میں (''مص'' کی تشریح کے سلسلے میں) ضمنی طور پر اِس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، اُس سے بھی یہی مترشّح ہوتا ہے۔ صدّیقی صاحب کے خط کی متعلّقہ عبارت یہ ہے:

> ''میرے پاس ایک اور قلمی چیز ہے۔ غالب کو خیال ہوا کہ ''صاحبانِ تازہ واردِ ولایت کے پڑھنے'' کے لیے ایک اردو کتاب بنائیں۔ چناں چہ اپنے لکھے ہوئے دو دیباچے اور کئی رُقعے کاتب سے نقل کروائے۔ شروع میں اِس کتاب کا خطبہ لکھ کر لگایا...اس کا جو نسخہ میرے پاس ہے، اِس میں تقریباً ہر رُقعے کی ابتدائی سطروں کے مقابل حاشیے پر ''نوشتہ شد'' اور لال روشنائی سے ''مقابلہ نمودہ شد'' لکھا ہوا ہے۔ کہیں کہیں کوئی عبارت قلم زد کی گئی ہے، کہیں کوئی لفظ۔ دو رُقعے سراسر کاٹ دیے گئے ... اِس کتاب میں جہاں کہیں حک اور اصلاح ہوئی ہے، مرزا غالب کے قلم سے معلوم ہوتی ہے۔ اصلاح کے لفظ جو کہیں کہیں آئے ہیں، اُنھیں کے خط میں ہیں''۔

(نوشتۂ ۱۸ر ستمبر ۱۹۴۳ء، نقوش خطوط نمبر، جلدِ سوم، ص ۲۵)

یعنی غالب نے ''صاحبانِ تازہ واردِ ولایت'' کے لیے ایک باقاعدہ نصابی ''کتاب'' مرتّب کی تھی۔ میری رائے میں یہی بات مرجّح حیثیت رکھتی ہے۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ مولوی ضیاء الدین خاں نے اپنی نصابی کتاب انشاے اردو میں غالب کی جو نثر شامل کی، وہ اِسی ''کتاب'' سے ماخوذ تھی۔ یہ بھی طے شدہ ہے کہ یہ مجموعہ اُن کے پاس تھا اور اُنھوں نے اِسی مجموعے کو کتابت کے لیے کاتب کے حوالے کر دیا تھا۔ کاتب نے اِسی نسخے پر ''نوشتہ شد''

لکھا ہے اور کاتب ہی نے یا مصحح نے ''مقابلہ کردہ شد'' کے الفاظ لکھے ہیں۔ مکمل کتاب مولوی صاحب کے پاس کس طرح پہنچی، اِس کا احوال معلوم نہیں۔ اِس کا امکان ہے کہ مولوی صاحب نے مرزا صاحب سے اجزاے نثر کی فرمایش کی ہو اِس صراحت کے ساتھ کہ ایک نصابی کتاب میں انھیں شامل کرنا ہے۔ مرزا صاحب نے کچھ اور خیال کیا ہو اور پوری کتاب مرتب کر کے بھیج دی ہو۔ اِس کا بھی امکان ہے کہ مرزا صاحب نے بہ طورِ خود کتاب مرتب کی ہو اور جب صحیح صورتِ حال کا علم ہوا ہو تو مولوی صاحب کی فرمایش کے سلسلے میں اِس مجموعے کو اُن کے پاس بھیج دیا ہو کہ وہ خود انتخاب کر لیں۔ یہ سب قیاسات ہیں۔ جو معلومات سامنے ہے، اُس کی روشنی میں فی الوقت قطعیت کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مرزا غالبؔ کا مرتب کیا ہوا وہ مجموعہ مولوی صاحب کے پاس محفوظ رہا اور اُن کے انتقال کے بعد، جب اُن کے کتب خانے کی کتابیں بہ غرضِ فروخت حیدر آباد جانے لگیں سیّد سجاد صاحب کے توسّط سے، تب یہ مجموعہ بھی حیدر آباد پہنچ گیا۔

دوسری وضاحت طلب بات ہے عبدالرّزاق صاحب کے چھاپے ہوئے انتخابِ غالب اور رسالۂ تحفہ کے اُس مشترک شمارے کا سنہِ طباعت جس میں اصلاً یہ انتخابِ غالب شائع ہوا تھا۔

میرے سامنے رسالۂ تحفہ (حیدر آباد) کا وہ شمارہ ہے جس کے ساتھ انتخابِ غالب شائع ہوا تھا۔ اُس کے سرورق کی تیسری سطر میں ''نمبر ۱۰ و ۱۱ و ۱۲'' لکھا ہوا ہے۔ اِسی سطح میں، اِس کے آگے ''شوال ذی قعدہ ذی الحجہ ۱۳۴۴'' لکھا ہوا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین مہینوں کا مشترک شمارہ ہے۔

اِسی صفحے پر اِس کے بعد فہرستِ مضامین ہے۔ اِس فہرست کا آخری اندراج انتخابِ غالب ہے۔ اِس اندراج سے پہلے ''حصّۂ نظم'' کے عنوان کے آگے صفحے کا نمبر ''۴۸'' لکھا ہوا ہے۔ انتخابِ غالب کے عنوان کے سامنے کوئی صفحہ نمبر درج نہیں۔ رسالہ ص ۴۸ پر ختم ہو جاتا ہے (یا یوں کہیے کہ مکمل ہو جاتا ہے)۔ اِس کے بعد نیا سرورق لگایا گیا ہے، جس کے مندرجات کی تفصیل یہ ہے: ''سلسلۂ انجمن اربابِ اردو/ نمبر (۲) انتخابِ غالب/ یعنی/ مرزا اسداللہ خاں غالبؔ دہلوی کے خطوط، لطائف، اشعار اور نقلوں کا/ ایک مختصر مجموعہ جس کو اُنھوں نے خود مرتب کیا تھا اور/ جواب تک طبع نہیں ہوا/ بہ تحشیہ و مقدّمہ/ از/ محمد عبدالرّزاق ایچ۔ بی۔ ایس،/ مددگار محاسب سرکار عالی حکومتِ آصفیہ/ ۱۳۴۵ھ/ مطبوعہ چشتیہ پریس چھتہ بازار حیدر آباد دکن''۔

یعنی رسالۂ تحفہ (حیدرآباد) کے مشترک شمارۂ ۱۰، ۱۱، ۱۲، شوّال، ذی قعدہ، ذی الحجّہ) کے آخر میں اِس مجموعے کو انتخابِ غالب کے نام سے ایک الگ رسالے کی صورت میں، الگ سرورق کے ساتھ چھاپا گیا تھا اور پھر اُسی حصّے کو رسالے کے اُس شمارے سے الگ کر کے مستقل رسالے کی صورت میں لے آیا گیا۔ چوں کہ رسالۂ تحفہ کا یہ شمارہ بیش تر لوگوں کی نظر سے نہیں گزرا تھا، اِس لیے اِس غلط فہمی نے رواج پایا کہ یہ انتخاب حیدرآباد میں دو بار چھپا تھا، ایک بار رسالۂ تحفہ میں اور ایک بار الگ سے کتابی صورت میں۔ یہ غلط فہمی بھی پھیلی کہ یہ انتخاب رسالۂ تحفہ کے تین شماروں میں (قسط وار) چھپا تھا۔ صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ عبدالرّزاق صاحب نے حیدرآباد میں اِسے ایک ہی بار چھاپا تھا رسالۂ تحفہ کے ساتھ۔ رسالۂ تحفہ کا یہ شمارہ تین مہینوں کا مشترک شمارہ تھا۔ ساتھ ہی انتخابِ غالب کے حصّے کو الگ سے کتابی شکل میں پیش کیا گیا اور اِس طرح یہ ایک مستقل کتاب بن گئی۔ سیّد سجاد صاحب نے اپنے ۱۸/نومبر ۱۹۲۶ء کے خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ اِس کے سو نسخے علاحدہ چھپوائے گئے تھے۔

اِس سلسلے کی دوسری بات ہے سنہِ طباعت۔ رسالۂ تحفہ کے سرورق پر صرف یہ مرقوم ہے: ''شوال ذی قعدہ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ''، اِس کا واضح طور پر مطلب یہ ہے کہ یہ اُن تین مہینوں کی نشان دہی ہے جن کا تعلّق اِس خاص شمارے سے ہے۔ ''۱۳۴۴ھ'' سنہِ طباعت نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ شمارہ ۱۳۴۴ھ میں چھپا تھا۔ اِس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ۱۳۴۴ھ کے اُن آخری تین مہینوں کا یہ مشترک شمارہ ہے — انتخابِ غالب کے سرورق پر سالِ طبع ''۱۳۴۵ھ'' مرقوم ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ رسالۂ تحفہ ''مع انتخابِ غالب'' ۱۳۴۵ھ میں چھپا تھا۔

سیّد سجاد صاحب نے ۱۸/نومبر ۱۹۲۶ء کے خط میں صدّیقی صاحب کو انتخابِ غالب کے چھپ جانے کی اطّلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ عبدالرّزاق نے اِسے ''بغیر میری اجازت کے اپنے پرچے میں، جو کل ہی شائع ہوا ہے، اِسے نقل کر دیا''۔ ''کل ہی شائع ہوا ہے'' کا مطلب بہ ظاہر یہی ہے کہ ۱۷/نومبر ۱۹۲۶ء کو رسالۂ تحفہ کا وہ شمارہ شائع ہوا تھا جس کے ساتھ انتخابِ غالب چھپا تھا۔ (اِس تعیّن میں زیادہ سے زیادہ ایک دو دن کا فرق ہو سکتا ہے)۔ میرے سامنے انجمن ترقّیِ اردو پاکستان کی شائع کی ہوئی تقویم ہے۔ اُس کے مطابق ۱۳۴۵ھ مشتمل ہے ۱۲/جولائی ۱۹۲۶ء سے ۳۰/جون ۱۹۲۷ء

کے عرصے پر۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۳۴۴ھ کے آخری تین مہینوں پر مشتمل رسالۂ تحفہ کا شمارہ ۱۳۴۵ھ کے پانچویں مہینے میں شائع ہوا تھا۔ یہی سنہِ اشاعت انتخابِ غالب کا قرار پاتا ہے، یعنی انتخاب غالب، عبدالرّزاق صاحب کے اہتمام سے نومبر ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا۔

ذیل میں سیّد سجاد صاحب دہلوی کے خطوں کا مکمّل متن پیش کیا جاتا ہے۔ اِس کے دو مقصد ہیں: ایک تو یہ کہ سیّد صاحب کے یہ خط محفوظ ہو جائیں کہ اِن میں کام کی کچھ باتیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ انتخابِ غالب کے خطّی نسخے سے متعلّق سیّد صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ سامنے آجائے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، یہ سب خط ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے نام ہیں، جو اُن دنوں ڈھاکہ یونی ورسٹی میں تھے۔ خط نمبرا کے ساتھ ایک ورق الگ سے منسلک تھا جس کے دونوں طرف کتابوں کے نام لکھے ہوئے ہیں بعض کے سامنے قیمتیں بھی لکھی گئی ہیں۔ اِس خط میں اِس کا حوالہ بھی آیا ہے۔ اِس ورق کے دونوں صفحے عکسی صورت میں اِس خط کے ساتھ ہی پیش کیے گئے ہیں۔

کنگ کوٹھی روڈ، حیدرآباد دکن

۲۴/اگست ۲۶ء

جناب مخدومی شفیقی زادلطفہ آداب عرض

والا نامہ مجھے کل شام کو ملا اور نوکر نے یہ بیان فرمایا کہ یہ کل کا آیا ہوا رکھا ہے۔ آج پوسٹ مین سے تحقیقات کی اور لفافے کی مہر کو دیکھا تو یہ ۱۲/اگست کا حیدرآباد پہنچا ہوا ہے۔ یہ عجیب ماجرا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نوکر اِسے رکھ کر بھول گیا۔ افسوس ہے آپ اب تک اِس کے جواب کے انتظار کی زحمت اُٹھا رہے ہوں گے۔

غالبؔ کے خطوں کے متعلّق آپ کو یہ معلوم کر کے افسوس ہوگا کہ میں نے اُن دونوں کی نقلیں مولوی عبدالحق صاحب کے پاس رسالۂ اردو میں چھپنے کے لیے بھیج دیں۔ تین ہفتے ہوئے وہ حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ اُن خطوں کو اور اُن

کے نا مطبوعہ ہونے کو دیکھ کر بے چین ہوئے اور مجھ سے نقلوں کی فرمائش کی۔ میں نے فوراً اِس کی تعمیل کر دی۔ خدا جانے وہ اُن کو جولائی کے نمبر میں چھاپیں گے یا اکتوبر کے نمبر میں۔ جولائی کا پرچہ ہنوز کتب خانے میں موصول نہیں ہوا، تاہم میں اصل خطوط آپ کی خدمتِ گرامی قدر میں بھیجے دیتا ہوں۔ آپ بھی اُنھیں ملاحظہ فرمالیں اور ایک ایسی قلیل قیمت پر خرید فرمالیں جس کا مجھے علم نہیں لیکن جو مالکِ خطوط کو بہت زیادہ ناگوار نہ گزرے۔ آپ کو ایسی چیزوں کا وسیع تجربہ ہے اور قیمت کے متعلق آپ کا فیصلہ میرے نزدیک نہایت معتبر ہوگا۔

میں نے غالبؔ ہی کا ایک خط اور نکالا ہے اور وہ عنقریب حیدر آباد آنے والا ہے۔ میں اُسے بجنسہٖ جناب کی خدمت میں روانہ کر دوں گا اور عبدالحق صاحب کو نہ دوں گا اِس لیے کہ مجھے یہ معلوم کر کے نہایت مسرّت ہوئی کہ آپ[8] کے اِس قطع کے اور رقعات موجود ہیں اور آپ اُن کو طبع فرمانے کا قصد رکھتے ہیں۔

میرے پاس غالبؔ کا ایک خط نہایت طویل تقریباً ۲۰ یا ۲۵ صفحے کا اور ہے۔ اِسے میں خدمت میں بھیجتا ہوں۔ یہ مطبوعہ رقعات میں شامل نہیں ہے، لیکن جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے ۱۸۶۵ء میں ایک مرتبہ خود غالبؔ کی حیات میں چھپ چکا ہے۔ اِس کی نقل حکیم احسن اللہ خاں غدار نے کرائی تھی اور یہ وہی نقل ہے۔ ۵۰ سال کے بعد اور نایاب ہونے کی وجہ سے یہ بھی تقریباً نیا ہے۔ خواہ آپ اِس کو خرید لیں خواہ اِس کی نقل حاصل فرمالیں۔ اگر آپ خرید لیں تو زیادہ مناسب ہے۔

میرے پاس غالبؔ کے رقعات، تقاریظ اور اشعار کا ایک مختصر سا انتخاب بھی پہنچا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں اپنے سابق عریضے میں اِس کا ذکر کر چکا ہوں یا نہیں۔ یہ انتخاب خاص غالبؔ کی قلم کا لکھا ہوا تو نہیں ہے لیکن کیا ہوا اُنھیں کا ہے، اِس لیے کہ شروع میں غالبؔ نے اپنی طرزِ خاص میں ایک دیباچہ اور آخر

میں ایک خاتمہ تحریر فرمایا ہے۔ دیباچے میں وجہ یا ضرورتِ انتخاب کی صراحت کی ہے۔ یہ دونوں عبارتیں بالکل نئی چیزیں ہیں۔ تقاریظ تمام مطبوعہ ہیں لیکن خطوط میں ایک خط اردوے معلّی کی کسی اڈیشن میں نہیں نکلا اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ بھی نیا ہے۔ اِس انتخاب میں رقعات کے بعد دو ایک نقلیں اور ایک... حکایت بھی ہے۔ ان کا ذکر مولوی حالؔی نے یادگارِ غالب میں فرمایا ہے لیکن نہایت سرسری طور پر۔ غالبؔ نے اِنھیں کو اپنی عبارت اور ظرافت کے پیرایے میں لکھا ہے۔ بہ ہر حال آپ اِن باتوں کو خود ہی دریافت فرمالیں گے۔ میں نے انتخاب کے مواد کا مقابلہ اردوے معلّی کی چار مختلف اڈیشنوں سے کیا ہے۔ یہ بھی خدمتِ والا میں مرسل کرتا ہوں۔ چاہے آپ اِس کو خرید لیں یا اس کی نقل لے لیں یا نقول کی ایک قلیل سی قیمت ادا فرمادیں اور اصل کو واپس فرمادیں۔ خطوط و انتخاب کے مالک پر میرا تھوڑا سا زور ہے میں اِس سے کام لے سکتا ہوں۔ یا آپ کی اجازت ہو تو میں اِن کی قیمت ادا کردوں آپ صرف نقول حاصل فرمالیں لیکن آپ اِن کو اپنے مجموعے میں طبع ضرور فرمادیں۔

قاطعِ برہان کا نسخہ میرے ساتھ حیدرآباد میں ہے، اِس کی قیمت صرف پانچ روپے ہے، اِسے آپ خود ہی لے لیں۔ اگر کوئی دوسرا نسخہ دست یاب ہوگیا تو یونی ورسٹی کے لیے بھیج دوں گا لیکن مجھے امید مطلق نہیں۔ اِسے بھی بہ ذریعۂ رجسٹری خدمتِ گرامی میں بھیج رہا ہوں۔

شرح قصائدِ سوداؔ تین یا چار دن گزرے الٰہ آباد یونی ورسٹی کے پروفیسر اردو میرے ایک دوست سیّد حفیظ صاحب کے پاس بھیج چکا ہوں۔ اسے سیّد صاحب نے ۲۵ء میں خرید لیا۔ چھوٹی سی کتاب تھی۔ کچھ قصائد اور مثنویات وغیرہ کی شرح تھی۔ میں نے اِسے بھی نہایت کارآمد پایا تھا۔ اِس میں اشعارِ متن بھی درج تھے جو مطبوعہ کلیاتِ سوداؔ انتخابِ کلیات میں عام طور سے غلط ملتے ہیں۔ اِس

کی نسبت میں نے تحریک کی ہے اسے چھپوا دیا جائے۔

دیوانِ صائبؔ دہلی میں ایک صاحب کے پاس ہے۔ میں نے اِس کو نہایت عجلت کی نظر سے دیکھا تھا اور مجھے اِس کی قیمت بھی معلوم نہیں۔ اب کوشش کر کے حیدرآباد منگائے لیتا ہوں۔ مزید تفصیل اور قیمت سے جناب کو مطّلع کروں گا۔ فوائدالافکار کا حال کسی اور عریضے میں عرض کروں گا۔ باقی کتابوں کی قیمت ایک دوسرے پرچے پر درج کرتا ہوں۔ اِن میں سے بعض کتب مثلاً دوسو روپے والی پند و نصائح اور تذکرۂ شعرا کے لیے مولوی عبدالحق صاحب نے اور طبقات الشعرا کے لیے سیّد حفیظ صاحب نے فرمایش کی ہے۔ مولوی صاحب نے پند و نصائح کی قیمت پر اعتراض کیا ہے اور میں نے اِس اعتراض کو مالکِ کتاب کے پاس بھیج دیا ہے۔ دیکھیے کیا جواب آتا ہے۔ اگر آپ کی یونی ورسٹی کو بھی بعض قیمتیں زیادہ معلوم ہوں تو مجھے ضرور مطّلع فرمایئے لیکن میں اِن کو اُن صاحب کے ہاتھ فروخت کروں گا جن کی بولی سب سے زیادہ ہوگی۔ اِس لیے کہ جہاں میرا ایک جانب ضروری فرض یہ ہے کہ اُنھیں محفوظ کر لیا جائے، وہاں یہ فرض بھی ہے کہ کتاب کے مالکان کو قیمت میں نقصان نہ پہنچے۔

جو کتابیں آپ کے ہاں خرید لی جائیں گی اُن کی قیمت ادا ہونے سے قبل میں اُن کو آپ کی خدمت میں بیمے کے ذریعے بھیج دوں گا۔ آپ نے اِن کو ایسا ہی پایا جیسا میں بتلا چکا ہوں تو اِس کے بعد آپ قیمت بھیجنے کا انتظام فرما دیں۔ سخت تعجّب ہے کہ ریاضی وغیرہ کی کتابوں پر آپ کی یونی ورسٹی نے توجہ نہیں کی۔ یہ تو تمام کتابوں سے زیادہ ضروری ہیں خاص کر دہلی سوسائٹی کی کتابیں تو انمول ہیں۔ یہ نسخے کہیں نکل گئے تو پھر کہاں سے آئیں گے اور بغیر اِن کے آپ کی یونی ورسٹی میں تحقیقاتِ زبان و ادب اردو کیوں کر ممکن ہوگی۔ آپ کے ارشاد

کے مطابق میں اِن کے لیے لکھنؤ، اعظم گڑھ وغیرہ لکھوں گا۔ مجھے اِن کتابوں کی جدائی کا بڑا صدمہ ہے۔

میں نے ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو آپ کی ہدایت کے خلاف آپ کا پیام و سلام نہیں پہنچایا۔ اُنھوں نے آپ کی مہربانیوں اور پے در پے طلبیوں کو پروفیسر مارگولیتھ کی تائید و تقاضے اور اپنی خوبی و لیاقت پر محمول فرمایا ہے اور اِس کا چرچا جا بہ جا کیا ہے۔ حالاں کہ جس زمانے میں مَیں نے آپ کی خدمت گرامی قدر میں اُن کے متعلق عریضہ لکھا ہے تو یہ محکمے کی بے ایمانیوں اور سخت بے التفاتیوں سے بغایت نالاں تھے اور ڈھاکے کے موقعے کو ایک نعمت خیال فرماتے تھے بل کہ اگر میرا ظن، ظنِ بد نہیں ہے تو آپ کی مہربانی کا آفرنہ آنے کی صورت میں شاید دس سال تک اُن کو پروفیسر کا گریڈ نہ ملتا اگر ڈھاکے کا معاملہ پیش نہ آتا اور اگر آیا تھا اور یہ اُس کے ساتھ یہ سلوک نہ کرتے تو مجھے اُن کی ترقّی سے بے حد خوشی ہوتی لیکن اب تو ایک شکایت سی پیدا ہوگئی ہے۔ میں آپ کی نظروں میں اپنے آپ کو بھی کسی قدر نادم سمجھتا ہوں۔ میں نے اُن سے اِس معاملے میں دہلی کے خط کے بعد کوئی ذکر نہیں کیا اِس سبب سے آپ کا پیام پہنچانے سے بھی قاصر رہا۔ مولوی غلام نبی اور محمد ابراہیم صاحب اُن کے ماتحت کر دیے گئے ہیں، دونوں سرکشی پر تلے ہوئے ہیں۔

حیدرآباد کے حالات آپ نے اخباروں میں ملاحظہ فرمائے ہوں گے۔ یہاں اِس پرسش کو ایک خطرۂ عظیم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خدا کرے جو کچھ ہو، مسلمانوں کی بہتری کے لیے ہو۔ امید کہ مزاج والا بہ عافیت ہوگا۔

خادم سیّد سجاد

خط آج ڈاک میں ڈال رہا ہوں، کل رجسٹری کے ذریعے سے (۱) غالب کے اصل خطوط (۲) خط

مطبوعہ ۱۸۶۵ء (۳) انتخاب غالب (۴) برہانِ قاطع بھیجوں گا۔ آج رجسٹری کا وقت نہیں رہا۔

(۲)

حیدرآباد

۳۰/ستمبر ۲۶ء

مخدومی ومکرّمی زادلطفہٗ آداب عرض

والا نامہ مجھے دو پہر قبل مل گیا تھا۔ آپ کی عنایت وتوجّہ کا شکریہ۔ میں یہ جواب خدمتِ گرامی میں بہت تعویق کے بعد بھیج رہا ہوں۔ اِس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ آپ کی مطلوبہ کتب میں سے تین کتابیں طبقات الشعرا، شعرائے عرب اور تاریخ ابوالفدا میرے پاس حیدرآباد میں موجود نہیں ہیں۔ اِن کا مجھے دہلی سے انتظار تھا۔ اور دوسرا سبب یہ کہ کامل ایک عشرے سے میری طبیعت ناساز ہے۔ میں کالج بھی نہیں جارہا ہوں۔ آج بڑی ہمّت کر کے یہ عریضہ لکھنے بیٹھا ہوں لیکن افسوس ہے کہ مذکورالصدر کتب ابھی تک دہلی سے وصول نہیں ہوئیں۔ اِن کے مالک نے گذشتہ تین ماہ میں اِن کے پہنچنے کے متعلق مجھے دو مرتبہ لکھا اور دو مرتبہ سخت منتظر رکھا مگر وعدہ پورا کر کے نہ دیا۔ شاید اِس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنی پہلی کتابوں کے فروخت ہونے اور اُن کی رقم پہنچ جانے کے منتظر ہیں۔ اِس کے بعد وہ اُن کتابوں کو روانہ فرمائیں گے۔ یہ کتابیں اُن کے پاس موجود ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ اُن کو میرے سوا کسی صاحب کے ہاتھ نہیں بیچیں گے۔

میرا ارادہ تھا کہ جو کتابیں میرے ساتھ حیدرآباد میں ہیں وہ حسب الارشاد آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا مگر آپ کو یہ معلوم کر کے افسوس ہوگا کہ میں نے یہ ارادہ اب ترک کردیا ہے۔ چند روز ہوئے میں نوّاب صدر یار جنگ شروانی صاحب سے ملا تھا۔ دورانِ گفتگو میں اُن سے اِن کتابوں کا ذکر

بھی آیا اور جب اُن کو یہ علم ہوا کہ میں اِنھیں عنقریب آپ کی خدمت میں ارسال کرنے والا ہوں تو وہ بہت برہم ہوئے اور کہا کہ اُن کتابوں پر پہلے عثمانیہ یونی ورسٹی کا حق ہے، اُس کے بعد کسی اور کتب خانے کا۔ میں نے یہاں کی مشکلات بیان کر دیں تو اُنھیں رنج ہوا اور پھر یہ کہا کہ میں بالفعل وطن جا رہا ہوں، واپسی پر میں خود کوشش کر کے اُنھیں کالج کے کتب خانے میں ضرور داخل کرادوں گا۔ آپ اِن کتابوں کو اپنے پاس محفوظ رکھیں۔

جناب کو یاد ہوگا کہ میں ان کتابوں کو اپنے ہی کالج کے لیے اور اپنی ضرورت سے لایا تھا، لیکن جب میں یہاں سے مایوس ہوگیا تھا تو میں نے آپ کی خدمت والا قدر میں عریضہ بھیجا تھا۔ اب یہ صورت پیدا ہوگئی ہے اس لیے مجھے امید ہے کہ از راہِ شفقت و ہمدردی آپ میرے اِس فعل کو خلافِ طبع گرامی محسوس نہ فرمائیں گے اور شیروانی صاحب نے جو وعدہ فرمایا ہے اُس کے پورا ہونے کا موقع عطا فرمائیں گے۔ تاہم قاطع القاطع جو خاص آپ کی ضرورت کی کتاب ہے بہ ذریعۂ رجسٹری خدمت میں بھیجتا ہوں۔ اِس کی رسید سے اطّلاع بخشیں اِس کے سوا کوئی اور کتاب جو قاطع القاطع کی مانند خاص آپ کے کام کی ہو اُس کے نام سے آگاہ فرمائیں تو شیروانی صاحب کی ہدایت کے باوجود میں اِسے بھی آپ کی خدمت میں ضرور بھیج دوں گا۔

طبقات، عرب اور ابوالفدا کی نسبت ایک خط میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کے نسخے میں نے اپنے کتب خانے میں دو سال پہلے داخل کرا دیے ہیں۔ جن نسخہ جات کا مجھے دہلی سے انتظار ہے وہ آپ کی خدمت میں بھیج سکتا ہوں، اِس لیے جب وہ موصول ہو جائیں گی تو آپ کے پاس روانہ کر دوں گا۔

آپ کے ارشاد کے مطابق اب کے پھیرے میں ساطع برہان، تیغ تیز، سعادت علی اور سیّاح کی تحریریں دہلی میں تلاش کروں گا اور کام یابی ہوئی تو آپ کی خدمت میں عرض کروں گا۔ مجھے ۱۸۵۹ء کی چھپی ہوئی ایک اردوے معلّٰی کا پتا

لگا ہے۔ یہ ہاتھ آ گئی تو اِس کا حال آپ کو لکھوں گا اور اردوے معلّی کے اصل مواد کے متعلّق بھی تحقیقات کروں گا لیکن یہ جملہ امور دہلی جانے پر موقوف ہیں۔

انتخاب کا مقابلہ میں نے جن چار اڈیشنوں سے کیا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں: (۱) مطبوعۂ کلکتہ لوہے کا چھاپہ، ۱۸۸۳ء۔ (۲) مطبوعہ لکھنؤ (۳) الٰہ آباد اور (۴) لاہور۔ نامطبوعہ خط غالباً وہی ہے جس کی آپ نے نشان دہی فرمائی ہے۔ مجھے جو کچھ یاد ہے وہ یہ ہے کہ نامطبوعہ خط ماقبلِ آخر یا اُس سے قبل کا خط ہے۔ دیباچے، خاتمے اور نقل و حکایت کے سوا باقی تقاریظ و رقعات مطبوعہ ہیں۔ انتخاب کے پہلے ورق کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اُڑا ہوا ہے۔ میرے پاس بھی اسی حالت میں پہنچا تھا۔

قاطع القاطع کی قیمت بھی صہ ہے۔ قاطع برہان اور اس کی قیمت میں سے آپ کا جو مزاج چاہے، وہ کم کر دیجیے۔ مالک نے کمی کو منظور کر لیا تو آپ کو مطّلع کر دوں گا۔ انتخاب خطوطِ نامطبوعہ اور نامۂ غالب کی قیمت میں نے دریافت کی تھی۔ یہ جواب آیا کہ اِن کی قیمت ہی کیا۔ اس کا دار و مدار خریدار کی ضرورت اور ذوق پر ہے۔ گویا قیمت مجھے پھر نہ معلوم ہو سکی۔ میری رائے میں آپ اپنے اندازے سے اُن سب کی ایسی قیمت مقرر فرما کر بھیج دیجیے جس میں آپ کو نقصان کا اندیشہ نہ ہو، اُس کے بعد دیکھا جائے گا۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بہ عافیت ہوگا۔

خادم

سیّد سجاد

(۳)

حیدر آباد

۱۴/ اکتوبر ۲۶ء

مخدومی و شفیقی زاد لطفہٗ آداب عرض

تین چار روز ہوئے آپ کا تفصیلی عنایت نامہ اور کل ایک کارڈ صادر ہوا۔ آپ کا شکر گزار ہوں کہ کتابوں کے خدمت میں نہ پہنچنے کو آپ نے شکایت کا موجب قرار نہ دیا۔ جن کتابوں کے دوہرے دوہرے نسخے ہاتھ آئیں[9] اُنھیں آپ کی خدمت میں ضرور پیش کروں گا اور آیندہ قیامِ دہلی میں آپ کی ضرورت کی تمام چیزیں تلاش کروں گا۔

اردوے معلی مطبوعہ ۱۸۵۹ء کا نسخہ دہلی کے قریب سے ایک صاحب کے پاس حیدرآباد میں پہنچا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہنوز میں نے اُس کو نہیں دیکھا۔ یہ ظاہر ہے کہ اِس میں رقعات کی تعداد کم ہوگی۔ بہر حال جب میں اُسے دیکھ لوں گا تو پورا حال آپ کی خدمتِ گرامی میں پہنچا دوں گا۔ کلکتہ ۱۸۸۳ء کا نسخہ جو ہمارے کتب خانے میں موجود ہے، وہ آپ ہی کے زمانے کا ہے۔ لکھنؤ کی اڈیشن بہت پرانی ہے، اِسے نول کشور نے چھاپا ہے۔ اِس میں رقعات کے دونوں حصّے ہیں لیکن اِس کا کاغذ ناقص، لکھائی چھپائی بُری اور کتابت کی غلطیاں بے شمار۔ لاہور کی اڈیشن حال کی ہے۔ لوہاری دروازہ مبارک علی کتب فروش نے چھاپی ہے۔ یہ بھی دونوں حصّوں پر مشتمل ہے اور لکھنؤ کی اڈیشن سے بدرجہا بہتر ہے۔

''دلہائے'' میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ مجھے یقین نہیں کہ مولوی عمّو جان نے DELHI کو اردو میں اِس طرح لکھا ہو یا اِس کا ترجمہ کیا ہو۔ یہ چھچھوراپن ہے اور مولوی عمّو جان کی طبیعت اور وضع داری کے منافی ہے۔ اُن کا مطبع، جہاں تک مجھے یاد ہے، محلّہ رودگران میں واقع تھا۔ یہ محلّہ نہایت وسیع ہے۔ اُس میں ایک جگہ مدرسہ کہلاتا ہے۔ مولوی صاحب کا مکان اور اُن کی اور جائداد خود اُس میں اور اُس کے قریب کی تھی (کذا)۔ گرد و پیش کی گلیوں میں ایک گلی میر مداری ہے، ایک احاطہ ججّن صاحب، ایک محلّے کا کنواں زیادہ مشہور ہیں۔ رودگران کا بہت بڑا حصہ میری والدہ کی ننھیال کی ملکیت تھا۔ میں اُس کے

ایک ایک گھر سے واقف ہوں، لیکن یہاں ''دلہائے'' نام کا کوئی مقام نہیں۔ عکس سے غالباً آپ کی مراد فوٹو گراف ہے، لیکن یہ عکس عجیب قسم کا ہے کہ اِس میں مولوی صاحب کے نام کا جزو ''عمّو'' (جیسا کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے ''امّو'' اترا ہے۔ بہرکیف اگر آپ چیستانِ ''دلہائے'' کو حل فرمانے کی سخت ضرورت تصوّر فرمائیں تو مجھے اطّلاع دیجیے، میں مولوی صاحب مرحوم کے صاحب زادے یا ایک اور معتبر شخص ڈاکٹر رام سنگھ کے لڑکے حکیم فضل معین سے دریافت کر کے صحیح حال خدمتِ گرامی میں حاضر کر دوں گا۔

قاطع القاطع کے پہنچنے کا علم ہوا۔ مجھے اس امر سے بے حد خوشی ہے کہ اِس قسم کا مواد آپ کے جیسے ہاتھوں میں محفوظ ہو گیا۔ خطوں اور کتابوں کی جو مجموعی قیمت آپ نے تجویز فرمائی ہے وہ میرے نزدیک مطلق درست ہے۔ میں اِس باب میں مشورہ دینا عبث سمجھتا ہوں۔ آپ دونوں میں سے چھوٹے میزان کی رقم میرے پاس بھیج دیجیے۔ میں اِسے مالک کے پاس منی آرڈر کر دوں گا۔ کوئی بات نکلی تو میں خود ہی اِس کو طے کر دوں گا۔ اور اگر کوئی خاص اور نہایت ضروری اعتراض پیدا کیا گیا تو آپ کی خدمت میں اطّلاع بھیج دوں گا۔ بالفعل آپ اِس مواد کا معاملہ طے سمجھیے اور جس طرح سے مزاج چاہے، اُس سے کام لیجیے، تامّل مطلق نہ فرمایئے۔ حضرت مالک کو جب میں آپ کی رقم بھیجوں گا تو یہ لکھوں گا کہ فلاں فلاں چیزیں میں نے فروخت کر دیں اور اُن کی یہ رقم ملی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُس صورت میں اگر اُن کے دل میں رقم کے متعلّق کوئی اختلاف وارد ہوگا، تو یہ سمجھ کر کہ اب تو سودا ہو چکا ہے، وہ اِسے زبان تک نہ لائیں گے۔ یہ خدانخواستہ اُن کو دھوکا دینا نہ ہوگا، بل کہ اُن کی نیت کو ڈانوا ڈول ہونے سے بچانا ہوگا۔

ہاں وہ تیسرا خط جس کا میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا، ابھی تک مجھے وصول نہیں ہوا، حالاں کہ اُس کے مالک نے مجھے اُس کی نسبت دو خط لکھے تھے اور بھیجنے کا حتمی وعدہ کیا تھا۔ آپ جو رقم ارسال فرمائیں، اُس میں سے اُس کی

قیمت وضع فرمالیں۔ مجھے امید ہے کہ دو ایک ہفتے میں اِس کے بہم پہنچنے کا انتظام کرلوں گا انشاءاللہ۔

میری طبیعت بہ فضلہ اب درست ہے۔ میں گذشتہ دو سال سے علیل چلا آتا ہوں۔ پچھلے برس ایک انتڑی کے زخم میں بمبئی جا کر آپریشن بھی کرایا اور اس کی سخت تکلیفیں جھیلیں، مگر اب کچھ روز سے میں نے معالجے کا غیر معمولی انتظام کیا ہے۔ خدا سے اُمید ہے کہ جناب والا کا مزاج گرامی بہ خیریت ہوگا۔

خادم سیّد سجاد

(۴)

کنگ کوٹھی روڈ، حیدرآباد

۱۸/نومبر ۲۶ء

مخدومی و مکرّمی زاد عنایتہ۔

گرامی نامے اور پوسٹ کارڈ کے جواب میں مَیں نے ایک عریضہ آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اس بات کو شاید کئی ہفتے گزر چکے ہیں لیکن آپ کا خیریت نامہ موصول نہیں ہوا۔ اُمید ہے کہ مزاج بہ عافیت ہوگا۔

انتخاب رقعات واشعارِ مرزا غالب، جس کا مسوّدہ آپ کی خدمتِ عالی میں بھیج چکا ہوں، اُس کے متعلّق ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہے اور اُس کی اطّلاع مجھے کل ہی ملی ہے۔ یہ مسوّدہ میرے پاس دو ڈھائی سال سے تھا۔ گذشتہ سال مولوی عبدالرّزاق صاحب مددگار صدر محاسب، جنھوں نے اقبال کے کلام پر ایک مبسوط مقدّمہ لکھا ہے اور پورا کلام کلّیاتِ اقبال کے نام سے شائع کیا ہے، میرے پاس تشریف لائے اور اپنے ایک پرچے کے لیے، جس کی عنانِ ادارت اُسی زمانے میں ان کے سپرد ہوئی تھی، مضمون مانگا۔ میں اُن ایّام میں حیدرآباد کے باہر جا رہا تھا، عجلت میں مضمون تو کیا لکھ سکتا تھا، میں نے یہ مسوّدہ اُن کے حوالے کیا اور کہا یہ نایاب چیز ہے، آپ اسے دیکھ کر، اِس پر ایک نوٹ مرتّب

فرما لیجیے۔ وہ اِسے لے گئے اور بجائے نوٹ ترتیب دینے کے مسوّدے کی پوری نقل لے لی اور بغیر میری اجازت کے اپنے پرچے میں، جو کل ہی شائع ہوا ہے، اِسے نقل کر دیا۔ اور نہ صرف اِسی مہربانی پر قناعت کی، بل کہ اِس کے سو نسخے علاحدہ چھپوا کر اُسے دکن کی ایک انجمن اربابِ ادب کے سلسلے میں داخل کر دیا۔

اِس کے شائع ہونے کا تو مجھے رنج نہیں ہے، لیکن اشاعت نے جو صورت اختیار کی، وہ قابلِ افسوس ہے۔ بہرحال وہ مسوّدہ اب آپ کے لیے بے کار ہوگیا، آپ اِسے اپنے مجموعے میں شامل نہ فرمائیں اور عنایت فرما کر اِسے واپسی فرما دیں۔ نیز خط وغیرہ کی قیمت میں سے اِس کی قیمت وضع فرما دیں۔

اُمید ہے کہ آپ کا مزاج بہ خیریت ہوگا۔ والسلام

خادم

سیّد سجاد

(۵)

حیدرآباد، یکم دسمبر [۱۰]

مخدومی و مکرّمی زادہ لطفہ   آداب عرض

گرامی نامہ صادر ہوا۔ میں نے مبارک سے اُسی وقت کہا ہے کہ عبدالرّزاق صاحب کے پاس سے انتخاب کا ایک نسخہ خرید کر لے آئیں۔ اُمید ہے کہ یہ آج یا کل تک لے آئیں گے۔ آ جائے گا تو خدمت میں بھیج دوں گا۔ اصل مسوّدے کو بالفعل تو آپ اپنے پاس رہنے دیجیے۔ بعد میں اگر اُس کی ضرورت نہ ہوئی تو مستقل طور پر آپ اُسے اپنے ہی پاس رکھیے گا۔ اِس وقت تو مجھے اِس کے متعلّق ایک خفیف سی پریشانی یہ ہے کہ عبدالرّزاق صاحب نے نہ اُس کے چھاپنے کی اجازت لی اور نہ اُس کے دام ادا کیے اور اِسے اپنی انجمن کے سلسلۂ مطبوعات میں داخل کر لیا ہے اور مسوّدہ ہے ایک بڑے جھگڑالو حضرت کا۔ اُن کو معلوم ہوا مسوّدہ اِس طرح سے چھاپ لیا گیا ہے اور اِس کے بعد

اُنھیں درم نہ پہنچیں تو ممکن ہے کہ وہ کچھ سر اٹھائیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ عبدالرزاق صاحب اُس کی کچھ قیمت ادا کر دیں۔ اگر وہ وصول ہو گئی تو پھر مسوّدہ آپ اپنے ہی پاس رکھیے گا، مجھے اُس میں خوشی ہوگی۔

میں نے اُس کے متعلق عبدالرزاق صاحب کو ایک نوٹ دیا تھا۔ اُنھوں نے اُسے بھی اپنے نام سے چھاپ ڈالا۔ اور جب مجھ سے ملے تو یہ فرمایا کہ میں نے ایسا ایسا کیا ہے۔ چاہے اسے سرقہ سمجھیے یا کچھ اور۔ مجھے اِس امر کا تھوڑا سا قلق رہے گا کہ ایک چیز جو میں نے خدمتِ عالی میں بھیجی تھی، وہ میری ہی غفلت سے ناقص ہو کر رہ گئی۔

معلوم نہیں آپ کی یونی ورسٹی میں ممتحنین کا تقرر کس زمانے میں ہوتا ہے۔ اگر نامناسب نہ ہو تو میں ممتحن ہونے کے لیے درخواست بھیج دوں۔ میں دو سال سے ایم.اے میں بھی کام کر رہا ہوں بل کہ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد ایم.اے میں ہسٹری آف پرشین لٹریچر کا شعبہ بھی میرے سپرد کر دیا گیا تھا۔ جب سے ڈاکٹر نظام الدین آئے ہیں، وہ اِس کام کو انجام دے رہے ہیں۔

کیا مثنوی گلشنِ عشق شیخ نصرتی (۱۰۶۸ ہجری، بیجاپور) کا کوئی نسخہ آپ کے پاس موجود ہے؟ نہ ہو تو اطّلاع بخشیے۔ اُمید ہے کہ آپ کا مزاجِ گرامی بہ خیریت ہوگا۔

خادم سیّد سجاد

(۶)

کنگ کوٹھی روڈ، حیدرآباد

۲۹ر جنوری ۱۱

مخدومی و مکرّمی زادلطفہ۔ آپ کے دو عنایت نامے اور پندرہ روپے کا منی آرڈر وصول ہوا۔ خدمت میں شکریہ لیکن براہِ کرم انتخاب کا معاملہ طے شدہ تصوّر نہ فرمایئے۔ عبدالرزّاق صاحب کے پاس سے مجھے ہنوز کچھ نہیں وصول

ہوا۔ دو ایک بار آدمی بھی بھیجا تھا مگر اُنھوں نے یہ کہلوا دیا کہ میں خود آ کر ملوں گا اور اِس کا جواب دوں گا۔

گلشنِ عشق کی بابت آپ نے جو سطر ایک لفافے کی پشت پر تحریر فرمائی تھی، اُس کا ضروری حصّہ ڈاک خانے کی مہر میں آ گیا اور باوجود کوشش کے مجھ سے پڑھا نہ گیا۔ اگر اُس میں کوئی بات ضروری اور جواب طلب تھی، تو عنایت فرما کر پھر لکھ دیجیے۔ خدمتِ عالی میں جواب بھیج دوں گا۔

آپ کی تقریر بمبئی کا نہایت مختصر بل کہ ادھورا سدھورا اقتباس بمبئی کے اخبار انڈین ڈیلی میل میں آیا تھا۔ میں نے صرف اُسی کو دیکھا ہے۔ اگر آپ کا لکچر طبع ہوا ہو یا اُس کی کوئی فالتو کاپی آپ کے پاس موجود ہو تو عنایت فرما کر اُسے میرے پاس بھیج دیجیے اور اگر آپ کی مرسلہ کاپی فالتو نہ ہوئی تو دیکھنے کے بعد میں اسے آپ کے پاس واپس بھیج دوں گا۔

امید ہے کہ آپ کا مزاجِ گرامی بہ خیریت ہوگا۔

خادم

سیّد سجاد

حواشی:

۱۔ مرتّبہ راقم الحروف، ناشر: مکتبہ جامعہ نئی دہلی، سالِ طبع: ۱۹۹۴ء۔ یہ کتاب اِس سے پہلے تین بار چھپ چکی ہے۔ دو بار انتخابِ غالب کے نام سے اور ایک بار انتخابِ رقعات واشعارِ غالب کے نام سے۔ انشاے غالب کے پیش لفظ میں اِن اشاعتوں سے متعلّق ضروری تفصیلات لکھی گئی ہیں۔

۲۔ اِس وجہِ ترتیب سے متعلّق میں اپنی رائے اِس تحریر کے آخر میں پیش کروں گا۔

۳۔ میرے سامنے اصل خط کی نقل ہے جو ڈاکٹر صدّیقی کے صاحب زادے مسلم صدّیقی صاحب کے قلم سے ہے۔ خط طویل ہے، مگر اُس کا بیش تر حصّہ دوسرے معاملات سے متعلّق ہے۔ میں نے ضروری عبارت نقل کی ہے۔ یہ مکمّل خط رسالۂ نقوش (لاہور) کے خطوط نمبر کی تیسری جلد میں ۱۹۶۸ء میں چھپ چکا ہے۔ مطبوعہ خط اور اِس کی محوّلۂ بالا نقل کے متن کا جب میں نے مقابلہ کیا تو

دونوں میں کچھ فرق نہیں پایا۔ اِسی خطوط نمبر کی تیسری جلد میں صدّیقی صاحب کا ایک اور خط بھی چھپا ہے جو عرشی صاحب کے نام ہے، مورخہ ۸ر ستمبر ۱۹۴۳ء۔ یوں تو اُس مکتوب (بہ نامِ عرشی صاحب) میں بھی ''انتخابِ غالب'' کا ذکر آیا ہے، مگر اُس میں ایسی کوئی بات نہیں جو اِس بحث میں ہمارے کام کی ہو۔ اِس لیے میں نے اِس مکتوب بہ نامِ مالک رام صاحب کو اِس لحاظ سے پہلا خط کہا ہے۔

۴ مالک رام صاحب کی کتاب ذکرِ غالب کے چوتھے اڈیشن (مکتبہ جامعہ، ۱۹۶۴ء) میں تصنیفاتِ غالب کے تحت صرف یہ عبارت ملتی ہے: ''غالب نے جو نسخہ مولوی ضیاء الدین خاں کے لیے لکھوایا اور اُنھیں دیا تھا، یہ اُن کے کتاب خانے سے دست یاب ہوا اور کسی طرح عارضی طور پر جناب محمد عبدالرّزاق صاحب کے ہاتھ آ گیا، اُنھوں نے اُسے مرتّب کر کے ...شائع کر دیا''۔ (ص ۲۱۸)۔

۵ یہ مجموعہ شائع ہوا ہے ۱۹۹۴ء میں، لیکن مالک رام صاحب کے مقدّمے کے آخر میں ''۲۱ر ستمبر ۱۹۷۲ء'' لکھا ہوا ہے یعنی یہ مقدّمہ اُنھوں نے ۱۹۷۲ء میں لکھا تھا۔

۶ تذکرۂ معاصرین حصّۂ دوم کے مقدّمے میں اُنھوں نے لکھا ہے: ''میرے نزدیک ہر جگہ حوالہ دینے کی ضرورت نہیں۔ جو اصحاب اِس کے خلاف رائے رکھتے ہیں، میں اُن پر بھی اعتراض نہیں کر سکتا۔ وہ اُن کا طریقۂ کار ہے اور یہ میرا''۔ اِس سے پہلے تذکرۂ معاصرین حصّۂ اوّل پر میرا تبصرہ شائع ہو چکا تھا اور بہ ظاہر یہ بات اُسی سلسلے میں لکھی گئی ہے۔

۷ اِس طریقۂ کار سے آج کل بھی کام لیا جاتا ہے۔ ایک خاص حصّے کو کسی رسالے کے آخر میں شامل کیا گیا اور اُس حصّے کی الگ سے بھی کچھ زائد کاپیاں چھپوالی گئیں۔ یوں رسالہ بھی رہا اور ایک مستقل کتاب بھی سامنے آ گئی۔

۸ بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے بعد لفظِ ''پاس'' لکھنے سے رہ گیا ہے۔

۹ بہ ظاہر ''آئیں گے'' ہونا چاہیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''گے'' لکھنے سے رہ گیا ہے۔

۱۰ اِس خط میں سنہ موجود نہیں۔ اس کی پیشانی پر ''(۱۹۲۶ء)'' لکھا ہوا ہے اور یہ غالباً ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی کے قلم سے ہے۔

۱۱ سنہ مذکور نہیں۔ اوپر بائیں طرف ''(جنوری ۱۹۲۷ء)'' مرقوم ہے۔ یہ غالباً ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی کے قلم سے ہے۔

(شش ماہی ''غالب نامہ'' جنوری ۱۹۹۶ء، جلد: ۱۷، شمارہ: ۱، ص ۵۷ تا ۸۸)

ooo

غالبؔ اور صفیرؔ بلگرامی

مصنف: مشفق خواجہ

ناشر: عصری مطبوعات کراچی

صفحات: ۲۰۳۔ قیمت: ۳۵ روپے۔ سال اشاعت: ۱۹۸۱ء

تذکرۂ جلوۂ خضر اور رسالۂ تذکیر و تانیث موسوم بہ رشحاتِ سفیر کے مصنف سفیر بلگرامی اپنے زمانے کی مشہور شخصیتوں میں سے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے، اُردو میں سحر لکھنوی (تلمیذِ ناسخ) کے شاگرد تھے، مرثیے میں دبیرؔ کو اپنا اُستاد بتاتے ہیں، اور فارسی میں غابؔ کی شاگردی کے معترف تھے؛ اِس کے باجود شاعری کی حیثیت سے آج اُن کو بہت کم لوگ جانتے ہوں گے۔ وہ صاحب عالم مارہروی کے نواسے تھے اور اِس نسبت سے غالبؔ اُن کا خیال کرتے تھے۔ صاحب عالم مارہروی سے غالبؔ کے مراسم کا احوال اہلِ علم کو معلوم ہے۔ مشفق خواجہ صاحب نے بہت محنت اور تلاش و تحقیق سے اس کتاب میں صفیر اور غالبؔ سے متعلق تفصیلات کو یک جا کر دیا ہے۔ اُنھوں نے دیباچۂ کتاب میں لکھا ہے:

''میں نے یہ کوشش کی ہے کہ غالبؔ و صفیرؔ کے تعلقات کی تمام تفصیلات پیش کی جائیں۔ تمام متعلقہ تحریروں کو یک جا کیا جائے۔ نیز صفیرؔ نے غالبؔ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اُس کی نشان دہی کی جائے۔ اس سلسلے میں متعدد قلمی اور نادر مطبوعہ کتابوں سے استفادہ کر کے، بہت سا ایسا مواد جمع کیا ہے جو پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آرہا ہے۔ اِس کتاب میں غالبؔ و صفیرؔ کے بارے میں بہت سی نئی باتیں ملیں گی۔ مکاتیبِ غالبؔ بہ نامِ صفیرؔ اور مکاتیبِ صفیرؔ بہ نامِ غالبؔ مکمل اور

صحیح صورت میں پہلی مرتبہ پیش کیے جا رہے ہیں۔''

اس اقتباس سے کتاب کے مندرجات کا اور اُس کی اہمیت کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مشفق خواجہ صاحب کی یہ خوبی اور خصوصیت ہے کہ وہ محنت، لگن اور احساسِ ذمّے داری کے ساتھ کام کیا کرتے ہیں اور یہ کتاب بھی اِس خوبی کی آئینہ دار ہے۔ شروع میں صفیرؔ کے حالاتِ زندگی اور اُن کی تصانیف پر اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ ضروری تفصیلات کو یک جا کر دیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اس ضمن میں ضروری مآخذ اور مصادر سے کما حقہٗ استفادہ کیا جائے۔ اس کے بعد اس کتاب کے دائرے میں صفیرؔ اور غالبؔ سے متعلق ضروری معلومات کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ کار آمد تفصیلات سامنے آ جاتی ہے۔ اختصار اور جامعیت اس کتاب کا خاص وصف ہے۔ فضولیات اور زوائد سے قطعِ نظر کرنا اور ضروری اجزا کو احتیاط اور سلیقے کے ساتھ ترتیب دینا آسان کام نہیں۔

اِس کتاب میں ایک یہ بات ضرور کھٹکتی ہے کہ مشفق خواجہ صاحب نے اپنی روش کے برخلاف تنقیح اور تنقید سے کم کام لیا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ صفیرؔ کے متعدد بیانات کی اصل حیثیت سامنے نہیں آ پاتی۔ اگر کہیں تجزیے سے کام لیا بھی ہے تو اس قدر بالواسطہ اور ہلکے پھلکے انداز سے کہ بات واضح نہیں ہوتی۔ صفیرؔ معتبر راوی نہیں تھے،اس بات سے خواجہ صاحب بھی واقف ہیں، مبالغہ اور رنگ آمیزی صفیرؔ کی تحریر کا نمایاں وصف ہے اور اِن اوصاف نے صفیرؔ کے بیانات کو جگہ جگہ صحت سے دور اور کم اعتباری سے قریب کر دیا ہے۔ یہ انداز اُن کے تذکرے جلوۂ خضر میں حاوی رجحان کی حیثیت سے نمایاں نظر آتا ہے۔ اِس کتاب میں غالبؔ سے متعلق صفیرؔ کی جو تحریریں پیش کی گئی ہیں، اُن میں بھی اِس کی جلوہ گری ہے۔ یہ ضروری تھا کہ وضاحت اور صراحت کے ساتھ ایسے سارے مقامات کی نشان دہی کی جاتی۔ اِس کے بغیر صحیح صورتِ حال سامنے نہیں آ سکتی۔ میں یہاں پر ایک مثال سے اپنے مفہوم کی وضاحت کرنا چاہوں گا، ص ۱۲۴ پر جلوۂ خضر سے صفیرؔ کی ایک عبارت نقل کی گئی ہے:

> ''واضح ہو کہ حضرت غالبؔ کے کلام میں ایک تو محاوراتِ دہلی بہ سبب بندش و ترکیبِ فارسی کے بہت کم ہیں، اور اگر ہیں بھی تو وہ خود ان کو نا پسند کرتے تھے، چناں چہ اکبر آباد کے مطبعِ اموجان میں جو ان کا دیوان چھپا ہے، اس کے خاتمے میں اس کی معذرت انھوں نے چھپوادی ہے۔''

اس عبارت سے پہلے ص ۱۲۳ پر اسی سلسلے میں جلوۂ خضر کی یہ عبارت بھی نقل کی گئی ہے:

> ''.....اگر چہ حضرت غالبؔ نے اکبرآباد کے مطبع اموجان (کذا) میں اپنے دیوان کے خاتمے پر ایک معذرت چھپوا بھی دی ہے کہ میرے کلام میں جو الفاظ اور محاورے ناقص بندھ گئے ہیں، میں کیا کروں، دہلی کی زبان ہی ایسی ہے۔ میں بھی ان کو ناپسند کرتا ہوں۔''

کس قدر گُم راہ کُن ہے یہ تحریر! صفیر کو یہ بھی معلوم کہ ''مطبعِ اموجان'' تھا کہاں۔ دہلی میں یا اکبرآباد میں۔ خط کشیدہ جملوں کو دیکھیے، غالبؔ کا ایسا بیان کہیں نہیں پایا جاتا۔ اب تو یہ مانا جائے کہ صفیرؔ نے مذکورہ نسخۂ دیوان کو دیکھا ہی نہیں تھا، یوں ہی بے پر کی اُڑا دی ہے، یا پھر یہ مان لیا جائے کہ اُن کی مبالغہ پسند اور سخن آفریں طبیعت نے بات کو کچھ بنا دیا ہے۔

یہ بات پیشِ نظر رہے کہ مبالغہ پسندی اور سخن سازی صفیر کا عام انداز تھا اور اُن کی تحریروں میں اِس کی مثالیں بکھری ہوئی ہیں۔ مثلاً اِسی کتاب میں جلوۂ خضر کی ایک عبارت نقل کی گئی ہے جس میں صفیرؔ نے صاحب عالم مارہروی کا حال لکھتے ہوئے لکھا ہے:

> ''حضرتِ غالبؔ علیہ الرحمۃ کو ان کے ساتھ ارادتِ خاص تھی۔ پنچ آہنگ اور اُردوئے معلی اور عودِ ہندی میں ان کے نام کے مکتوب اور رقعا بہت ہیں۔'' (ص ۱۲۳)

مشفق خواجہ صاحب نے اِس کے حاشیے میں خود ہی لکھا ہے کہ: ''پنچ آہنگ میں صاحب عالم کے نام کا کوئی خط شامل نہیں''۔ صفیرؔ نے غالبؔ سے اپنی ملاقات کے ذیل میں غالبؔ کی خوراک کا حال بھی لکھا ہے، لکھتے ہیں کہ ''الغرض گیارہ بجے دن کو آپ کا کھانا ایک سینی میں آیا.... پہلے وہ دونوں لقمے نوشِ جاں فرمائے، اس کے بعد آدھا پیالہ شوربا اور آدھا پیالہ گھی کا پی گئے۔ البتہ آدھا سیر گھی سے کم نہ ہوگا۔'' یہ غالبؔ کی آخری عمر کی غذا تھی! مرنے سے تین سال پہلے کی، جب ضعیفی نے نکما کر دیا تھا اور اِس عمر میں اور اِس حال میں وہ آدھ سیر گھی پی جاتے تھے! بہ قولِ غالبؔ: خامہ انگشت بہ دنداں کہ اِسے کیا لکھیے! مولانا حالیؔ نے یادگارِ غالب میں مرزا کی خوراک کی جو تفصیل لکھی ہے، اُسے دیکھا جائے تو حقیقت اور مبالغے کے فرق کا اندازہ ہوگا۔ صفیرؔ کے اِن غیر معتبر بیانات پر قاضی عبدالودود صاحب تبصرہ کر چکے ہیں۔ مشفق خواجہ صاحب نے اُس کا حوالہ دیا ہے، لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ اِس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ: ''بیس برس بعد

جب وہ (صفیرؔ) غالبؔ کی باتوں کو تحریر کرنے بیٹھے تو ممکن ہے کہ ان کے حافظے نے اصل واقعات میں کچھ رنگ آمیزی کر دی ہو'' (ص ۱۰۹) مشفق خواجہ صاحب سے اِس حُسنِ زن اور خوش عقیدگی کی توقع نہیں تھی! صفیرؔ کی تحریروں کو اگر نظر میں رکھا جائے تو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ ایسی ''رنگ آمیزی'' اُن کا خاص انداز ہے۔ اِس کو اُن کے مزاج کا تقاضا اور طبیعت کا جوہر سمجھنا چاہیے۔

ایک اور مثال: مشفق خواجہ صاحب نے تصنیف طبقاتِ کرامِ ساداتِ بلگرام سے ایک عبارت نقل کی ہے، جس میں صفیرؔ نے غالبؔ سے ملاقات کا حال لکھا ہے، صفیرؔ نے لکھا ہے کہ ''۱۲۸۲ھ میں... حضرتِ غالبؔ کی ملاقات کے لیے دہلی روانہ ہوا۔ حضرت نانا صاحب نے تھوڑے آم اپنے باغ کے ہدیتہً حضرت غالبؔ کے لیے ساتھ کر دیے'' (ص ۱۱۰) اس پر مشفق خواجہ صاحب نے حاشیہ لکھا ہے کہ: ''جلوۂ خضر میں لکھا ہے کہ آم دو ہزار کی تعداد میں تھے (جلد اوّل ص ۲۲۲)''۔ وہ ''تھوڑے سے آم'' جلوۂ خضر میں ''دو ہزار'' اُسی طرح بن گئے ہیں جس طرح غالبؔ کی خوراک کے ذیل میں ایک پیالے کا تھوڑا سا گھی ''آدھ سیر'' بن گیا تھا۔

غرض کہ صفیرؔ بہ حیثیتِ راوی غیر معتبر تھے۔ رنگ آمیزی، مبالغہ آرائی اور سخن آفرینی اُن کے مزاج کی اور اُن کی تحریروں کی عام خصوصیات ہیں اور اِن وجوہ سے اُن کی روایتیں خاص طور پر تحقیق اور تنقیح کے بغیر قابلِ قبول نہیں۔ مشفق خواجہ صاحب نے یہ بڑا کام کیا ہے کہ صفیرؔ اور غالبؔ کے سلسلے کی تفصیلات کو یک جا کر دیا ہے، یہ معلوماتی اور کارآمد کتاب ہے۔ اُنھوں نے واقعتاً محنت کی ہے اور کوشش کی ہے کہ ساری ضروری باتیں ایک سلسلے میں منسلک ہو کر سامنے آ جائیں اور وہ اپنی اِس کوشش میں کامیاب رہے ہیں؛ البتہ تحقیق کے طلبہ کو صفیرؔ کے بیانات سے استفادہ کرتے وقت بطورِ راوی صفیرؔ کی کم زور حیثیت کو ضرور پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ صفیرؔ کی یہ حیثیت زیرِ تبصرہ کتاب سے صحیح طور پر سامنے نہیں آتی۔

(غالب نامہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، جلد ۴، شمارہ۔۱، جنوری ۱۹۸۸ء، ص ۲۳۷ تا ۲۴۱)

ooo

تحقیقِ غالب

مصنف: ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

ناشر: اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی

صفحات: ۲۸۸، قیمت: ۳۶ روپے، سال اشاعت: ۱۹۸۱ء

غالبؔ سے متعلق یہ مصنف کے دس مضامین کا مجموعہ ہے۔ مضامین کی تفصیل یہ ہے: (۱) خطوطِ غالب کے ادوار (۲) غالبؔ کا شعری رویہ ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں (۳) گُل رعنا، نسخہ غالبؔ بہ خطوطِ غالب (۴) گُل رعنا مطبوعہ لاہور کی حقیقت (۵) گُل رعنا نسخۂ مالک رام کا زمانہ کتابت (۶) غالبؔ کے بعد اُن پر پہلا مضمون (۷) غالبؔ اور مجروحؔ کی مکاتبت (۸) قطعۂ غالب بہ سلسلۂ قضیۂ برہان (۹) عودِ ہندی، غالبؔ کے خطوط کا پہلا مجموعہ (۱۰) غالبؔ کی معدوم تصانیف۔

غور و فکر کے ساتھ لکھے گئے یہ مضامین صحیح معنی میں اس کے مستحق ہیں کہ علمی سنجیدگی کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا جائے۔ اِس مجموعے کے کئی مضامین معلومات میں اضافہ کرتے ہیں اور علمی بحث کا موضوع بن سکتے ہیں۔ پہلا مضمون 'خطوط غالبؔ کے ادوار' ہے، اس میں مصنف نے لکھا ہے کہ میں خطوط غالبؔ کو "دو الگ الگ ادوار میں تقسیم کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ میرے نزدیک حدِ فاصل وسطِ نومبر ۱۸۵۸ء ہے"۔ اور پھر اس سلسلے میں آخرِ مضمون میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ: "بیان کی جو بے تکلفی خطوط غالبؔ کی سب سے بڑی اور بنیادی خوبی مانی گئی ہے، دوسرے دور کے خطوط اِس خوبی سے کس قدر خالی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ دوسرے دور کے بالکل اوائل میں، جب تازہ بہ تازہ یہ بات غالبؔ کے احاطۂ شعور میں آتی تھی کہ اُن کے خط چھپیں گے بھی۔ اُنھوں نے بہ طریقِ انشا پردازی عبارت آرائی کی ہے، آرایشِ گفتار سے کام لیا ہے اور اپنی تحریر کو

طرح طرح کے شاعرانہ وسیلوں سے سجایا اور سنوارا ہے''۔

اس سے پہلے وہ یہ لکھ چکے ہیں کہ:''غالبؔ کے دست یاب اُردو خطوں میں قدیم ترین خط ۱۸۴۶ء کا ہے....اُردو میں خطوط نویسی کا آغاز ہی اُنھوں نے پچاس برس کی پختہ کار عمر میں کیا بلوغتِ فکر کی یہ وہ منزل تھی جس کے بعد کسی واضح ارتقائی تبدیلی کی گنجایش محال تھی۔یہ وہ زمانہ تھا جب طرز بیدلؔ میں ریختہ لکھنا چھوڑ کر غالبؔ اپنے رنگِ خاص کے مالک بن چکے تھے۔''

اس مجموعے کا دوسرا مضمون ہے''غالب کا شعری رویہ ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں۔''یہ مضمون فکر انگیز ہے۔مصنف نے لکھا ہے:

> ''۱۸۵۷ء کا واقعہ ہماری تہذیبی زندگی اور سیاسی زندگی کا بہت سخت واقعہ سہی،لیکن ہمارے ادبی اور تہذیبی افق کا یہ المیہ بھی بجائے خود کچھ کم تلخ حقیقت نہیں کہ مرزا غالبؔ جیسے....شاعر نے یہ سب کچھ دیکھا،لیکن یہ سب کچھ اُن کا شعری تجربہ نہیں بن پایا.....اُردو نظم میں غالبؔ کے ہاں واقعہ ستاون سے متعلق محض ایک نو شعری قطعہ ملتا ہے۔یہ ۱۸۵۸ء کے ایک خط بہ نام علائیؔ میں محفوظ ہے....۱۸۵۷ء کے بعد غالبؔ کا اُردو دیوان ان کی زندگی میں متعدد بار شائع ہوا،لیکن اِس قطعے کو دیوان کی کسی اشاعت میں جگہ نہیں ملی۔
>
> .....غالبؔ کے جن اشعار کو ہنگامۂ ستاون کے بعد سے آخر عمر ۱۸۶۹ء تک کے درمیان کا قرار دے سکتے ہیں،اُس کی تفصیل یہ ہے :سات غزلیں،گیارہ قطعات،چار قصائد،تین رباعیات،ایک مرثیے کے تین بند،تین شعر مثنوی کی صنف سے اور کچھ مفرد اشعار۔
>
> .....اس کے برعکس نثر نگار غالبؔ کا ظہور انقلابِ ستاون کے بعد ...اس عقب میں یہ کہنا بے جا نہیں کہ انقلابِ ۱۸۵۷ء نے ہم سے شاعر غالبؔ چھین لیا،جب کہ نثر نگار غالب کا ظہور اِس انقلاب کے بعد ہوا اور اُن کا کل سرمایۂ نثرِ اُردو کسی نہ کسی سطح پر اس انقلاب ہی کی دین اور عطا ہے۔''

تحقیق کے نقطۂ نظر سے اِس مجموعے کا اہم مضمون ''گُل رعنا مطبوعۂ لاہور'' ہے۔اِس مضمون

میں مصنف نے غالبؔ کے معروف انتخاب گُل رعنا کے اُس نسخے پر تبصرہ کیا ہے جسے سیدوزیرالحسن عابدی نے مرتب کیا ہے اور جو لاہور سے شائع ہوا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ:

> ''واقعہ یہ ہے کہ عابدی صاحب نے مالک رام کے مضامین اور دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی کے حواشی اور تعلیقات کی مدد سے گل رعنا کا متن تعمیر کیا ہے۔ اُن کا یہ ادّعا کہ اُنھوں نے گُل رعنا کے نسخۂ غالب بہ خطِ غالب (نسخۂ خواجہ محمد حسن) کو بہ امعانِ نظر دیکھا ہے، کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔''

مضمون نگار نے اس سلسلے میں مفصل بحث کی ہے اور مختلف شواہد پیش کیے ہیں۔ میرے سامنے وہ سب نسخے نہیں جن کا اِس مضمون میں حوالہ دیا گیا ہے، اس لیے میں کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا، البتہ اِس بحث سے یہ ایک بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ایسے نسخوں کو جب مرتب کیا جائے اور شائع کیا جائے تو اصل نسخے کا عکس بھی لازماً شامل کیا جائے، تاکہ شبہات اور بے ایمانی دونوں کے لیے کم سے کم گنجایش باقی رہ سکے۔ تدوین اور تحقیق کے طالب علموں کے لیے اِس مضمون کا مطالعہ واقعتاً مفید ثابت ہوگا۔ اِس مضمون کی طرح اِس کتاب کا ایک اور مضمون ''گُل رعنا نسخۂ مالک رام کا زمانۂ کتابت'' بھی خاص اہمیت رکھتا ہے، جس میں مقالہ نگار نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ: ''نسخۂ غالب بہ خطِ غالبؔ مرقومۂ غرۂ ربیع الاوّل ۱۲۴۴ھ اور نسخۂ مالک رام کے سرسری تقابلی مطالعے سے، بالخصوص خاتمۂ گُلِ رعنا کے واضح عبارتی فرق کی بنا پر بالیقین یہ کہا جاسکتا ہے کہ نسخۂ مالک رام، غالبؔ کے خطی نسخے کی نقل نہیں ہے۔''

مقالہ نگار نے تفصیل کے ساتھ سارے امور پر بحث کی ہے۔ تدوین کا کام کرنے والوں کے لیے اِس مقالے کا مطالعہ افادیت سے خالی نہیں ہوگا۔ اِس مجموعے کے دیگر مضامین بھی کام کے ہیں، اگر چہ اہمیت کے لحاظ سے وہ شروعِ کتاب کے پانچ مضامین کے برابر نہیں۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن متعدد کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں۔ اُن کی ایک کتاب ''غالب اور انقلاب ستاون'' اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اپنے موضوع پر یہ جامع کتاب ہے۔ وہ دل لگا کر کام کرنے کے خوگر ہیں اور سستی شہرت کے شیدائی نہیں معلوم ہوتے۔ تحقیق جس ضبط اور تامل کا مطالبہ کرتی ہے، وہ اُس سے نا آشنا نظر نہیں آتے اور استخراجِ نتائج کے لیے جن شرائط کی پابندی ضروری ہے، وہ اُن کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ صفات کم یاب ہیں۔

بے جا نہ ہوگا اگر فاضل مصنف کی توجہ بعض باتوں کی طرف مبذول کرائی جائے۔بعض مقامات پر طوالت بے جا کا احساس ہوتا ہے،مثلاً ''گلِ رعنا مطبوعۂ لاہور'' والا مقالہ اپنی اہمیت اور افادیت کے باوجود طوالت بے جا سے بھی گراں بار نظر آتا ہے۔اِسے بہ آسانی کچھ مختصر کیا جا سکتا تھا۔جوشِ تردید میں غیر ضروری اجزا نے اپنی جگہ بنالی ہےاوراس سے ارتکاز بھی کچھ کم ہوگیا ہے۔مصنف نے ''تحقیق کے دبستان لاہور'' کا بھی ذکر کیا ہے۔تحقیق کوایسے فرضی دائروں کا قیدی بنانا نا مناسب ہے بل کہ ناجائز۔ص۱۶۰ کے حاشیے پر تذکرۂ عمدہ منتخبہ کا سالِ آغاز وانجام جولکھا گیا ہے،وہ نظر ثانی کا محتاج ہے۔قاضی عبدالودود صاحب اپنے تبصرے میں اِس پر بحث کر چکے ہیں (یہ تبصرہ اُن کے مجموعۂ مضامین اشتر وسوزن میں شامل ہے)۔ص۱۴۱ پر گلِ رعنا کے سلسلے میں لکھا گیا ہے کہ اِسے غالبؔ نے ''غرۂ ربیع الاول ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۱رستمبر ۱۸۲۸ءکو....مرتب کیا تھا'' اگر یہ کہا جائے کہ اِس اندازِ نگارش سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس انتخاب کا کام ایک دن میں مکمل ہوگیا تھا،تو بے جا نہ ہو ہوگا؛لیکن مجھے یقین ہے کہ مصنف بھی اس سے متفق نہیں ہوں گے۔یہ محض غیر محتاط اندازِ بیان کا کرشمہ ہے۔

ص ۲۶۹ پر صفیرؔ بلگرامی کی روایت سے غالبؔ سے ایک رسالہ منسوب کیا گیا ہے جس میں ''اُردو زبان کے ظہور کا حال'' لکھا گیا تھا۔اس رسالے کے وجود پر شبہہ ظاہر کیا جا چکا ہے،مصنف نے اس شبہے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:''اور بلا دلیل شبہہ ایک معاصر شہادت کی موجودگی میں تکلفِ محض ہے'' مصنف شاید اس بات سے واقف نہیں کہ اس ''معاصر شہادت'' کی حیثیت کیا ہےاور نہ اُن کو یہ معلوم ہے کہ صفیرؔ بلگرامی (جو اس کے راوی ہیں) غیر معتبر راوی تھے۔مشفق خواجہ صاحب نے اپنی کتاب غالب اور صفیر بلگرامی میں اس پر بحث کی ہے۔اُسے دیکھا جا سکتا ہے۔یہ رسالہ بھی،غالبؔ کے استاد دہر مزدثم عبدالصمد کی طرح وجود حقیقی سے محروم ہے۔عبدالصمد کا وجود غالبؔ کا زائدۂ فکر تھا اور یہ رسالہ صفیرؔ کی سخن آفرینی اور عبارت آرائی کا تراشیدہ ہے۔

ص۱۹۹ پر غالبؔ کا ایک خط (بہ نام مجروحؔ) درج کیا ہے۔اُس میں ایک جملہ یوں درج متن کیا گیا ہے:''نہ دل میں مہر و آرزو،نہ آنکھ میں حیا و شرم۔''اور حاشیے پر اختلافِ نسخ کے ذیل میں ''مہر و آزرم'' درج کیا گیا ہے۔مصنف اگر ذرا تامّل سے کام لیتے تو اُن کو محسوس ہوتا کہ یہاں صحیح لفظ ''آزرم'' ہی ہے۔''آرزو'' کا محل ہی نہیں،نہ بہ لحاظِ معانی اور نہ بہ لحاظ حُسنِ عبارت۔اس خط کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''اور میاں سیّد زادۂ آزادہ، دلّی کے عاشقِ دلدادہ، ڈھے ہوئے اُردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے، نہ دل میں مہر و آزرم، نہ آنکھ میں حیاوشرم۔''

عبارت کے ٹکڑوں میں جو قافیے کی پابندی ہے، اگر وہی پیشِ نظر ہوتو تب بھی ''آزرم'' مرجح قرار پائے گا۔ ''آرزو'' کو رسالۂ الناظر'' کے کاتب کی تحریف سمجھنا چاہیے (جہاں یہ خط شائع ہوئے تھے اور جہاں سے مصنف نے اُن کو نقل کیا ہے)۔ پھر ''آزرم'' کے معنی پر بھی غور کرنا تھا۔ ''آزرم'' کے متعدد معانی ہیں، جن میں سے ''انصاف، عدل، جانب حق نگاہداشتن'' بھی ہیں (مدار الافاضل) اور یہی معنی یہاں مراد ہیں۔ یہاں ''آرزو'' قطعاً بے محل ہے۔

غالبؔ اور صفیرؔ بلگرامیؔ کی طرح یہ کتاب بھی غالبیات کے ذخیرے میں اچھے اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ غالبؔ سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ان دونوں کتابوں کا مطالعہ مفید اور معلومات افزا ثابت ہوگا۔

(غالب نامہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، جلد۹، شمارہ۔۱، جنوری ۱۹۸۸ء، ص۲۴۱ تا ۲۴۵)

ooo

حیاتِ غالبؔ کا ایک باب

مصنف: ڈاکٹر حسن اختر

ناشر: مکتبۂ عالیہ، ایبک روڈ، لاہور

صفحات: ۱۳۶، قیمت: پینتیس (۳۵) روپے۔

پاکستان کے معروف اہلِ قلم ڈاکٹر ملک حسن اختر نے اِس مختصر سی کتاب میں غالبؔ کے مقدمۂ پنشن سے متعلق بعض اہم چیزوں کو پیش کیا ہے۔ مصنف نے مقدمۂ کتاب میں لکھا ہے:

"مرزا غالب کی پنشن کے بارے میں مجھے بعض دستاویزات پنجاب آرکائیوز میں دست یاب ہوئے۔ میں نے اُن دستاویزات کی عکسی نقول حاصل کر لیں۔ اِن دستاویزات کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ یہ غالب کی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں اہم مآخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔ میں نے اِن کی روشنی میں حیاتِ غالب پر لکھی ہوئی کتب کا مطالعہ کیا تو اُن میں جابجا اصلاح کی گنجایش نظر آئی۔ چناں چہ میں نے حیاتِ غالبؔ کے اس حصے پر ایک طویل مضمون قلم بند کرنے کا فیصلہ کیا، جواب اِس کتاب کی صورت میں آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ جو دستاویزات مجھے ملیں، اُن کے عکس بھی شامل کیے جا رہے ہیں۔...اصل میں دہلی رزیڈینسی کے بعض کاغذات پنجاب میں منتقل کر دیے تھے۔ غالبؔ کی دو عرضیوں پر خود اُن کے دستخط اور مُہر موجود ہے چناں چہ یہ اصل ہوں گی اور دہلی میں اُن کی نقل رہی ہوگی۔....پنشن کے سلسلے میں مرزا غالبؔ کی بیگم اور ان کی سالی کی درخواست کے بارے میں ایک سرکاری دستاویز بھی شائع کی جا رہی ہے۔"

غالبؔ کی پنشن کے سلسلے میں جو بحثیں ہیں، اُن میں اِس کتاب کے مندرجات سے کچھ نہ کچھ مدد ضرور

ملے گی۔ڈاکٹر حسن اختر نے یہ بہت اچھا کیا کہ دستاویزوں کے عکس کتاب میں شامل کر دیے ہیں۔اِس طرح غالبؔ شناس حضرات اِن پر صحیح طور پر گفتگو کر سکتے ہیں۔

اِس کتاب سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں،مثلاً''نواب شمس الدین احمد خاں...کی والدہ نے ایک عرضی اُردو زبان میں انگریز حکام کو دی،جس میں اپنی کس مپرسی کا ذکر بڑے دل دوز انداز میں کیا ہے....ہم اُس درخواست کو یہاں نقل کرتے ہیں اور اُس کا عکس بھی شاملِ اشاعت کر رہے ہیں''(ص۴۹)۔''اسی طرح نواب شمس الدین احمد خاں کے ملازمین سے بھی وعدے کیے گئے مگر اُنھیں بھی کچھ نہ ملا۔اُن کے ملازمین میں سے کچھ نے ایک درخواست اُردو میں لکھ کر گورنر کو پیش کی۔یہ درخواست بھی ہمیں ملی ہے اور اسے ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔یہ درخواست ۵/نومبر ۱۸۳۷ء کو دی گئی''(ص۵۲)۔

مرزا غالبؔ نے مقدمۂ پنشن کے سلسلے میں ۲۳/مارچ ۱۸۳۶ء کو ایک درخواست گورنر جنرل کو دی تھی،اُس کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے:

> ''یہ درخواست انگریزی زبان میں ہے اور پہلی بار منظرِ عام پر آرہی ہے....اس پر مرزا غالب کی مُہر اور دستخط ہیں۔یہ درخواست دو حصوں میں ہے۔پانچ پیرے پہلے لکھے ہیں اور غالبؔ نے دستخط کر دیے ہیں۔چھٹے پیراگراف میں مقامی حکام پر عدمِ اعتماد کا اظہار کیا ہے...اس پر اپنے دستخط کر دیے اور مُہر لگا دی''(ص۵۶)۔

چوں کہ یہاں کتاب کا صرف تعارف مقصود ہے،اِس لیے ان دستاویزوں سے متعلق دیگر مباحث سے قطعِ نظر کی جاتی ہے،مگر اِس میں ذرا بھی شک نہیں کہ مرزا غالب کے مقدمۂ پنشن کے سلسلے میں اِس کتاب کے مندرجات فکر انگیز ثابت ہوں گے۔ڈاکٹر حسن اختر بہت انہماک اور سچی لگن کے ساتھ علمی کام کرتے رہتے ہیں۔اُن کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔اِس زمانے میں جب کہ دنیا کے مطالبات ہمارے اکثر لکھنے پڑھنے والوں کے ذہن پر چھائے رہتے ہیں،حسن اختر صاحب جیسے لوگوں کا وجودِ غنیمت ہے۔توقع کی جاتی ہے کہ مطالعۂ غالبیات کے سلسلے میں اس مختصر کتاب کو ایک اہم کتاب کی حیثیت سے دیکھا جائے گا۔

(غالب نامہ،غالب انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی،جنوری ۱۹۸۸ء،جلد۔۹،شمارہ۔۱،صفحہ ۲۵۳ تا ۲۵۴)

ooo

غالب اور انقلابِ ستّاون
(پیش لفظ)

پاکستان کے اہلِ قلم میں ڈاکٹر معین الرحمٰن متعارف شخصیت کے مالک ہیں۔اُن کی کتاب غالب اور انقلابِ ستاون دو بار شائع ہوکر اہلِ نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔اِس کتاب میں معین الرحمٰن صاحب نے یہ بڑا کام کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے متعلق غالب کی تحریریوں کے ضروری اجزا کو یک جا کر دیا ہے اور اِس طرح اس واقعے سے متعلق غالبؔ کے طرزِ عمل اور اندازِ فکر کے مختلف گوشے نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ بلا تکلف یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اپنے انداز کی یہ منفرد کتاب ہے۔ اس کتاب میں مرزا صاحب کی معروف فارسی تصنیف دستنبو کا اُردو ترجمہ بھی شامل کیا گیا تھا بل کہ صحیح طور پر یوں کہیے کہ دستنبو کے مطالب و مقاصد کو واضح کرنے کے لیے ہی معین صاحب نے اس کتاب کو مرتب کیا تھا۔(دستنبو کا فارسی متن اس کتاب میں شامل نہیں کیا گیا تھا)۔

اِس کتاب کے مشمولات کی افادیت کے پیش نظر غالب انسٹی ٹیوٹ کی پبلی کیشن کمیٹی نے یہ طے کیا تھا کہ اِس کتاب کو انسٹی ٹیوٹ کے سلسلۂ مطبوعات کے تحت شائع کیا جائے۔ مجھے مسرت ہے کہ میری درخواست پر مصنف نے بہ خوشی اس کی اجازت دے دی اور کتاب میں بعض ضروری ترمیمیں بھی کر دیں۔

انسٹی ٹیوٹ کے مقاصد میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مرزا صاحب کی جملہ تصانیف کو ضروری اہتمام کے ساتھ ازسرِ نو شائع کیا جائے۔اُن کی فارسی تصنیف دستنبو بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے، یوں یہ بھی مناسب خیال کیا گیا کہ اِس نئی اشاعت میں دستنبو کا فارسی متن بھی شامل کر دیا جائے۔اس سلسلے میں شروع میں ایک یہ مشکل سامنے آئی کہ دستنبو کی پہلی اشاعت کے جو دو تین نسخے میرے علم میں یہاں ہیں، اُن کا حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔حُسنِ اتفاق سے رسالۂ نقوش کے اڈیٹر محمد طفیل مرحوم کی برسی کے سلسلے

میں میرا لاہور جانا ہوا اور وہاں پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں دستنبو کی اشاعتِ اوّل کا نسخہ محفوظ تھا۔ معین صاحب کی مدد سے اُس کا عکس حاصل کیا گیا اور اس طرح یہ مشکل حل ہوگئی اور اب یہ کتاب دستنبو کے فارسی کے متن کے اضافے کے ساتھ شائع ہو رہی ہے۔

یہاں دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ دستنبو کی اشاعتِ اوّل کا متن شائع کیا جا رہا ہے، جب کہ مرزا صاحب کی زندگی میں یہ کتاب اُس کے بعد بھی شائع ہوئی تھی اور بعض ترمیموں کے ساتھ (اِس سلسلے کی تفصیلات معین صاحب لکھ چکے ہیں) اگر اصولِ تدوین پر نظر رکھی جائے تو مصنف کی زندگی میں شائع شدہ آخری اڈیشن کو شائع کیا جانا چاہیے تھا؛ مگر یہاں دانستہ اس اصول سے انحراف کیا گیا ہے اور اِس انحراف کو ضروری سمجھا گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اصل مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں مرزا صاحب نے جب پہلی بار اِس کتاب کو لکھا تھا، تو اس کو اپنی پنشن وغیرہ کے سلسلے میں سفارشی دستاویز کے طور پر کس طرح تیار کیا تھا (اسے انگریزوں کے سامنے پیش کیا جانا تھا) اِس لحاظ سے اِس کی وہی صورت شکل سامنے آنا چاہیے جو پہلی بار تھی۔ بعد کو اگر کوئی ترمیم کی گئی، تو اُس کی بجائے خود جو بھی اہمیت ہو، لیکن اس مقصد کے لحاظ سے اُس کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے۔ چوں کہ معین صاحب نے دستنبو کی مختلف اشاعتوں کا احوال تفصیل سے بیان کر دیا ہے، اِس لیے آخری نسخے کی تفصیلات بھی سامنے آجاتی ہیں اور یوں کسی طرح کی کمی نہیں رہتی۔ اگر آخری اشاعت کے متن کا عکس اِس کتاب میں شامل کیا جاتا، تو خواہ اُصولِ تدوین کے لحاظ سے یہ بات درست ہوتی، مگر اصل واقعے کی مکمل وضاحت کے اعتبار سے یہی طریقۂ کار نادرست قرار پاتا۔

اشاعتِ اوّل کے متن کو عکسی صورت میں شاملِ کتاب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس طرح (الف) کتاب کی پہلی شکل صورت سامنے آجائے گی، یعنی جس طرح مرزا صاحب نے پہلی بار اُسے شائع کیا تھا۔ (ب) اغلاطِ کتابت کا اضافہ نہیں ہوگا جس کا امکان دوبارہ کتابت کرانے کی صورت میں ہمیشہ رہا کرتا ہے۔

دوسری وضاحت طلب بات ''بالمکند برہمن'' کا نام ہے۔ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں دستنبو کی اشاعتِ اوّل کا جو نسخہ محفوظ ہے اُس کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اُس کے آخر میں غالبؔ کے قلم سے یہ عبارت لکھی ہوئی ہے: ''نور چشم بالمکند برہمن این رسالہ را بہر وفع چشم زخم دہر تعویذ بازو

سازند۔'' اِس تحریر کے نیچے غالبؔ کے دستخط تو موجود نہیں، مگر اُن کی مُہر موجود ہے۔ (اِس لحاظ سے دستنبو کا یہ نادر نسخہ ہے)۔ مرزا صاحب نے دستنبو کے آخر میں جہاں اُن ہندو احباب اور شاگردوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے پریشانی کے اُن دنوں میں مختلف اعتبارات سے اُن کی خبر گیری کی اور غم گسار رہے، اور اِس سلسلے میں مہیس داس کا نام لیا ہے (جنھوں نے مرزا صاحب کے لیے دیسی شراب فراہم کی تھی) اور ہیرا سنگھ کا ذکر کیا (جو اُن بے کسی کے دنوں میں برابر اُن کے پاس آتے رہتے تھے، وہیں شیو جی رام برہمن'' اور اُن کے لڑکے بالمکند کا بھی ذکر کیا ہے:

> ''دیگر از مردمِ ایں شہر نیم ویران نیم آباد شیو جی رام برہمن برہمانژاد کہ جوانِ خرد مند و مرا بجامی فرزنداست، ایں درویشِ دل ریش را کمتر تنہا می گزاردو بہ اندازۂ تاب وتوانِ خویش فرمانبری وکارسازی بجا ہمی آردو پسرش بالمکند کہ نوجوانِ نیک خوئی پارساست، نیز ہمچول پدرِ خویش درفرمان پزیری چُست دوراندوہ گُساری یکتاست۔'' (دستنبو، طبعِ اوّل، ص ۷۱)

یہ وضاحت یوں بھی ضروری تھی کہ بالمکند نام کے مرزا صاحب کے ایک شاگرد بھی تھے جن کا تخلص بےصبرؔ تھا جو سکندر آباد (ضلع بلند شہر) کے رہنے والے تھے، مگر وہ کایستھ تھے۔ بہ ظاہر یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ یہ ''بالمکند برہمن'' شاعر نہیں تھے، صرف معتقد اور نیاز مند تھے۔ ''شیو جی برہمن'' سے غالب کے مراسم کا احوال کیا تھا، اِس کے متعلق مجھے کچھ بھی معلوم نہیں، غالب نے جس طرح اُن کا ذکر کیا ہے، اُس سے بہ ظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا صاحب اُن کو بہت عزیز رکھتے تھے اور غالباً اسی نسبت سے اُن کا لڑکا بالمکند بھی مرزا صاحب کے نیاز مندوں میں شامل تھا۔ انھوں نے دستنبو کا ایک نسخہ اپنی تحریر اور مُہر کے ساتھ بالمکند کو دیا، تو اس سے واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس خاندان سے مرزا صاحب کے خصوصی مراسم تھے اور بالمکند کو وہ بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

اس تحریر میں مرزا صاحب نے یہ جو لکھا کہ: ''ایں رسالہ را برای دفعِ چشم زخمِ دہر تعویذ بازو سازند'' اس میں ''دہر'' کی تخصیص گہری معنویت سے خالی نہیں۔ مطلب مرزا صاحب کا یہی ہے کہ یہ رسالہ اس زمانے میں انگریزی حکومت کے جبر وستم سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ معین صاحب نے دستنبو کی غایتِ تصنیف کے ذیل میں جو بحث کی ہے اور جس میں یہ ثابت کیا ہے کہ مرزا صاحب نے اِس کتاب کو

روزنامچے کے طور پر نہیں لکھا تھا (جیسا کہ وہ دعوا کرتے رہے) بل کہ اُنھوں نے اِسے انگریزوں کو اپنی بے گناہی اور وفاداری کا یقین دلانے کے لیے اور اپنے خطاب، خلعت، فیشن اور اعزاز کو واگزار کرانے کے لیے باقاعدہ تصنیف کیا تھا، اُس بحث کی روشنی میں اس مختصر سی عبارت کو دیکھا جائے تو ''چشم زخمِ دہر'' کی تخصیص کی معنویت روشن ہوگی۔

مجھے توقع ہے کہ یہ کتاب مختلف اعتبارات سے غالب فہمی کی روایت کی توسیع میں معاون ثابت ہوگی۔

۲۱ دسمبر ۱۹۸۷ء　　　　رشید حسن خاں

(غالب اور انقلابِ ستاون، ڈاکٹر معین الرحمٰن، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء، ص۳ تا ۶)

ooo

انشاے غالب

(عرضِ مرتب)

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (ولادت: ۲۶ دسمبر ۱۸۸۵ء، وفات: ۲۸ جولائی ۱۹۷۲ء) اُن اہلِ علم میں سے تھے جو ستایش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ اُن کی علمی فضیلت کا کچھ اندازہ اِس سے کیا جا سکتا ہے کہ قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی جیسے اکابر احترام کے ساتھ اُن کا نام لیا کرتے تھے اور علمی مسائل میں اُن کی راے کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اُنھوں نے نمود و نمایش سے دور رہ کر ساری عمر لکھنے پڑھنے میں گزار دی۔

مقالاتِ صدیقی (جلد اوّل) کے آغاز میں اُس کے مرتب اور مرحوم کے فرزند جناب مسلم صدیقی نے مرحوم کے ''مختصر سوانح'' لکھے ہیں اور تذکرۂ معاصرین کی دوسری جلد میں مالک رام صاحب نے کچھ حالات درج کیے ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ صدیقی صاحب نے علی گڑھ میں ایم اے عربی میں داخلہ لیا تھا۔ اُس زمانے میں یہاں ''مشہور جرمن مستشرق پروفیسر جوزف ہورووٹز عربی پڑھاتے تھے۔ صدیقی صاحب اپنی قابلیت اور عربی سے فطری مناسبت کے باعث جلد ہی اُستاد کے چہیتے بن گئے۔ ۱۹۱۲ء میں ایم اے اِس امتیاز کے ساتھ پاس کیا کہ اُنھیں یورپ میں عربی کی اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے حکومتِ ہند کی طرف سے وظیفہ ملا۔'' وہ جرمنی گئے، جہاں، اُنھوں نے سٹراس برگ اور گیوٹنگن کی یونی ورسٹیوں میں مشہورِ زمانہ مستشرقین نولدیک، تھُمب، لِٹ من اور اندریاس کی نگرانی اور رہ نمائی میں عربی کی تعلیم پائی۔'' ساتھ پروفیسر لتمان سے سُریانی اور تُرکی، پروفیسر رالف سے عبرانی، پروفیسر تھمب سے قدیم فارسی پڑھی۔ پروفیسر مورس باخ سے انگریزی صوتیات، پروفیسر اولڈن برگ سے سنسکرت

صرف ونحواورڈاکٹرہا کین سےفنونِ لطیفہ کی تاریخ کادرس لیا۔۱۹۱۶ء میں لاتینی زبان کاامتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۷ء میں پی ایچ ڈی کے امتحان میں اعلااعزاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی ۔اُن کے تحقیقی مقالے کا عنوان تھا:''قدیم عربی میں فارسی کے دخیل الفاظ''۔یہ مقالہ انھوں نے جرمن زبان میں لکھا تھااور یہ جرمنی ہی میں شائع ہوا تھا۔۱۹۱۹ء میں وہ ہندوستان واپس آئے۔

ہاں یہ بات تو رہ گئی کہ جب وہ جرمنی میں زیرِ تعلیم تھےتو ۱۹۱۴ء کے آغاز میں پہلی جنگِ عظیم شروع ہوگئی تھی، یوں اُنھیں جرمنی میں رُکنا پڑا۔کسی طرح کی ذہنی اُلجھن یاپریشانی میں پڑے بغیر اُنھوں نےعلمِ زبان اور مختلف زبانوں کے مطالعے کواپنا خاص موضوع بنالیا۔یہ اِسی کا فیض تھا کہ وہ تقریباً تمام سامی زبانوں پر حاوی تھےاور یورپ کی بعض زبانیں بھی جانتے تھے۔''وہ زندگی بھر دوسرے اہلِ قلم کی مدد کرتے رہے۔مالک رام صاحب کے الفاظ میں:

> ''اُن کا علم وفضل اور وسیع مطالعہ ہرایک متلاشیِ علم کی خدمت کے لیے حاضر رہتا۔کوئی صاحب اپنی تصنیف کے لیےکسی قسم کی معلومات طلب کرتے۔وہ گھنٹوں اپنے کتب خانے میں مطالعہ کر کے،موضوع سے متعلق موادجمع کر کےاور اُسے پوری تفصیل اوروضاحت سےقلم بند کر کےسائل کومہیا کردیتے۔کوئی دوسرے بزرگ اپنی تصنیف بھیج کراس کے بارے میں اُن کی رائے معلوم کرنا چاہتے۔وہ کتاب کوغور سے پڑھ کر نہ صرف موضوع ہی سے متعلق ، بلکہ املا،اعراب،کتابت اورصفحوں کے اغلاط تک کی نشان دہی کردیتے۔میں نےبعض اصحاب کے پاس اُن کے۲۰،۲۰اور۲۵صفحات کے بلکہ اِس سےبھی طویل تر خط دیکھے ہیں۔''

اُردو املا اُن کا محبوب موضوع تھا۔اسی کے مباحث کو جس علمی انداز سے انھوں نے لکھا ہے،اُن پراب تک کوئی اہم اضافہ نہیں کیا جاسکا ہے۔مرحوم کےایسے ہی مضامین کو پڑھ کر مجھےاملا کے موضوع پرکام کرنے کا خیال آیا تھا۔ مجھےمرحوم کی خدمت میں نیاز حاصل نہیں تھا،اس کے باوجود میں نےاس خواہش کااظہارکیا۔۱۹۶۰ء کےاواخر کی بات ہے۔مرحوم نے بہت ہمّت بندھائی اورمدد کا وعدہ کیا۔دوتین برس تک میں اُن سےاستفادہ کرتا رہا۔جب بھی کچھ سوالات لکھ کر میں نے بھیجے،مرحوم نے بیماری اورضعیفی کے باوجود مفصل جوابات سے نوازا۔مثلاً ایک خط ۷ مارچ ۱۹۶۱ء کا بریک قلم سے لکھے

ہوئے فل اسکیپ سائز کے چھے صفحوں پر مشتمل ہے۔ اِس خط کا آغاز اِس طرح ہوتا ہے: ''آپ کو بہت انتظار کھینچنا پڑا، جس کا افسوس ہے، لیکن میں مجبور تھا یہ کوشش بھی ضروری تھی کہ بات تشنہ نہ رہے۔'' ایک اور طویل خط کے آخر میں لکھا ہے: ''یہ خط کئی دن ہوئے شروع کیا تھا، آج ختم ہوا'' (۲۸ مئی ۱۹۶۱ء)۔ اِن خطوں کو پڑھ کر صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ تک پہنچا دی جائے اور اس طرح سمجھا سمجھا کر جیسے سامنے بیٹھے ہوئے شاگرد کو سبق پڑھایا جا رہا ہے۔

میں جس زمانے میں اتر پردیش اُردو اکیڈمی کی پبلی کیشن کمیٹی کا ممبر تھا، یہ خیال آیا کہ مرحوم کے مقالات کو کتابی صورت میں چھپنا چاہیے۔ میری پیہم درخواستوں اور بے حد اصرار پر مرحوم کے صاحب زادے مسلم صدیقی صاحب نے کچھ مضامین کو مرتب کر دیا اور یہ پہلی جلد ۱۹۸۳ء میں اکیڈمی کی طرف سے شائع ہوئی۔ اِس جلد میں املا اور تحقیق الفاظ سے متعلق اٹھارہ نہایت درجہ اہم مضامین ہیں۔ دو جلدوں کے بہ قدر مضامین بچ رہے۔ میں نے اپنی سی کوشش بہت کی، لیکن بقیہ مضامین کو مرتب نہیں کرا سکا۔ اِس کا افسوس مجھے ہمیشہ رہے گا۔

غالبؔ سے دل چسپی رکھنے والے متعدد حضرات کے علم میں یہ بات تھی کہ ۱۳۴۵ء میں حیدر آباد سے ''انتخابِ غالب'' کے نام سے مرزا غالبؔ کے کلامِ نثر و نظم پر مشتمل جو مجموعہ چھپا تھا، اس کا اصل خطی نسخہ صدیقی صاحب کے پاس تھا۔ وہ اُسے مرتب کر کے شائع کرنا چاہتے تھے۔ مسلم صدیقی صاحب نے اِس مخطوطے سے متعلق جو کاغذات میرے پاس بھیجے ہیں، اُن میں صدیقی صاحب کے ایک خط کی نقل بھی ہے جو مالک رام صاحب کو لکھا گیا تھا، اُس کی عبارت یہ ہے:

> ''رقعاتِ غالب (انتخاب) میرے پاس بہت مدّت سے ہے۔ جب وہ نسخہ میری ملک میں آ رہا تھا، اُسی دوران ایک صاحب نے اسے مستعار لے کر نقل کر لیا (چھوٹا سا تو رسالہ) اور چھپوا ڈالا۔ جو شخص میرے ہاتھ بیچ رہا تھا، اُس نے مجھے خبر کی۔ میں نے باوجود اِس سانحے کے اُسے لیا۔ بعد کو چھپا ہوا نسخہ دیکھا، غارت کر کے چھاپا تھا۔ پھر ایک شخص نے اُن حضرت کی ''اجازت'' سے لاہور میں چھاپا۔ صورت بہتر لیکن غلط جیسا وہ تھا ویسا یہ۔ اب میں خود چھپوانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ مزاج کیا پوچھتے ہیں آپ، بوڑھا ہوں، بیمار بھی تھوڑا بہت رہ لیتا

ہوں۔پیری وصد عیب۔

والسلام۔نیاز مند:عبدالستار صدیقی

الہ آباد۔۸فروری ۵۴ء''

یہ واقعہ ہے کہ وہ اُسے چھپوانے کی فکر کرتے رہے،لیکن چھپوا نہیں سکے۔دوسروں کی فرمایش وہ جس مستعدی کے ساتھ پوری کرتے تھے،اپنا کام اُس طرح نہیں کر پاتے تھے۔پھر معیار کا جو مثالی تصور اُن کے ذہن میں رہتا تھا اور اِس میں تدوین کے ساتھ ساتھ کتابت،کاغذ اور طباعت کے متعلقات بھی شامل رہتے تھے،یوں اُن کے کام سرانجام کو نہیں پہنچ پاتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ نہ تو وہ کسی متن کی تدوین کو مکمل کر سکے اور نہ کسی موضوع پر کوئی کتاب لکھ سکے۔اُنھوں نے کئی متنوں کو مرتب کرنے کا ڈول ڈالا لیکن اُن میں سے کوئی ایک بھی مکمل نہیں ہو سکا۔

زیرِ گفتگو متن سے متعلق مسلم صدیقی صاحب کے بھیجے ہوئے جو کاغذ میرے پاس ہیں،ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرحوم اِس متن سے غافل کبھی نہیں ہے۔بہت سے پرچوں پر یادداشتیں لکھی ہوئی ہیں۔طباعت کے لیے کاغذ کے نمونے بھی ایک کلپ میں لگے ہوئے ہیں۔اُنھوں نے اپنے قلم سے دوبار اس متن کو مکمل طور پر نقل کیا ہے۔اِس متن سے متعلق جو حواشی لکھے ہیں،ان کی کئی نقلیں ہیں،یعنی اُنھیں کئی بار لکھا گیا ہے۔یہی نہیں،پورے متن کی پیلے کاغذ پر (لیتھو کی چھپائی کے لیے) کتابت کرائی گئی ہے۔کسی دوسرے کاتب سے پھر اس کی کتابت کرائی ہے،مگر اِس بار کی کتابت پہلے وہ اِسے لیتھو میں چھپوانا چاہتے تھے۔مکمل متن کی کتابت مومی کاغذ (بٹر پیپر) پر کرائی گئی ہے،اِس سے معلوم ہوا کہ بعد کو اُن کا ارادہ بدل گیا اور وہ اُسے وِنڈا ٹک سے چھپوانا چاہتے تھے۔غرض کہ اِن سب کاغذوں کا ایک اچھا خاصا بستہ بن گیا ہے۔

میں نے مسلم صاحب کو کئی بار لکھا کہ اب تو اسے چھپوا دیں مگر آہستہ روی میں وہ فرزندِ خلف ہیں۔انھوں نے ضروری خطوں کا جواب دینے میں کئی سال لگا دیے۔بالآخر پچھلے سال اُنھوں نے سارے کاغذوں کا پیکٹ میرے پاس بھیج دیا کہ اب آپ اِسے جس طرح چاہیں چھپوائیں۔اس پیکٹ میں متن کے کتابت شدہ اجزا بھی تھے اور اصل خطی نسخہ بھی۔یہ بھی لکھا کہ چھپائی کے بعد ان کاغذوں کو واپس نہ کریں۔کسی ادارے میں جمع کر دیں۔

میرے پاس جو کاغذ آئے ہیں، اُن میں قابلِ ذکر چیزیں یہ ہیں اصل خطی نسخہ۔ مومی کاغذ پر اِس خطی نسخے کی مکمل کتابت جو اصل نسخے کے بالکل مطابق ہے۔ یعنی اصل خطی نسخے میں جس لفظ کو جس طرح لکھا گیا ہے، اُسے اُسی طرح رکھا گیا ہے۔ جن عبارتوں پر خط کھینچا ہوا ہے، ان کو بھی اُسی طرح رکھا گیا ہے۔ اصل نسخے میں صفحہ جس لفظ پر ختم ہوا ہے، کتابت میں بھی صفحہ اُسی لفظ پر ختم ہوا ہے۔ یعنی صفحہ بہ صفحہ یہ کتابت اصل کے مطابق ہے۔ جو لفظ مخطوطے میں بین السطور لکھے ہوئے ہیں، اُن کی کتابت اُسی طرح کرائی گئی ہے۔ متن کی کتابت خاصی پُرانی ہو چکی ہے لیکن اربابِ مطبع کا خیال ہے کہ چھپائی میں کسی طرح کی خرابی پیدا نہیں ہوگی۔

متن کے ساتھ تین کتابت شدہ اجزا اور ہیں۔ (۱) مرحوم کے لکھے ہوئے حواشی۔ (۲) مالک رام صاحب کا لکھا ہوا مقدمہ اور (۳) اُنھی کے لکھے ہوئے حواشی۔ صدیقی صاحب کے حواشی کی کتابت، متن کی کتابت کی طرح پُرانی نہیں۔ ان تینوں کتابت شدہ اجزا کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کتابت بعد کو کرائی گئی ہے۔ یعنی یہ کتابت مسلم صدیقی صاحب کی نگرانی میں ہوئی ہے۔ اِن سب اجزا کی مومی کاغذ ہی پر کتابت کرائی گئی ہے۔ اِن سب کتابت شدہ اجزا کے اصل مسودے بھی موجود ہیں۔

ان کاغذوں میں مالک رام صاحب کے کئی خط ہیں۔ سب سے پُرانا خط ۱۱/جون ۱۹۷۱ء کا ہے۔ اِس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

> ''۴/جون کے گرامی نامے کا شکریہ قبول فرمایئے۔ قبلہ ڈاکٹر صاحب کے نسیان پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ ہائے ایسا فاضل اور باغ و بہار آدمی اور یوں بیکار ہو کے رہ جائے!...... ''انشائے غالب'' مدّت سے میرے علم میں ہے اور خود اُنھیں نے مجھ سے فرمایا کہ جلد ہی اسے مرتب کر کے شائع کر دوں گا.... میں ضرور اس پر مقدمہ لکھوں گا۔ یہ نہ صرف میرے لیے باعثِ مسرّت ہوگا بل کہ باعثِ فخر بھی، لیکن اِس میں کچھ وقت لگ جائے گا۔''

یہ معلوم ہے کہ آخرِ عمر میں انتقال سے تین چار برس پہلے مرحوم کا ''حافظہ بالکل جواب دے گیا تھا، بل کہ ہوش و حواس بھی متاثر ہو گئے تھے''؛ اُنھی دنوں میں مسلم صدیقی صاحب نے مالک رام صاحب سے مقدمہ لکھنے کی فرمایش کی ہوگی۔ ۱۷/مئی ۱۹۷۲ء کے خط میں مالک رام صاحب نے مطلع کیا ہے کہ

مقدمہ مکمل ہو چکا ہے۔۱۲/اکتوبر ۱۹۷۲ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دو ہفتے ہوئے میں نے ''انشاے غالب'' کا مقدمہ رجسٹری سے بھیجا تھا''۔اس کے بعد یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ حواشی بھی بھیج دیے گئے ہیں۔یعنی مالک رام صاحب کا مقدمہ اور حواشی دونوں اواخرِ ۱۹۷۲ء تک مسلم صدیقی صاحب کے پاس پہنچ چکے تھے (مالک رام صاحب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل خطی نسخے کا عکس اُن کے پاس تھا اور حواشی اُسی کی مدد سے لکھے گئے تھے)۔

ایک ضمنی بات: اِنھی کاغذات کے پکٹ میں ایک خط عتیق صدیقی (مرحوم) کا بھی ہے، بہ نامِ مسلم صدیقی، اس کی عبارت یہ ہے:

''نظام الدین،

نئی دہلی۔۱۳

۱۹/جون ۱۹۶۹ء

نوازش نامہ ملا، شکریہ۔آپ کا خط میں نے جناب عبدالمجید صاحب صدر غالب اکیڈمی کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔طباعت کا معاملہ زیرِ غور ہے۔اوصاف صاحب نے بھی اِس کے بارے میں رپورٹ دے دی ہے۔جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی خدمت میں میرا اسلام عرض کیجیے۔اُمید ہے کہ آپ سب مع الخیر ہوں گے۔نیازمند عتیق صدیقی۔''

صراحت تو نہیں کی گئی، لیکن سارے قرائن اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ اسی انتخابی مجموعے کے چھپنے کی بات ہے۔اِس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۹۶۹ء میں (یعنی غالب صدی کے موقعے پر) اس مجموعے کو غالب اکیڈمی کی طرف سے چھپوانے کی بات بھی ہوئی تھی۔(عتیق صدیقی صاحب اُس زمانے میں غالب اکیڈمی سے متعلق تھے۔

اس مجموعے کا اصل خطی نسخہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے پاس کس طرح پہنچا تھا، اُس کی تفصیل مالک رام صاحب کے مقدمے میں موجود ہے۔یہاں دو باتوں کی وضاحت کرنا ہے۔جیسا کہ معلوم ہے، حیدرآباد کے محمد عبدالرزاق صاحب، مددگار محاسب سرکارِ عالی حکومتِ آصفیہ، نے اُس خطی نسخے کو سب سے پہلے عارضی طور پر لے لیا تھا اور اُس کی نقل تیار کر لی تھی۔اِس طرح اُنھوں نے اُس مجموعے

کوفوری طور پر شائع کر دیا تھا۔ کئی حضرات نے یہ لکھا ہے کہ کتابی صورت میں شائع کرنے سے پہلے، اس مجموعے کو حیدر آباد کے ایک رسالے ''تحفہ'' میں بالاقساط شائع کیا گیا تھا۔ مالک رام صاحب نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ: ''راشد صاحب نے اپنی نقل پہلے تو تین قسطوں میں حیدر آباد کے رسالے تحفہ میں چھپوائی (اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۲۲ء) اُس کے بعد اِس پر ایک مختصر دیباچہ لکھ کر اِسے کتابی شکل میں بعنوان ''انتخاب غالب'' شائع کیا۔''یعنی یہ مجموعہ حیدر آباد میں دو بار چھپا۔ پہلی بار رسالۂ تحفہ کے تین شماروں میں اور اُس کے بعد باقاعدہ کتابی شکل میں۔ اور جب کتابی شکل میں اسے چھاپا، اُس وقت اِس پر ''مختصر دیباچہ'' لکھا۔ مگر ان میں سے کوئی بات صحیح ۔ ہوا یہ ہے کہ لکھنے والوں میں سے کسی نے رسالہ ''تحفہ'' بہ چشم خود نہیں دیکھا تھا، یوں غلط فہمی نے فروغ پایا۔

صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ رسالۂ تحفہ کے ''شوال ذی قعدہ ذی حجہ ۱۳۴۴'' کے مشترکہ شمارے میں یہ متن چھپا تھا۔ اِس رسالے کے سرورق پر تیرہویں سطر میں لکھا ہوا ہے:

''نمبر (۱۰، ۱۱، ۱۲) شوال ذی قعدہ ذی حجہ ۱۳۴۴ جلد (۲)''۔

اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رسالۂ تحفہ کا یہ شمارہ تین مہینے کا مشترک شمارہ تھا۔ اِسی سرورق پر فہرست مضامین ہے، جس کا آخری اندراج یہ ہے: ''انتخاب غالب'' اِس کے آگے صفحہ نمبر لکھا گیا ہے۔ اِس سے پہلے ''حصہ نظم'' کا عنوان ہے، جس کے آگے صفحہ نمبر ''۴۸'' لکھا ہوا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اصل رسالہ تو ص ۴۸ پر ختم ہو جاتا ہے۔ اُس کے بعد نیا سرورق لگایا ہے جس کے مندرجات کی کیفیت یہ ہے:

''سلسلۂ انجمن ارباب اُردو

نمبر (۲)

یعنی

مرزا اسد اللہ خاں دہلوی کے خطوط، لطائف، اشعار اور نقلوں کا ایک مختصر مجموعہ

جس کو اُنھوں نے خود مرتب کیا تھا اور جواب تک طبع نہیں ہوا۔

بہ تحشیہ و مقدمہ

از

محمد عبدالرزاق ایچ۔ سی۔ ایس،

مددگار محاسب سرکارعالی حکومت آصفیہ

۱۳۴۵ھ

مطبوعہ چشتیہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد دکن"

اِس میں کل چوبیس صفحات ہیں۔شروع کے چار صفحے سرورق اور مقدمہٗ مرتب پر مشتمل ہیں۔اُس کے بعد اصل متن کے لیے صفحات کے نئے نمبر شمار ڈالے گئے ہیں۔اِن نمبروں کے حساب سے اصل متن ص۱۹ پر ختم ہو جاتا ہے۔آخری یعنی صفحہ نمبر ۲۰ پر "مطبوعات انجمن ارباب اُردو، سروز نگر" کا اشتہار ہے۔اِس میں "انتخابِ غالب" کا اشتہار بھی شامل ہے، اِس کی قیمت ٦ (چھے آنے) لکھی گئی ہے۔مطلب یہ نکلا کہ رسالہٗ تحفہ کے مشترک شمارہٗ ۱۰، ۱۱، ۱۲ کے آخر میں اِس انتخاب کو ایک الگ مجموعے کی صورت میں الگ سرورق کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔اور پھر اِس حصے کو علاحدہ سے کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔سرورق تو موجود تھا ہی، دیباچہ بھی تھا اور صفحات نمبر بھی اس کے مطابق پڑے ہوئے تھے۔یہ وہی طریقہٗ کار ہے جس سے آج بھی بعض دفعہ کام لیا جاتا ہے۔اب صحیح صورت حال یہ ہوئی کہ یہ مجموعہ رسالہٗ تحفہ کے مشترک شمارہٗ "شوال ذی قعدہ ذالحجہ ۱۳۴۴ھ" کے آخر میں مستقل ضمیمے کے طور پر شائع ہوا تھا اور پھر اُسی کو علاحدہ رسالے کی صورت میں شائع کر دیا گیا۔اِس کے سرورق پر سال طباعت "۱۳۴۵ھ" لکھا گیا اور یہ اِس لحاظ سے درست تھا کہ رسالہ تو ۱۳۴۴ھ کے آخری مہینے "ذی الحجہ" پر بھی مشتمل تھا، یوں ظاہر ہے کہ وہ ۱۳۴۵ھ ہی میں چھپ کر آیا ہوگا۔

رسالہٗ تحفہ کا یہ مشترک شمارہ میرے سامنے اس کے آخر میں "انتخابِ غالب" شامل ہے۔اس میں "انتخابِ غالب" کے صفحات پر عبدالستار صدیقی مرحوم نے بہت سے حواشی لکھے ہیں۔الگ سے جو رسالے کی صورت میں اِسے لایا گیا تھا، اُس کا بھی ایک نسخہ میرے سامنے ہے۔اِن دونوں کے موجود ہونے سے یہ آسانی ہوئی کہ دونوں کا مقابلہ کر کے اطمینان کر لیا گیا کہ یہ وہی صفحات ہیں جو رسالے کے ساتھ شیرازہ بند تھے اور اب مستقل رسالے کی صورت میں سامنے آئے ہیں۔

اب دوسری بات: محمد عبدالرزاق نے "تقریب" کے عنوان سے اِس مجموعے پر جو مقدمہ لکھا ہے، اُس میں لکھا ہے: "اس کو مسودہ دہلی کالج کے پروفیسر ضیاء الدین ایل ڈی کے وسیع کتب خانے سے برآمد ہوا ہے اور اب جناب منشی سید سجاد صاحب ایم۔اے کے قبضے میں ہے۔جناب موصوف عثمانیہ

یونی ورسٹی میں اُردو کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔آپ کو اُردو کے قدیم سرمائے کی حفاظت کا خاص ذوق ہے۔ہم آپ کے نہایت ممنون ہیں کہ آپ نے یہ مجموعہ اشاعت کی غرض سے ہمیں عنایت فرمایا ہے۔''

مالک رام صاحب نے اپنے مقدمے میں اس کی تفصیل لکھی ہے کہ کس طرح ایک صاحب اِس مخطوطے کو لے کر حیدرآباد پہنچے اور وہاں اُنھوں نے اِسے عبدالرزاق صاحب کو دکھایا اور بتایا کہ وہ اسے بیچنا چاہتے ہیں۔راشد صاحب نے راتوں رات اس کی نقل لے کر اُسے واپس کر دیا۔اس کے بعد وہ صاحب اِس مخطوطے کو صدیقی صاحب کے پاس لائے اور صدیقی صاحب نے اسے دس روپے میں خرید لیا۔صدیقی صاحب کا جو خط اوپر نقل کیا گیا ہے،اُس میں بھی اجمالاً اِس کا ذکر آ گیا ہے۔راشد صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ یہ نسخہ اُن کو سجاد صاحب کے ذخیرے میں ملا تھا تو انھوں نے اِسے فروخت کرنے کے لیے ایک صاحب کو کیوں دے دیا جب کہ اُن کو اُردو کے قدیم سرمایے کے تحفظ کا خاص ذوق تھا۔اگر سجاد صاحب نے راشد صاحب کو چھاپنے کے لیے دیا تھا،تو چھپنے کے بعد اصل نسخہ سجاد صاحب کے پاس واپس چلا جانا چاہیے تھا۔غرض کہ راشد صاحب نے جو کچھ لکھا ہے،وہ محض واقعہ تراشی ہے اور اس کی ضرورت ان کو اس لیے پیش آئی کہ وہ اصل واقعے کو ظاہر نہیں کرنا چاہیے تھے کہ ایک صاحب پہلے اُن کے پاس اسے بہ غرضِ فروخت لائے تھے۔اُن سے اطمینان سے دیکھنے کے بہانے لے کر،اس کی نقل تیار کر لی اور پھر یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اس میں کوئی خاص چیز نہیں۔

راشد صاحب کے نسخے سنہ طباعت ۱۳۴۵ھ (۲۷-۱۹۲۶ء) درج ہے۔اس کے بعد اِسی نام سے یہ ''اقبال اکیڈمی،ظفر منزل،تاج پورہ لاہور'' کی طرف شائع ہوا۔اس پر سالِ طباعت درج نہیں،لیکن اقبال اکیڈمی کے سکریٹری ''سید محمد شاہ ایم.اے'' نے اِس پر دو صفحے کا جو پیش لفظ'' ناشرین کی طرف سے کے عنوان سے لکھا ہے،اُس کے آخر میں ''۲۵/دسمبر۴۳ء'' درج ہے۔اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ دسمبر کی آخری تاریخ میں یا پھر۴۴ء کے شروع میں چھپا ہوگا۔سید محمد شاہ کے پیش لفظ سے مترشح ہوتا ہے کہ عبدالرزاق صاحب کی اجازت سے اِسے شائع کیا گیا تھا۔یہ نسخہ بھی میرے سامنے ہے تیسری بار اسے ''انتخابِ رقعات واشعارِ غالب'' نام سے کالی داس گپتا رضا صاحب نے بمبئی سے شائع کیا۔اس پر تاریخِ اشاعت ''۵/فروری۱۹۹۲ء درج ہے۔رضا صاحب نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ صدیقی صاحب نے بمبئی کی ایک فرم ''رائٹرس امپوریم'' سے جو اصل مخطوطے کے عکس بنوائے

تھے۔اُن کے ذہن میں یہی ہوگا کہ اِس مخطوطے کے صفحات کے عکس بھی چھاپ دیے جائیں۔پھر شاید معاملات طے نہ ہو سکے یا کیا ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے مخطوطہ واپس منگا لیا، مگر اس اثنا میں مخطوطے کے نگیٹو بن چکے تھے۔اب ان اخراجات کے ذمے دار کون ہو؟ سید جمیل الدین بغدادی مرحوم نے؛ جو غالب اور غالبیات کے عاشق تھے یہ اخراجات ادا کر نیگیٹو حاصل کر لیے۔اس سے پیش تر جمیل صاحب مخطوطے کی طباعت کے سلسلے میں اس کی ہو بہو نقل اپنے قلم سے تیار کر چکے تھے.....رائٹرز امپوریم....اور مخطوطے سے متعلق تمام کوائف مجھ سے خود جمیل صاحب نے بیان فرمائے تھے۔۱۹۷۳ء میں جب میں نے ۳۵۴ کتابوں اور رسالوں پر مشتمل ذخیرۂ غالبیات جمیل صاحب سے حاصل کر لیا تو اُنھی میں یہ تین نسخے بھی شامل تھے جو اب نذرِ احباب ہیں۔''

رضا صاحب نے اِس مجموعے کا مکمل عکس بھی شامل کر دیا ہے، مگر اکثر صفحات کے عکس ٹھیک نہیں بنے ہیں۔عکس کے ساتھ جمیل صاحب کے ہاتھ کا نقل کیا ہوا متن عکسی صورت میں شامل کر دیا ہے۔محبِ مکرم ڈاکٹر مختار الدین نے میرے نام ایک خط میں لکھا تھا: ''انتخاب غالب کا اصل نسخہ ڈاکٹر صدیقی مرحوم نے مجھے دکھایا تھا۔بمبئی کے ایک کارخانے میں وہ طباعت کا ذکر بھی فرماتے رہے۔یہ کسی وجہ سے ممکن نہ ہو سکا تو خود اُنھوں نے اشاعت کے لیے اِس کی کتابت کرائی۔ایک بار الٰہ آباد گیا تو وہ اجزا اُنھوں نے دکھائے'' اس سے بمبئی میں چھپوانے کے خیال کی تائید ہوتی ہے اور یہ بھی متیقن ہو جاتا ہے کہ بعد کو اصل مخطوطے کی کتابت خود صدیقی صاحب نے کرائی تھی۔

میرے لیے یہ باعثِ افتخار بھی ہے اور سرمایۂ سعادت بھی کہ صدیقی صاحب جس مجموعے کو بہت زیادہ تعلقِ خاطر کے ساتھ طویل مدّت تک چھپوانے کی فکر میں رہے۔میری ناچیز کوشش کے نتیجے میں وہ اب شائع ہو رہا ہے۔صدیقی صاحب کو میں اپنا معنوی اُستاد مانتا ہوں۔میں نے خطوط کے ذریعے سے اور پھر اُن کی تحریروں سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔اِس لحاظ سے یہ میرا فرض تھا کہ میں اس اشاعت کی ذمّے داری قبول کروں۔بڑی ناانصافی ہوگی اگر میں اِس کا اعتراف نہ کروں کہ ترتیب و طباعت کے سلسلے میں ڈاکٹر مختار الدین احمد نے بہت اصرار کیا، کئی خطوں میں اِس کی تاکید کی۔ایک خط میں لکھا ہے: ''بہ ہر حال رقعات و اشعار غالب کا نیا اڈیشن نکلنا چاہیے اور اُسے آپ نکالیں۔اگر ایسا نہ ہوا تو ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مالک رام، دونوں کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔اگر آپ کی توجہ سے یہ

رسالہ شائع ہو گیا، تو چوں کہ میں روح کی بقا کا قائل ہوں، یقین رکھتا ہوں کہ دونوں کی روحیں آپ سے خوش ہوں گی۔''

مالک رام صاحب کا لکھا ہوا مقدمہ اور حواشی ، یہ دونوں تحریریں اب تک کہیں اور نہیں چھپیں۔ یہ اُن تحریروں کو کہیں اور چھپوانا پسند نہیں کیا۔ مخطوطے کا عکس تو اُن کے پاس تھا ہی، وہ اگر چاہتے تو اس مجموعے کو اپنے مقدمے اور حواشی کے ساتھ بہ آسانی چھپو سکتے تھے، لیکن مرحوم نے یہ نہیں کیا اس لحاظ سے بھی ان تحریروں کو اِس متن کے ساتھ محفوظ ہو جانا چاہیے تھا۔ (نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن)۔ صدیقی صاحب مقدمہ تو لکھ نہیں پائے تھے، یوں بھی مالک رام صاحب کے مقدمے کو شامل کرنے کا جواز موجود ہے۔ مسلم صاحب نے مالک رام صاحب سے فرمایش کر کے حواشی لکھوائے تھے، اس لیے صدیقی صاحب کے حواشی کے ہوتے ہوئے بھی اِن کی شمولیت کا جواز نکلتا ہے۔

صدیقی صاحب نے متن کی کتابت اپنی نگرانی میں کرائی تھی اور مالک رام صاحب کے مقدمہ وحواشی کی کتابت مسلم صاحب نے اپنی نگرانی میں کرائی ہے، یوں میں نے اِن تینوں تحریروں کو جوں کا توں رکھا ہے۔ اصولاً بھی یہی ہونا چاہیے تھا۔ یہ چند صفحے عرضِ مرتب کے عنوان سے محض اس لیے لکھے گئے اور اِس مجموعے کے شروع میں شامل کیے گئے ہیں کہ بعض غلط فہمیاں رفع ہو جائیں۔ آخر میں مخطوطے کا عکس بھی شامل کر دیا گیا ہے، اس سے مجموعے کے وقار اور اعتبار میں اضافہ ہو گا۔

اصل مخطوطے میں اُس کا کوئی نام نہیں۔ اور کیوں ہوتا، غالبؔ نے کوئی مستقل کتاب تو مرتب کی نہیں تھی۔ مولوی ضیاء الدین خاں کی فرمایش پر کچھ منتخب اجزا یک جا کر کے دے دیے تھے کہ وہ اُنھیں کام میں لائیں۔ مسلم صاحب نے جو کاغذات بھیجے ہیں، ان میں کئی جگہ اسے ''انشاے غالب'' لکھا گیا ہے اس سے کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ نام صدیقی صاحب مرحوم کا تجویز کیا ہوا ہو گا۔ علاوہ بریں راشد صاحب نے اس کا نام ''انتخابِ غالب'' رکھا اور رضا صاحب نے ''انتخابِ رقعات و اشعارِ غالبؔ''۔ مالک رام صاحب نے بھی اپنے مقدمے میں اِسے ''انشاے غالب'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ میں نے اسی نام کو مرجح خیال کیا ہے، اس لیے اب یہ مجموعہ ''انشاے غالب'' کے نام شائع ہو رہا ہے۔

آج کل ناشرین ایسے مجموعوں کو چھاپنے میں تکلف کرتے ہیں، کیوں کہ خریدار کم سے کم ہوتے ہیں۔ مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں کا میں بہ طورِ خاص ممنون ہوں کہ میری

درخواست پر وہ بلا تکلف اور بہ خوشیِ خاطر اس مجموعے کو شائع کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مومی کاغذ پر کتابت کے چھاپنے کا دہلی میں ویسا انتظام نہیں جیسا کہ الہ آباد میں ہے اور کتابت بھی بہت پُرانی ہو چکی ہے؛ اس کے باوجود شاہد صاحب نے چھاپنے کی ہامی بھر لی۔ اصل مخطوطہ کئی جگہ آب خوردہ ہے اور بعض صفحات دھندلے پڑ چکے ہیں؛ شاہد صاحب نے یقین دلایا ہے کہ اس کی پوری کوشش کی جائے گی کہ ممکن حد تک عکسی صفحات روشنی اور وضاحت سے محروم نہ رہیں۔ توقع کرتا ہوں کہ غالبؔ شناسوں کے حلقے میں اِس مجموعے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

رشید حسن خاں

۱۰/جون ۱۹۹۴ء

(انشائے غالب، رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اشاعتِ اول ۱۹۹۴ء، ص ۵ تا ۲۵)

○○○

اِملاے غالبؔ

(ابتدائیہ)

مرزا غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بہت سی تحریریں موجود ہیں اور اُن کے عکس دست یاب ہیں۔ اُردو اور فارسی، دونوں زبانوں میں جو لفظ املا کے لحاظ سے توجہ طلب ہیں، اُن کو مرزا صاحب نے اِن تحریروں میں اپنے قلم سے جس طرح لکھا ہے؛ ایسے لفظوں کا گوشوارہ مرتب کیا گیا ہے۔ جن لفظوں کے املا سے متعلق اُنھوں نے یہ وضاحت کی ہے کہ اُن کا صحیح املا کیا ہے، ایسے لفظوں کو بھی اِس گوشوارے میں شامل کرلیا گیا ہے۔ ایسے سب لفظوں کو، اِن کے ضروری متعلقات اور مثالوں کے ساتھ حروفِ تہجی کی ترتیب کے ساتھ اِس کتاب کے پہلے حصے میں رکھا گیا ہے۔

دوسرے حصے میں املا سے متعلق مرزا صاحب کی مختلف وضاحتوں کی روشنی میں اور اُن کے حوالوں سے، املا کے اصولوں کو اور قاعدوں کو ترتیب دیا گیا ہے۔ "املاے فارسی" کے عنوان کے تحت فارسی طریقِ املا اور متعلقاتِ املا کو بھی اِسی حصے میں یکجا کیا گیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ مرزا صاحب کے اُردو فارسی کلام کی تدوین میں مرتب، یا مرتبین املا کے جن مسائل و مشکلات سے دو چار ہو سکتے ہیں، اُن کی نشان دہی کی جائے۔ یہ واضح کیا جائے کہ خود مرزا صاحب نے اپنے قلم سے کس لفظ کو کس طرح لکھا ہے، یا کس طرح لکھنے کی ہدایت کی ہے۔ اس طرح کلام غالبؔ میں منشاے مصنف کے خلاف املائی صورتیں جگہ نہ پا سکیں۔ ضمنی طور پر املائی معیار بندی کا فائدہ بھی حاصل ہو کہ اُن کے کلامِ نظم و نثر کے مختلف مجموعوں میں لفظوں کے املا میں دورنگی نمود حاصل نہ کر سکے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک مجموعے میں ایک لفظ کو ایک طرح لکھا جائے اور دوسرے مجموعے میں دوسری طرح۔ (یہ واضح کر دیا جائے کہ اِس قماش کی دورنگیِ املا کی مثالیں

اُن مجموعوں میں بڑی تعداد میں ملتی ہیں جو پچھلے ۳۵،۴۰ سال میں شائع ہوئے ہیں۔)۔

سید انشا اور مرزا غالب، اُردو کے دو ایسے شاعر ہیں جنھوں نے قواعدِ زبان، تلفظ اور املا سے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ دونوں ذہنی طور پر تقلید بیزار تھے، جدّت پسندی اور آزاد خیالی نے طاقت وراعتماد کو اُن کی شخصیت کا جز بنا دیا تھا؛ شاید یہی وجہ تھی کہ دونوں کسی ہچکچاہٹ اور تکلف کے بغیر اپنی بات کہتے تھے اور اپنی رائے پر اصرار بھی کرتے تھے۔ ہاں ان دونوں میں یہ فرق ضرور ہے کہ شاعر کی حیثیت سے اور اُردو کے نثر نگار کی حیثیت سے مرزا صاحب کا مرتبہ بلند تر ہے اور قواعدِ زبان اور زبان شناسی کے لحاظ سے انشا اعلا و افضل ہیں۔

یہ سچ ہے کہ آدمی کتنی ہی ذہنی رفعت اور فنی کمال حاصل کرلے، بشریت پر فتح نہیں پا سکتا۔ وہ غلطیاں بھی کر سکتا ہے اور غلط فیصلے بھی؛ مگر اِن سے اُس کا منفرد طرزِ احساس کم تاب نہیں ہوتا، اُس کی بے مثالیت مجروح نہیں ہوتی اور اُس کی عظمت پر حرف نہیں آتا۔ یہاں چند لمحوں کے لیے رُک کر ہم یہ ضرور سمجھ لیں کہ اختلافِ رائے اور غلطی، یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ ہم غلطی سے اتفاق کرنے پر اپنے آپ کو مجبور نہیں کر سکتے، لیکن اختلاف رائے کو مصنف کا حق ماننے پر ہم سب مجبور ہیں۔ جو اس پر مجبور نہیں، وہ بے انصاف ہوں گے یا کم از نظر۔ ادب میں کٹھ مُلّا ئیت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

مرزا صاحب نے (اور مسائل کے ساتھ ساتھ) املا سے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ خطوں میں اُن کے ایسے اقوال بکھرے ہوئے ہیں۔ اصلاحِ کلام کے ذیل میں املا کی غلطیوں کی طرف بھی شاگردوں کی توجہ مبذول کراتے رہتے تھے اور لفظوں کی جن املائی شکلوں کو وہ درست سمجھتے تھے، اُن کی بھی نشان دہی کرتے رہتے تھے اور بار بار ٹوکتے تھے۔ مثلاً قدر بلگرامی کو ایک خط میں لکھا ہے:

> ''صاحب! تم نے مثنوی خوب لکھی ہے۔ کہیں املا میں، کہیں انشا میں جو اغلاط تھے، دور کیے اور ہر اصلاح کی حقیقت اُس کے تحت میں لکھ دی'' (خطوطِ غالب، مرتبہ مولوی مہیش پرشاد، ص ۱۸۸)''

منشی بہاری لال مشتاق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''میں تم کو جا بہ جا آگاہ کرتا ہوں۔ خدا چاہے تو املا کی غلطی کا ملکہ زائل ہو جائے'' (غالب کے خطوط، ص ۱۰۳۹)

صوفی منیر کے نام خط میں لکھا ہے: ''حکم بجالایا۔ دوایک جگہ املا کی صورت بدل گئی'' (ایضاً، ص ۱۴۴۲)۔ ''فارسی اشعار میں جہاں املا یا انشا میں اختلاف تھا، اُس کو درست کر دیا۔'' (بہ نام مولانا عباس رفعت بھوپالی۔ ایضاً، ص ۱۷۱۳)۔ اِن عبارتوں سے یہ بات بہ خوبی واضح ہو جاتی ہے کہ املا کی صحت کا خیال بہ طورِ خاص اُن کے ذہن میں رہتا تھا۔

مرزا صاحب یہ بات مانتے تھے کہ ''پانو، گانو، چھانو'' صحیح املا ہے اور ''پاؤں'' لکھنے کو غلط مانتے تھے۔ ایک شاگرد کو لکھا ہے:

> ''پانو، قافیہ گانو، چھانو کا ہے۔ آگے اُس کے نون لکھنا غلط ہے، مگر ہاں بہ صیغۂ جمع یوں لکھنا چاہیے: پانوؤں'' (خطوطِ غالب، مقدمہ، ص ح)۔

بیتاب رام پوری کا مصرع تھا: ''ہے گریباں ہاتھ میں اور پانو میں زنجیر ہے''۔ مرزا صاحب نے غزل پر اصلاح دیتے ہوئے ''میں'' سے پہلے ن کو قلم زد کر دیا (مکاتیب غالب، مرتبہ عرشی صاحب، ص ۹۵)۔

قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی نے ''ننگے پاؤں'' لکھا تھا، اصلاح کے تحت مرزا صاحب نے لکھا:

> ''ننگے پاؤں، واو کے ضمّے کو اشباع کیسا؟ یہ تو ترجمہ ''پابم'' کا ہے۔ اور پھر ''پاوں'' کی یہ املا غلط۔ پانو، گانو، چھانو'' (خطوطِ غالب، ص ۱۱۸)۔

اِس ایک لفظ کے صحیح املا کی تاکید پر کس قدر اصرار کیا گیا ہے! اِن چند مثالوں سے یہ بات بہ خوبی روشن ہو جاتی ہے کہ وہ صحتِ املا کو کتنی زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اہمیت دینے کا احوال یہ تھا کہ وہ بعض اوقات بہت سخت الفاظ استعمال کرنے میں بھی تکلف نہیں کرتے تھے۔ تفتہ کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ جن کلمات میں ے جزوِ کلمہ ہوتی ہے (: گرہ گشاے، ہماء یا جیسے راے، ہاے، واے (وغیرہ) اِس ے پر ہمزہ نہیں لکھنا چاہیے؛ اِس بات کو اِس طرح کہا ہے کہ اِس ے پر ہمزہ لکھنا ''گویا عقل کو گالی دینا ہے'' (خطوطِ غالب، ص ۲۴)۔ اِس سے اچھی طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ لفظوں کے صحیح املا پر کس قدر زور دیتے تھے اور نظر رکھتے تھے۔

نامۂ غالب میں مرزا رحیم بیگ کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں: ''میں کیوں کر..... کاتبوں کی املا کو مصحفِ مجید کی طرح سر پر دھرلوں؟ یہ تو جب ہو سکتا ہے کہ میں اپنے کو جماد و نبات فرض کرلوں... انشا میں ناسخوں کی تحریف کو مانتے ہو، املا میں کاتبوں کی غلطی کے کیوں نہ قائل ہو'' (قاطعِ برہان و رسائلِ

متعلقہ، ص ۲۵۱)۔ غزل کے ایک شعر میں صحیح املا کو ''صورتِ موزوں سے تعبیر کیا ہے:

نہ انشا معنیِ موزوں، نہ املا صورتِ موزوں
عنایت نامہ ہائے اہلِ دُنیا، ہرزہ عنواں ہیں
(دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، ص ۶۲)

''صورتِ موزوں'' بڑی پُر معنی ترکیب ہے۔ املا درست نہ ہو تو لفظ کی صورت ناموزوں ہو جاتی ہے، بگڑ جاتی ہے۔ اِس بات کو اور زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ مرزا صاحب میں صحتِ املا کی حیثیت کیا تھی۔

املا کی صحت کے اہتمام کو ملحوظ رکھنا تو ویسے بھی ضروری ہے، مگر جس مصنف کی نظر اور ذہن میں املا کی یہ اہمیت ہو، اُس کے کلام میں تو ازبس ضروری ہے۔ اِس راستے کی ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ مرزا صاحب نے املا سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ بکھرا ہوا ہے، کچھ اس خط میں کچھ اُس خط میں، کچھ اُس کتاب میں۔ دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ مرزا صاحب نے اپنے قلم سے لفظوں کو جس طرح یا جس جس طرح لکھا ہے، ایسا کوئی گوشوارہ مرتب نہیں کیا گیا جس میں ایسے سب لفظ یک جا طور پر سامنے رہیں اور اُن کے ساتھ ضروری توضیحات اور بہت ضروری تفصیلات بھی ہوں۔ اِن دو کمیوں کے سبب سے مرزا صاحب کی نظم و نثر کی نسبت سے لفظوں کی صورت نگاری سے متعلق لکھا اور دوسرے نے دوسری طرح۔ اور یہ بھی ہوا کہ ایک ہی شخص کی مرتب کی ہوئی کتاب میں بہ لحاظِ املا یکسانی نہیں۔ ایک ہی لفظ کی کہیں کوئی شکل سامنے آتی ہے اور کہیں وہی لفظ دوسری صورت میں سامنے آتا ہے۔

یہاں ذرا سی دیر کے لیے اصل موضوع سے ہٹ کر ایک سخن گسترانہ بات کہنا چاہتا ہوں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) سے ایک علمی مجلّہ غالب نامہ شائع ہوتا ہے۔ اب سے پہلے کئی برس تک بھی اُس کی مجلسِ ادارت کا رکن رہا ہوں۔ اس میں چھپنے کے لیے جو مضامین آتے تھے، اُن میں سے بیش تر مضامین میں املا اور انشا کی ہر طرح کی فروگذاشتیں ملتی تھیں اور بیش تر املائی غلطیاں بے توجہی کی پیدا کی ہوتی تھیں۔ مثلاً کم حضرات تھے جا ہائے ملفوظ اور ہائے مخلوط کی صورت نگاری میں امتیاز کو بہ طورِ التزام ملحوظ رکھتے ہوں۔ جہاں جس طرح جس لفظ کا نقش بن جائے۔ کا ما، فل اسٹاف سے بھی دور کی شناسائی معلوم ہوتی تھی۔ تشدید اور اضافت کے زیر تو اُردو لکھاوٹ کا حصہ ہی نہیں بن پائے ہیں، اِس

لیے اُن کے نہ ہونے کا کیا شکوہ۔نظموں کا ہر حرف پر ہونا اور صحیح جگہ ہونا بھی کچھ ایسا ضروری نہیں تھا۔بعض مضامین تو پرانے حکیم صاحبان کے نسخے ہوتے تھے کہ لفظوں کا اٹکل سے پڑھ لیجیے۔یہ خیال رہے کہ یہ ذاتی خط نہیں ہوتے تھے اور نہ ذاتی بیاضوں کے اندراجات۔یہ علمی مضامین ہوتے تھے۔اِس پر بھی صبر کیا جا سکتا تھا (اِس لیے بھی کہ اور کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا) مگر غضب کی بات تو یہ تھی کہ بعض مضامین اُن حضرات کے بھی ہوتے تھے جو تدوین میں مہارت کے دعوے دار ہیں اور گاہے گاہے متن کی ترتیب و تصحیح کا کام بھی کر لیا کرتے ہیں۔یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی کہ جو شخص اپنی تحریروں میں آدابِ تحریر کو ملحوظ نہیں رکھ سکتا، صحتِ املا کا التزام نہیں کر سکتا؛ وہ شخص کسی دوسرے کی تحریر کی تصحیح کیسے کر سکتا ہے اور تدوین کی مشکل ترین ذمے داری سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔یہ ضمنی بات یہاں ختم ہوئی۔

ایک بڑا مسئلہ مرزا صاحب کے فارسی کلام کی تدوین کا ہے۔یہ حقیقت ہے، اگرچہ بہت تلخ ہے، کہ اب تک ہمارے یہاں مرزا صاحب کی کلیاتِ نظم و نثرِ فارسی کا ایسا کوئی نسخہ شائع نہیں ہوا جس کے لیے کہا جا سکے کہ اُسے آدابِ تدوین کی پابندی کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔تاریخِ وفات کے حساب سے اُن کی سو سالہ یادگار منائی گئی، بہت اہتمام اور دھوم دھام کے ساتھ۔پھر تاریخِ ولادت کے لحاظ سے دو سو سالہ جشنِ یادگار بھی منا لیا گیا۔پچھلے تیس برسوں میں سمینار تو معلوم نہیں کتنے ہوئے ہوں گے، مقامی بھی کُل ہند بھی اور بین الاقوامی بھی؛ لیکن جو کام سب سے پہلے کرنے کا تھا، اُس کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔

چوں کہ کلیاتِ فارسی کی تدوین کا کام اصولِ تدوین کے مطابق نہیں ہوا، اِس لیے اِس کے مسائل بھی سامنے نہیں آ سکے، خاص کر املا کے مسائل۔یہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ مرزا صاحب کی فارسی نظم و نثر کے چھپے ہوئے مجموعوں میں سے کوئی بھی دو مجموعے بہ لحاظِ املا باہم مطابقت نہیں رکھتے۔بہ لحاظِ اصولِ تدوین کلام کو مرتب کیا جاتا، تب ایسے مسائل سامنے آتے۔املاے فارسی سے متعلق مرزا صاحب کے اہم اقوال اور توضیحات اُن کے خطوں میں اور برہانِ قاطع کی بحث سے متعلق تحریروں میں موجود ہیں، جن کو پیشِ نظر رکھنا ہر مرتب کے لیے لازم ہے۔

یہ باہم عدمِ مطابقت، جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، غیر مناسب بھی اور پریشان کن بھی۔اِس کا اندازہ ایک ہی مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔غالب صدی (۱۹۶۹ء) کے موقعے پر ہمارے یہاں تو کلیاتِ نظم فارسی کا کوئی نسخہ (میری معلومات کی حد تک) مرتب نہیں ہوا؛ ہاں پاکستان میں چھپے ہوئے دو

نسخے میں نے لاہور میں دیکھے تھے، یہ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ایک کلیاتِ فارسی تو مکتبۂ تو میری لائبریری (لاہور) نے شائع کیا تھا۔اِس کے مرتب تھے معروف اہلِ قلم اور ''غالب شناس'' ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی، اُس میں ایک غزل کے دو شعر اس طرح چھپے ہوئے ہیں:

نمی بنیم در عالمِ نشاطے، کا سان مارا
چو نور از چشمِ نا بینا، ز ساغر رفت صہبا را
مکن ناز و ادا چند ین، دلی بستان و جانی ہم
دماغِ نازکِ من برنمی تابد تقاضا را

اِن دونوں شعروں میں سب سے پہلے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایک جگہ ''نشاطے'' ہے (جس طرح ہونا چاہیے) اور دو جگہ ''دلی'' اور ''جانی'' (بہ یاے معروف) ہیں؛ یہ دورنگیِ املا کسی بھی لحاظ سے قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔فرمودۂ غالب کے مطابق (جس کا حوالہ آگے آئے گا) اِن تینوں لفظوں کو مع یاے مجہول (نشاطے، دلے، جانے) لکھا جانا چاہیے تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ''آسمان'' اور چندین' مع نون نقطہ دار ہیں اور یہ درست نہیں۔مرزا صاحب کے اصول کے مطابق)ان دونوں لفظوں کے آخر میں نون غنہ ہے؛ انھیں ''آسماں اور چندیں'' ہونا چاہے تھا۔فرمودۂ غالب کے مطابق ''برنمی تابد'' بھی درست نہیں، برنمے تابد'' ہونا چاہیے۔اگر ''برنمیتابد'' لکھا جائے تو تو تلفظ میں یاے مجہول ہی رہے گی، یعنی پڑھنے میں برنمے تابد'' آئے گا۔اس کی وضاحت اس کتاب کے دوسرے حصے میں ''املاے فارسی کے تحت کی گئی ہے۔

وزیر الحسن عابدی صاحب ہی کا مرتب کیا ہوا کلیاتِ نظمِ فارسی پنجاب یونی ورسٹی (لاہور) کی طرف سے اُسی زمانے میں شائع ہوا تھا، اُس میں یہی دونوں شعر اس طرح ملتے ہیں:

نمی بینیم در عالم نشاطی، کاسان مارا
جو نورا از چشمِ نابینا، زساغر رفت صہبا را
مکن ناز و ادا چندین، دلے بستان و جانے ہم
دماغِ نازکِ من برنمی تابد تقاضا را

یہاں پہلے نسخے کے اندراج سے مختلف صورت سامنے آتی ہے۔وہاں ''نشاطے'' ہے، مگر اس

نسخے میں ''نشاطی'' ہے۔اس اشاعت میں ''ولے'' اور ''جانے'' ہے جب کہ اُس نسخے میں ''ولی'' اور ''جانی'' ہے۔یہ واضح رہے کہ یہ دونوں نسخے ایک ہی فاضل شخص کے مرتب کیے ہوئے ہیں۔

یہ جو صورتِ حال پیدا ہوئی کہ مرتب ایک ہے،لیکن دونسخوں میں املاے الفاظ باہم مختلف ہے اور مرتب کو یہ معلوم نہیں کہ یاے معروف و مجہول اور نون غنہ سے متعلق خود مصنف نے وضاحت اور قطعیت کے ساتھ کیا لکھا ہے؛ یہ غیر مناسب صورتِ حال اسی لیے پیدا ہوئی ہے کہ املاے غالب کے متعلقات پر غور نہیں کیا گیا اور متعلقاتِ املا اور مباحثِ املاے فارسی کی ضروری تفصیلات کا گوشوارہ نہیں بنایا گیا۔

یہاں ضمناً یہ وضاحت کرنا مناسب اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ معروف ،مجہول اور غنہ آوازوں کا مسئلہ،صرف تلفظ اور لہجے کا مسئلہ نہیں ،اس کا گہرا تعلق املاے الفاظ سے ہے۔ہندوستانی فارسی میں شروع دن سے آج تک یہ آوازیں شاملِ تلفظ رہی ہیں۔یہاں جتنے لُغت مرتب ہوئے،قواعد کی جس قدر کتابیں لکھی گئیں،سب میں بالتشریح یہ لکھا گیا ہے کہ فلاں لفظ میں یاے مجہول ہے کہ یاے معروف۔اسی طرح معروف و مجہول واو کی نشان دہی کی گئی ہے۔قافیے کے بیان میں یہ تنبیہہ کہ تقید معروف و مجہول سے بچنا چاہیے۔ایران میں بھی یہ سب آوازیں شامل نہیں؛ مگر یہ اب کی بات ہے۔

مرزا صاحب کی ایران دوستی سے سب واقف ہیں،وہ ہندوستانی لغت نگاروں کو نہیں مانتے تھے؛اس کے باوجود وہ مجہول اور غنہ آوازوں کو مانتے تھے۔وہ اس پر اصرار کرتے تھے کہ فارسی قواعد کا تتبع لازم ہے،لیکن لہجے کے تتبع کے سخت خلاف تھے۔قلق کو ایک خط میں لکھا ہے:

> ''صاحب بندہ! تحریر میں اساتذہ کا تتبع کرو،نہ مغل کے لہجے کا۔ لہجے کا تتبع بھانڈوں کا کام ہے،نہ دبیروں اور شاعروں کا۔ایسی تقلید کو میرا سلام'' خطوطِ غالب،مرتبہ مہیش پرشاد،ص۱۷۹)۔

غنہ آواز کے تعلق سے بھی یہی بات لکھی ہے۔معترض کے اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اسی ۱۸ اور ۱۹ صفحے میں،جہاں ''کندیدن'' کو غلط بتاتے ہیں،اور''ماند'' و ''خواند'' کو بروزن'' چاند غلط بتاتے ہیں اور''مُند'' و ''خُند'' کو بروزنِ ''تند'' و ''گند'' صحیح فرماتے ہیں... لاحول ولا قُوّۃَ اِلّا باللہ! اہلِ ایران الف کو سُلا دیتے ہیں اور یہ لہجہ ہے،نہ قاعدہ۔شاعر اور منشی کو تتبع قواعد کا چاہیے۔لہجے کی تقلید بہر

وپیوں اور بھانڈوں کا کام ہے''(قاطع برہان اور رسائل، متعلقہ،مرتبہ قاضی عبدالودود،ص ۲۷۰)۔

مرزا صاحب کی ان وضاحتوں کی روشنی میں یہ لازم ہوگا کہ اُن کے فارسی کلام میں معروف، مجہول اور غنہ آوازوں کے تعین کو پوری طرح ملحوظ رکھا جائے۔مرزا صاحب کی وضاحت کے مطابق توصیف، تنکیر، تعظیم اور وحدت کے لیے لفظ کے آخر میں یاے مجہول آتی ہے(جیسے شخصے:ایک شخص یا کوئی شخص۔خدائے کہ:ایسا خدا جس نے)مرزا صاحب نے تاکیدا! لکھا ہے کہ ایسے مواقع پر:''ہرگز یاے معروف نہیں،یاے مجہول ہے۔یاے معروف یہاں نا مقبول ہے''(مکتوب بنام چودھری عبدالغفور سرور۔ادبی خطوطِ غالب ِص ۳۵)۔کلیاتِ فارسی کے محولہ بالا نسخوں میں جو محلِ نظر مقامات ہیں،اُن کی دو بڑی وجہیں معلوم ہوتی ہیں:مرزا صاحب نے بہ ذیلِ املا جو کچھ لکھا ہے، جو وضاحتیں کی ہیں:اُن کا مرتب نہ ہونا اور پیشِ نظر نہ رہنا۔صحتِ املا کی ناگزیر اہمیت کا احساس نہ ہونا، یوں کہیے کہ مسائلِ املا کی تفصیلات سے بے خبر ہونا۔یہی صورتِ حال اِس کتاب کی ترتیب کا محرک بنی ہے۔میں بس ایک مثال اور پیش کروں گا۔مرزا صاحب نے تفتہ کے نام ایک خط میں لکھا ہے:''ناشتا،اُس کو کہتے ہیں جس نے کچھ کھایا نہ ہو۔ہندی اُس کی:نہار منہ۔تم لکھتے ہو:اے عجب ناشتا فرستادی۔یعنی غذاے صبح،جیسا کہ ہندی میں مشہور ہے:اُس نے ناشتا بھی کیا ہے یا نہیں''(خطوطِ غالب ،ص ۹۹)۔مرزا محمد عسکری نے ادبی خطوطِ غالب میں اس عبارت کو نقل کیا(ص ۱۰۰) کاتب صاحب نے آخری سطر میں''ناشتا''کو''ناشتہ''بنا دیا:''اُس نے ناشتہ بھی کیا ہے یا نہیں''اور مصحح نے اس کی تصحیح نہیں کی۔مرزا صاحب کی تحریر میں خوامخواہ ایک لفظ کے دو املا(ناشتا۔ناشتہ) سامنے آتے ہیں،جن میں سے ایک مرزا صاحب کی منشا کے خلاف ہے۔اس عبارت میں یہ لفظ چار جگہ آیا ہے۔تین جگہ''ناشتا'' ہے اور ایک جگہ''ناشتہ''۔ایک عام قاری کے لیے یہ طے کرنا بہت مشکل ہوگا کہ ان میں سے صورتِ موزوں'' کون سی ہے۔

ایک ضمنی بات.....:املا اور روشِ کتابت دو مختلف چیزیں ہیں۔مثلاً اس سے پہلے آخرِ لفظ میں واقع یاے معروف و مجہول کی کتابت میں یہ امتیازِ صورت ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا کہ یاے مجہول کو دراز صورت میں (ے) لکھا جائے اور یاے معروف کو لازماً ی کی صورت میں لکھا جائے۔یا جیسے و اور ھ کا امتیاز۔یہ روش کتابت تھی،جو بدل گئی۔یہ املا نہیں تھا۔مرزا صاحب مثلاً''پانو'' کو صحیح سمجھتے تھے

اور ''پاؤں'' کو درست نہیں سمجھتے تھے؛ یہ املا کا اختلاف ہے اور بحثِ املا کے اختلاف سے ہوئی ہے، روشِ کتابت سے نہیں۔ مرزا صاحب نے ''زندگی'' کو ''زندگے'' لکھا تو یہ اس لفظ کا املا نہیں تھا۔ یہ اُس زمانے کی عام روشِ کتابت تھی۔ مرزا صاحب نے اصلاً زندگی (زندگ ی) ہی لکھا تھا، یوں کہ اِس لفظ کا تلفظ بھی یہی تھا۔ ''زندگے'' کہتے نہیں تھے، کہتے تھے ''زندگی''۔ زندگی کو ''زندگے'' لکھا گیا تو یہ املا کا اختلاف یا املا کی تصحیح نہیں؛ یہ روشِ کتابت کا نقش تھا جو بدل گیا۔ اِس سلسلے میں دوسرے حصے میں ''ہ۔ھ'' کے عنوان کے تحت بھی وضاحت کی گئی ہے۔ اِس کتاب کا موضوع املا ہے، روشِ کتابت نہیں۔ ''ناشتا'' کو ''ناشتہ'' لکھنا یا ''معما'' کو ''معمہ'' لکھنا املا کی غلطی ہے، اور پرانی تحریروں میں مثلاً ''گھر'' کا لفظ ''گہر'' لکھا ہوا ملتا ہے، تو یہ املا کی غلطی نہیں، یہ روشِ کتابت ہے۔ تصحیح دونوں کی واجب ہے، مگر دونوں میں جو فرق ہے، اُسے ذہن میں ضرور رہنا چاہیے۔

اِس کتاب کے پہلے حصے میں (جو گوشوارۂ الفاظ پر مشتمل ہے) اور دوسرے حصے میں (جس میں مرزا صاحب کی وضاحتوں کی روشنی میں املا کے قاعدوں کا بیان ہے) کم و بیش کی نسبت کے ساتھ ضروری مثالوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اُردو اشعار کے لیے بہ طورِ عموم دیوانِ غالب نسخۂ عرشی اور فارسی مثالوں کے لیے انتخابِ غالب (مرتبۂ عرشی صاحب) کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ یہ وضاحت کر دی جائے کہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کی اشاعتِ اوّل (۱۹۵۸ء) کے حوالے دیے گئے ہیں۔ ایک دو ضمنی حوالوں سے قطعِ نظر، اس نسخے کی اشاعتِ ثانی (۱۹۸۲ء) کو بہ طورِ کتابِ حوالہ استعمال نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اِس اشاعت کے سرورق پر بہ طورِ مرتب نام تو عرشی صاحب ہی کا چھپا ہوا ہے؛ مگر یہ مجھے معلوم ہے کہ اشاعتِ اوّل پر نظرِ ثانی کا کام اُن کی طویل علالت کے دوران ہوتا رہا، جو مکمل طور پر اُن کا کام نہیں۔ اِس نسخے میں کچھ اضافے بھی ہیں اور ان کے ذمّے دار بھی وہ نہیں۔ بعض کمیوں اور کچھ فرو گذاشتوں کے باوجود، کتابِ حوالہ کی حیثیت نسخۂ اشاعتِ اوّل کو حاصل ہے، جو مکمل طور پر عرشی صاحب کا مرتب کیا ہوا ہے۔

مرزا صاحب کی دستی تحریروں کے عکس کے لیے مندرجۂ ذیل مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے اور اکثر صورتوں میں زمانی تقدیم کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ (علم اور درست یابیِ ماخذ کی شرط کے ساتھ):

ا۔ خطوطِ غالب (جلد اوّل) مرتبۂ مولوی مہیش پرشاد۔ طبعِ اوّل، ہندوستانی اکیڈمی

الٰہ آباد۔سالِ طبع:۱۹۴۱ء۔اس اشاعت کا جو نسخہ میرے سامنے ہے،اُس میں شامل عکسی تحریروں کی تفصیل یہ ہے:ایک طویل خط بہ نامِ منشی ہرگوپال تفتہ(مکتوبہ ۲۲/مارچ ۱۸۵۲ء،ص ۶ کے مقابل)۔ایک خط بہ نام قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی(۲۸/اگست ۱۸۵۹ء۔ص۱۱۶کے مقابل)۔ایک لفافے کا عکس،جس پر پتا مرزا صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔(ص۱۱۳کے مقابل)ایک نامکمل خط (ص۱۲۰کے مقابل)۔ایک خط بہ نام میر مہدی مجروح (۱۸۶۲ء۔ص۲۸۱ کے مقابل)۔ایک خط بہ نامِ شیونراین آرام(ص۴۰۴ کے مقابل)۔یعنی خطوط غالب ا میں ،جو عرشی صاحب کے مرتب کیے ہوئے مجموعے مکاتیبِ غالب (اشاعتِ اوّل،۱۹۳۷ء) کے بعد ،بہ لحاظ،صحتِ متن سب سے بہتر مجموعہ ہے،کُل چار مکمل اور ایک نامکمل خط کے عکس شامل ہیں اور لفافے کا عکس ہے۔(ہاں مکاتیبِ غالب میں کوئی عکس شامل نہیں)۔

۲۔مرقعِ غالب،مرتبہ پرتھوی چندر۔لکشمی پرنٹنگ ورکس دہلی۔سالِ طبع:۱۹۶۶ء۔ یہ بہت وقیع مجموعہ ہے،زمانی تقدیم کے لحاظ سے اِس میں مرزا صاحب کی خطی تحریروں کے سب سے زیادہ عکس محفوظ ہیں۔نوابینِ رام پور کے نام خطوط کے عکس اِس مجموعے میں شامل ہیں۔مرزا صاحب کی بعض اور تحریروں کے عکس بھی ہیں۔جتنے عکس اس مجموعے میں شامل ہیں،اُن کے لیے بہ طورِ عموم اِسی مجموعے کا حوالہ دیا گیا ہے،یوں کہ اُن سب تحریروں کے عکس کے لیے اِس مجموعے کی حیثیت ماخذِ اوّل کی ہے۔(پرتھوی چندر (مرحوم) سے مجھے شرفِ ملاقات حاصل رہا ہے۔ادبیات سے اُن کا تعلق دور کا تھا؛مگر غالب کے عاشق تھے،سچے عاشق۔وہ اُن لوگوں میں تھے جن کے لیے بلا تکلف کہا جا سکتا ہے:اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں)۔

۳۔علی گڑھ میگزین غالب نمبر،۹۴۔۱۹۸۴ء۔اڈیٹر(پروفیسر)مختار الدین احمد آرزو۔اس میں مرزا صاحب کے سات خطوں کے عکس ہیں۔دستنبو کے دو

صفحوں کا عکس ہے، جن میں سے ایک صفحہ جو دستنبو کا سرورق ہے (بہ قول مدیر) بہ خطِ غالب ہے اور دوسرے صفحے پر بعض الفاظ کے معنی بہ خطِ غالب ہیں۔ دو عکس غالب کے فارسی کلیات کے ایک قلمی نسخے کے حواشی پر مندرج عبارتوں کے ہیں (جو بہ قولِ مدیر) بہ خطِ غالب ہیں۔

خطوں میں سب سے طویل اور اہم خط بہ نامِ مولوی ضیاء الدین خاں دہلوی ہے۔ ایک رقعہ ہے اور وہ بھی (بہ ظنِ غالب) اُنھی کے نام ہے۔ دو خط حسین مرزا کے نام ہیں، جو بہادر شاہ کے ناظر تھے۔ اِن کے نام اُردوے معلّٰی میں کئی خط ہیں'' (مدیر)۔ مدیر نے وضاحت کر دی ہے کہ یہ چاروں خط اُن کو ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے ملے تھے۔ مدیر نے یہ وضاحت نہیں کی کہ اُن کو اصل خط ملے تھے یا اصل خطوں کے عکس ملے تھے۔ خطوطِ غالب میں شامل ڈاکٹر صدیقی کے مقدمے اور اُن کے طویل مقالے بہ عنوان ''کچھ اور بکھرے ورق'' (رسالۂ ہندستانی (الہ آباد) ۱۹۳۴ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب اصل خط اُن کے سامنے تھے اور (غالباً) خطوطِ غالب کی دوسری جلد میں شامل تھے۔ اب نہیں معلوم کہ یہ اصل خط کہاں ہیں۔

ایک خط بہ نامِ یوسف علی خاں عزیز ہے۔ ایک فارسی خط جو دراصل دستاویز ہے؛ خدا داد خاں، ولی داد خاں کے نام ہے، جو بہ قولِ مدیر ''آگرے میں رہتے تھے اور مہاجنی کا کام کرتے تھے''۔ ایک خط قدر بلگرامی کے نام ہے۔ اِن آخری دو خطوں کے عکس اِس قدر دُھندلے ہیں کہ اچھی طرح پڑھنے میں نہیں آتے۔ فارسی والے دستاویزی خط کا عکس آج کل (نئی دہلی) کے غالب نمبر ۱۹۵۲ء میں بھی شائع ہوا ہے اور میں نے اُسی سے استفادہ کیا ہے، کہ اُس میں عبارت پوری طرح خوانا ہے۔ قدر بلگرامی کے نام خط کا متن خطوطِ غالب میں شامل ہے (ص ۱۹۶) اور میں نے اُسی کی مدد سے اِس عکس سے استفادہ کیا ہے۔ ہاں اُس دستاویزی خط کا عکس فسانۂ غالب (مجموعۂ مضامین

مالک رام) میں بھی شامل ہے۔اِس خط کی تاریخِ کتابت سے متعلق وہاں جو کچھ لکھا گیا ہے، میں نے اُس سے بھی استفادہ کیا ہے۔یہ اصل خط مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ذخیرۂ حبیب گنج میں محفوظ (فسانۂ غالب،ص ۳۳)۔

۴۔غالب کے خطوط،مرتب:ڈاکٹر خلیق انجم چار جلدیں۔ناشر: غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی:۹۳۔۱۹۸۴ء۔مرزا صاحب کے اُردو خطوں کے دست یاب عکس بھی،خطوں کے متن کے ساتھ اِس مجموعے میں شامل کر لیے گئے ہیں۔اِس طرح سارے بکھرے ہوئے عکس یک جا ہو گئے ہیں۔مرزا صاحب کے اُردو خطوں کے عکس سب سے بڑا مجموعہ ہے اور اِس لحاظ سے اِس کی بڑی اہمیت ہے۔اگر یہ میرے سامنے نہ ہوتا،تو میں بہت سے خطوں کے عکس سے استفادہ نہیں کر سکتا تھا۔چوں کہ یہ موخر مجموعہ ہے،اِس لیے اِس کا حوالہ اُنھی خطوں کے عکس کے تحت دیا گیا ہے، جو اِس سے مقدم مآخذ میں نہیں مل سکے،یعنی وہ مآخذ نہیں مل سکے۔

۵۔نامہ ہای فارسیِ غالب،مرتبہ سید اکبر علی ترمذی۔غالب اکیڈمی،دہلی،۱۹۶۹ء۔یہ کتاب فی الوقت پیشِ نظر نہیں۔ڈاکٹر حنیف نقوی نے مطلع کیا ہے کہ اِس میں مرزا صاحب کی فارسی کی ایک دستی تحریر کا عکس شامل ہے۔اُس عکس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی اُنھوں نے بھیج دی تھی،وہی پیشِ نظر ہے۔یہ مرزا صاحب کی پنشن کے قضیے کے سلسلے کی عرضی ہے جو اُنھوں نے فریزر کے سامنے پیش کی تھی۔اِس میں متعدد انگریزی لفظ آئے ہیں۔

۶۔آج کل (نئی دہلی) غالب نمبر فروری ۱۹۵۲ء۔اِس میں مولوی نعمان احمد کے نام مرزا صاحب کے دو اُردو خطوں کا عکس ۳؎ شامل ہے۔ایک فارسی خط (دستاویز) کا عکس ہے جو خداداد خاں ،ولی داد خاں کے نام ہے۔اِس کا حوالہ اوپر آ چکا ہے۔رضا لائبریری میں محفوظ دستنبو کے ایک نسخے کے آخری صفحے کا عکس ہے ''جس کے حاشیے پر خود غالب کے قلم کا نوٹ ہے''۔ایک فارسی قطعے کا

عکس ہے جو مقالہ نگار سید منظور الحسن برکاتی (ٹونک) کے قول کے مطابق کتب خانۂ وزیریہ (ٹونک) میں محفوظ دستنبو کے ''سرورق کے دوسرے صفحے پر خود مرزا غالب کے اپنے قلم سے لکھا ہوا ہے'' (قطعہ یہ ہے: نذرِ نواب وزیر الدولہ: آں محیطِ کرم و دانش و داد،ہم بدیں حیلہ مگر یاد آید ۔غالبِ خستہ کہ رفتست زیاد)۔دیوانِ غالب فارسی کے ایک صفحے کا عکس ''جس میں بین السطور کے اندر غالب نے اپنے قلم سے ایک رباعی ہے'' (مخزونہ رضا لائبریری رامپور)۔

۷۔آج کل (نئی دہلی) غالب نمبر،فروری ۱۹۶۵ء۔اِس کے ایک صفحے کا عکس ڈاکٹر حنیف نقوی نے بھیجا ہے۔اس میں غلام نجف خاں کے نام مرزا صاحب کے خط کا عکس ہے(آغاز:''لو صاحب یہ پندرہ بیتیں ہیں تقسیم اس کی اِسی طرح رکھنا کہ...)۔ایک فارسی قطعے بہ خطِ غالب کا عکس ہے(پہلا شعر:امین ملک و ممالک معظم الدولہ...امیر شاہ نشان و کریم ابر نوال)۔یہ دونوں چیزیں نقوش (لاہور) کے خطوط نمبر کی پہلی جلد میں بھی بعد کو شائع ہوئی ہیں۔

۸۔نقوش (لاہور) خطوط نمبر،اپریل،مئی ۱۹۶۸ء۔اِس کی پہلی جلد میں مرزا صاحب کے دو فارسی خطوں کے اور دس اُردو خطوں کے عکس شائع ہوئے ہیں۔ایک فارسی قطعہ ہے(جس کا حوالہ اوپر آ چکا ہے۔کچھ اور متفرق اور مختصر اصلاحی تحریریں بھی ہیں جنوں بریلوی کے کلام سے متعلق۔اِس میں شامل کئی تحریروں کے عکس اِس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔

۹۔مرزا صاحب کے ایک خط بہ نامِ علائی کا عکس اور ایک فارسی قصیدے کے حاشیے پر مرزا صاحب کی تحریر کا عکس بمبئی سے کالی داس گپتا رضا صاحب نے بھیجا ہے۔(علائی کے نام خط کا آغاز:''صاحب آگ برستی ہے کیوں کر آگ میں گر پڑوں''۔اِس خط کا عکس غالب کے خطوں میں شامل ہے۔)

۱۰۔ہندستانی (الہ آباد) ۳۴-۱۹۳۳ء۔اِس رسالے کے دو مختلف شماروں میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا ایک طویل مقالہ دو قسطوں میں شائع ہوا تھا،جس میں

غالب کے کچھ نو دریافت خطوں کا متن پیش کیا گیا تھا اور متعدد خطوں کے عکس بھی شائع کیے گئے تھے۔ پہلی قسط کا عنوان تھا: بکھرے ورق۔ دوسری قسط کا عنوان ہے: کچھ اور بکھرے ورق۔ پہلی قسط جس شمارے میں شائع ہوئی تھی، وہ مجھے نہیں مل سکا، اب سے چار پانچ برس پہلے میں نے اُسے دیکھا تھا۔ اب اُس کے مندرجات ذہن میں نہیں۔ دوسری قسط پیشِ نظر ہے۔ اِن دونوں قسطوں میں خطوں کے جو عکس شامل ہیں، وہ پہلی بار سامنے آئے تھے۔ اصل خط ڈاکٹر صدیقی اور مہیش پرشاد کے پاس تھے اور یقین ہے کہ وہ سب دوسری جلد کے کاغذوں میں شامل ہوں گے (جس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اُس جلد کے سارے کاغذات گم ہو گئے۔ لفظ ''لگاؤ'' کے تحت حصۂ اوّل میں مولوی ضیاء الدین خاں دہلوی کے مکتوب کے حوالے سے اس کا کچھ ذکر کیا گیا ہے، اُسے دیکھا جائے گا)۔

املا سے متعلق مرزا صاحب کے اقوال اور مثالیہ اشعار کے لیے مندرجۂ ذیل مآخذ پیشِ نظر رہے ہیں:

۱۔ قاطعِ برہان و رسائلِ متعلقہ، مرتبۂ قاضی عبدالودود۔ سالِ طبع: ۱۹۶۷ء
حوالوں میں اِس کے لیے بہ طورِ نشان قاطع لکھا گیا ہے۔

۲۔ مکاتیبِ غالب، مرتبۂ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، طبعِ ششم۔ سالِ طبع: ۱۹۴۹ء۔

۳۔ خطوطِ غالب، مرتبۂ مہیش پرشاد، ہندستانی اکیڈمی الہ آباد، سالِ طبع: ۱۹۴۱ء۔

۴۔ ادبی خطوطِ غالب، مرتبہ مرزا محمد عسکری۔ نظامی پریس لکھنؤ۔ سالِ طبع ۱۹۲۹ء۔

۵۔ فرہنگِ غالب، مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، سالِ طبع: ۱۹۴۷ء۔ (اس کتاب کا جو نسخہ میرے پاس ہے، اُس میں سرورق نہیں۔ سالِ طبع نذرِ عرشی میں شامل تفصیلِ مطبوعاتِ عرشی صاحب سے ماخوذ ہے)۔

۶۔ دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی، طبعِ اوّل، ۱۹۵۸ء۔ ناشر: انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ۔

۷۔ انتخابِ غالب، مرتبہ مولانا عرشی، مطبوعہ قیمہ، بمبئی، سالِ طبع: ۱۹۴۲ء

۸۔ دیوانِ غالب کامل، مرتبہ کالی داس گپتا رضا۔ سالِ طبع: ۱۹۹۵ء۔

۹۔ پنج آہنگ، تصنیف: مرزا غالب۔ تقدیم: ڈاکٹر حنیف نقوی۔ ناشر: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔ سالِ طبع: ۱۹۹۷ء۔ (نقوی صاحب نے لکھا ہے کہ مرزا صاحب کی اِس کتاب کا مکمل اور قدیم ترین خطی نسخہ بنارس ہندو یونی ورسٹی کی لائبریری کے ذخیرۂ لالہ سری رام دہلوی میں ہے۔ اُسی نسخے کو مفصل مقدمے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ میں نے دوسرے مطبوعہ نسخوں پر اِس کو ترجیح دی ہے)۔

۱۰۔ دیوانِ غالب نسخۂ لاہور: پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے کتاب خانے میں دیوانِ غالب کا ایک اہم خطی نسخہ تھا۔ قاضی عبدالودود نے اس سے متعلق ایک تعارفی مضمون لکھا تھا [نقوش (لاہور) اکتوبر ۱۹۵۸ء]۔ مولانا عرشی نے بھی اپنے مرتبہ نسخۂ دیوانِ غالب کے مقدمے میں اس کا تعارف کرایا ہے (ص ۸۴)۔ اس نسخے کی فوٹو کاپی اُن کو قاضی صاحب نے لا کر دی تھی (ایضاً ص ۱۲۰)۔ مولانا عرشی کی یہ رائے ہے کہ اس نسخے کی کتابت نواب فخرالدین محمد خاں کی ہے، جو مرزا غالب کے پسندیدہ کاتب تھے۔ یہ نسخہ مختلف اعتبارات سے اہم ہے، خاص بات یہ بھی ہے کہ کاتب نے اکثر صورتوں میں مرزا صاحب کے اندازِ کتابت کی پیروی کی ہے۔ اب سے پہلے یہ مشہور ہوگیا تھا کہ یہ نسخہ غائب ہوگیا۔ بارے، وہ خطی نسخہ کسی طرح ڈاکٹر معین الرحمٰن کے پاس آ گیا اور انھوں نے اُسے بہت اہتمام کے ساتھ ''نسخۂ خواجہ'' کے نام سے شائع کر دیا۔ معین صاحب نے اچھا کیا کہ اُس اہم خطی نسخے کو عکسی صورت میں شائع کیا ہے، اس طرح کہ ایک صفحہ پر اصل نسخے کا عکس ہے اور صفحۂ مقابل پر بہ خطِ کاتب ہے (جس کی مطلق ضرورت نہیں تھی)۔ اِس نسخے سے بعض ایسے قیمتی حوالے میرے کام میں معین ثابت ہوئے ہیں جو کسی اور طرح مجھے نہیں مل سکتے تھے۔ اِس کا حوالہ ''نسخۂ لاہور'' کے نام سے

دیا گیا ہے (یوں کہ اِسے ''نسخۂ خواجہ'' کہنے کا جواز میری سمجھ میں نہیں آتا)۔

دو وضاحتیں: (۱) نسخۂ بھوپال، یا نسخۂ امروہہ یا نسخۂ عرشی زادہ کے نام سے مرزا صاحب کا جو خود نوشت دیوانِ اُردو شائع ہوا ہے عکسی صورت میں، اُس کو بہ طورِ ماخذ استعمال نہیں کیا گیا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مرزا صاحب کی ابتداے جوانی کے زمانے کی تحریر ہے اور ہم سبھی اس بات سے اچھی طرح واقف ہوں گے کہ ایسے معاملات و مسائل کے لیے بہ طورِ عموم یہ پختگی کا زمانہ نہیں ہوتا۔ قطعی اور واضح نقوش کی تشکیل ذرا دیر میں ہو پاتی ہے۔ اِس بنا پر اِس عمر کی تحریر کو املا کی بحثوں میں بنیاد بننا اور بہ طورِ ماخذ اُن سے کام لینا مناسب نہیں۔ املا کے بہت سے مسائل جن پر آگے چل کر اُنھوں نے بہت اصرار کیا، اُس وقت اُن کے ذہن میں یا تو آئے ہی نہیں تھے، یا ایسے کم تاب نقش تھے جن پر نظر دیر تک ٹھہر پاتی تھی۔ اِس نسخے کے ایک مرتب اکبر علی خان کے الفاظ میں:

''غالب فارسی الفاظ میں ذال اور طوے کے قائل نہ تھے، لیکن اُن کا یہ نظریہ نسخۂ عرشی زادہ کی کتابت کے بعد کا ہے؛ اِس لیے نسخۂ عرشی زادہ میں گذر، گذرگاہ، گذشتن وغیرہ الفاظ کو ذال سے لکھا ہے، زے سے نہیں لکھا۔ تپیدن کے تمام مشتقات کو.... بالعموم طوے سے لکھا ہے، مگر دو ایک مثالوں میں اِس کے خلاف بات لکھی گئی ہے...غالب ''خورشید'' کو بہ حذفِ واو لکھنے کے قائل تھے، مگر نسخۂ عرشی زادہ کے بعد یہ عقیدہ اختیار کیا تھا، اِس لیے کہ اِس میں واو موجود ہے''۔ (دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، طبع دوم، ص ۴۶۳)

(۲) فارسی اشعار کی مثالیں صرف انتخابِ غالب، مرتبہ عرشی صاحب سے لی گئی ہیں؛ اِس بنا پر کہ یہ عرشی صاحب کا مرتب کیا ہوا ہے، یوں اس کی حیثیت دیگر مطبوعہ نسخوں سے الگ ہے۔ کلیاتِ فارسی کی اشاعتِ اوّل (مطبعِ دارالسلام، دہلی ۱۸۴۵ء) پیشِ نظر رہی ہے، مگر اِسی وجہ سے اُسے اِس بحث میں بہ طور ماخذ شامل نہیں کیا گیا۔

توقع کی جاتی ہے کہ اِس کتاب سے املاے غالب سے متعلق مسائل کو سمجھنے میں اور کلامِ غالب کی تدوین میں مدد مل سکے گی، اور لفظوں کے صحیح تر نقوش کلامِ غالب میں بن سکیں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ بات کہ الفاظ دورنگیِ املا سے محفوظ رہ سکیں گے اور کلامِ غالب میں الفاظ کو اُس طرح لکھا جا سکے

گا کہ وہ مرزا صاحب کی توضیحات کے خلاف نہ ہوں۔

جناب کالی داس گپتا رضا اور ڈاکٹر حنیف نقوی کا بہ طور خاص شکر گزار ہوں کہ اِن حضرات نے متعلقہ مآخذ کی فراہمی میں مدد کی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر شاہد ماہلی صاحب کا بھی شکر گزار ہوں، جنھوں نے اِس کتاب کی ترتیب پر اصرار کیا اور اس کی مشینی کتابت اور طباعت کی نگرانی کی ذمّے داری قبول کی۔ اب مجھے اطمینان ہے کہ کتاب بہتر طور پر چھپ سکے گی۔

رشید حسن خاں

۱۰/ دسمبر ۱۹۹۹ء

....

حواشی:

ا۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ اِس نام کے دو مجموعے ہیں؛ ایک اصلی اور ایک نقلی (یعنی اصل نسخے کی نقل)۔ اصلی نسخہ تو یہی ہے جس کے سرورق پر بہ طور مرتب مہیش پرشاد کا نام لکھا ہوا ہے (اور میں نے بہ طور ماخذ اس نسخے کو سامنے رکھا ہے۔) نقلی نسخہ وہ ہے جس کے سرورق پر مرتب کی حیثیت سے ''مالک رام'' چھپا ہوا ہے؛ مگر اُن کی ایک صفحے کی تحریر بھی اِس میں موجود نہیں، جس سے صحیح صورتِ حال کا علم ہو سکے اور ضروری باتیں معلوم ہو سکیں کہ اصل مرتب کا نام کس نے ہٹایا اور کیوں اور کیا اضافے بھی کیے گئے ہیں؟ اِسے انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ نے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں دو صفحے کا ''تعارف'' شامل ہے پروفیسر آل احمد سرور (سکریٹری انجمن ترقی اُردو، ہند) کا لکھا ہوا۔ اُن دنوں مالک رام صاحب ہندستان میں نہیں تھے، یوں بڑی ذمّے داری ناشر کی تھی کہ وہ یہ دیکھتا کہ ایک شخص کی زندگی بھر کی محنت بہ یک جُنبشِ قلم دوسرے شخص کے کھاتے میں نہ چلی جائے۔ مرتب اصلی مہیش پرشاد کا ''دیباچہ شامل ہے، مگر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا بہت عمدہ اور ضروری ''مقدمہ'' نکال دیا گیا (جو اصل نسخے میں شامل ہے)۔ بے انصافی کی شاید یہ سب سے ''بہتر'' مثال ہے جو ایک علمی ادارے کی سرپرستی میں پیش کی گئی ہے۔

مہیش پرشاد نے خطوطِ غالب کی دوسری جلد بھی مرتب کر لی تھی۔ پہلی جلد کے مقدمے میں وہ اندراجات ایسے ہیں جن سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دوسری جلد مکمل طور پر مرتب ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر

عبدالستار صدیقی کے مقدمے کے پہلے ہی صفحے پر یہ اطلاع ملتی ہے کہ ''پہلی جلد اب شائع ہو رہی ہے اور اُمید ہے کہ دوسری جلد کا چھاپا بھی اِسی سال ہو جائے۔'' اِسی دوران مہیش پرشاد کا انتقال ہو گیا۔ غالب سے متعلق اُن کے سب کاغذات ''انجمن ترقی اُردو ہند'' نے خرید لیے (سرور صاحب) اُس میں بہت سے اصل خطوں کے ساتھ دوسری جلد بھی تھی۔ پھر کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ دوسری جلد کا مسودہ گم ہو گیا۔ یہ کیسی پُرحسرت اور اندوہ ناک بات ہے کہ دوسری جلد اصل مرتب کے نام سے شائع نہ ہو سکی؛ اور پہلی جلد سے بھی اصل مرتب کو بے دخل کر دیا گیا۔ (مگر سارے قرائن واضح طور پر بتاتے ہیں کہ دسری جلد کا مسودہ گُم نہیں ہوا تھا، اُسے ''گُم شدہ'' مشہور کیا گیا)۔

۲۔ اشاعت اوّل میرے سامنے نہیں، اِس کی چھٹی اشاعت (۱۹۴۹ء) پیشِ نظر ہے۔ پہلی اشاعت کا سنہ اسی موخر اشاعت کے اندراج سے ماخوذ ہے۔

۳۔ مولوی نعمان احمد ضلع سیتاپور (یوپی) کے علاقے مہوا کے تعلقے دار تھے۔ ان کے نام مرزا صاحب نے چار اُردو خط، معروف نقاد احتشام حسین صاحب نے ایک مضمون میں پیش کیے تھے۔ مضمون میں متن تو چاروں خطوں کا ہے، مگر عکس صرف دو خطوں کا ہے۔ اڈیٹر نے یہ لکھا ہے کہ ''خطوں کے عکس اچھے نہیں تھے، اُن میں سے صرف دو شائع ہو سکے''۔ غالب کے خطوط میں اُن چاروں خطوں کا صاف اور واضح عکس شامل ہے۔ اصل خط بہ قول ڈاکٹر خلیق انجم اب انڈیا آفس لائبریری لندن میں ہے۔

۴۔ یہ تحریر جو چار سطروں پر مشتمل ہے، قصیدے کے اس شعر سے متعلق ہے:

آں از نعم، آوازۂ انکار در افگند

ایں را ز بلیٰ معنیِ اقرار بر آمد

(اصل ورق پر جا بہ جا چیپیاں لگائی گئی ہیں، یوں بعض لفظ دب گئے ہیں) ''چوں ایں.... یافت مولوی امام بخش صہبائی پیش معتقدان خویش.... خندید و گفت افسوس کہ غالب عربی نمید اند واز نعم معنی انکار افادہ میکند حال آنکہ نعم و بلیٰ مرادف بالمعنی است مولوی آل نبی یکے از یاران غالب عبارت شرح ملا کہ رفع ایں وسوسہ میکرد بوے نمود و گفت غالب حق گفتہ است و تو غلط فہمیدۂ سوال از جانب حق اینست الست بربکم آیا نیستم پروردگار شاو ایں کلمۂ استفہامیہ است کفار گفتند ہاں نیستی خداے ما مومناں گفتند ہاں ہستی خداے ما آں تسلیم انکار است و ایں تسلیم اقرار مولوی چوں خر در وحل فرو ماند''۔

(املائے غالب، رشید حسن خاں، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، سالِ اشاعت ۲۰۰۰، ص ۹ تا ۲۸)

ooo

شرحِ طباطبائی

مولانا نظم طباطبائی کی شرح، اپنے انداز کی منفرد کتاب ہے، خاص کر اِس اعتبار سے کہ شرحِ کلامِ غالبؔ کے سلسلے کی بہت سی بحثوں کا نقطۂ آغاز بنی ہے۔ نظمؔ سے دوسرے شارحین نے بہت سے مقامات پر اختلاف کیا ہے لیکن اس سے اِس کی اہمیّت ذرا بھی کم نہیں ہوتی۔ آج بھی کلامِ غالبؔ کے اچّھے طالبِ علموں کے لیے اِس شرح کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اشعار کی شرح کے ذیل میں زبان، بیان، قواعدِ شاعری، بلاغت، عروض اور فلسفے کے بہت سے مسائل اِس کتاب میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اِسی کے ساتھ دہلیؔ و لکھنؤؔ کے دبستانی اختلافات کی جھلک بھی کئی جگہ نظر آجاتی ہے۔ پڑھنے والا ان مباحث سے اگر واقف نہیں، تو وہ اِس شرح کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا۔ مقصد یہ ہے کہ اِس کتاب کو صرف غالبؔ کے اشعار کی شرح سمجھ کر نہیں پڑھنا چاہیے۔ فارسی میں شرح نویسی کی جو طاقتور روایت کارفرما رہ چکی تھی، وہ کثیر الجہات تھی، یعنی شرح لکھنے والا، جملے یا شعر کا مفہوم لکھنے کے ساتھ ساتھ اِس عبارت یا اِس مفہوم سے متعلّق اور ضروری باتیں بھی لکھتا جاتا تھا، یہی انداز اِس شرح کا ہے۔ کسی ایک تحریر میں ایسی کسی بھی کتاب کے جملہ مباحث کا بیان مشکل ہے، خاص کر ایسی تحریر میں جو کسی سمینار میں پڑھنے کے لیے لکھی گئی ہو کہ وہ تو مختصر تر ہوتی ہے، اِس لیے چند ضروری اشارات پر اکتفا کرنا ایک طرح کی مجبوری ہے۔ اِس مختصر سی تحریر میں اس شرح کی بس دو تین خصوصیات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اِس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اشعار کا وہی مفہوم عموماً لکھا گیا ہے جس پر شعر کے لفظ ظاہری طور پر دلالت کرتے ہیں۔ ایسی قیاس آرائی کو دخل نہیں دیا گیا ہے جس کا تعلّق شرح لکھنے والے کی اپنی جولانیِ طبع اور نکتہ تراشی سے ہوتا ہے۔ غالبؔ کے بہت سے اشعار کا احوال یہ ہے کہ اِن سے کئی مفاہیم کو وابستہ کیا

جاسکتا ہے، یہاں تک کہ جدید سائنسی خیالات کو اِن کے حوالے کیا جاسکتا ہے اور ایسا کیا گیا ہے۔ غالبؔ نے اپنے متعدّد اشعار کی تشریح خود بھی کی ہے، جو اِن کے خطوں میں محفوظ ہے۔ مولانا حالیؔ نے یادگارِ غالبؔ میں فارسی اردو کے بہت سے اشعار کا مطلب لکھا ہے اور تشریح کی ہے۔ غالبؔ اور حالیؔ کی ایسی تحریروں کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ اِن دونوں نے اختصار کے ساتھ شعر کا وہی مطلب بیان کیا ہے جس پر الفاظِ شعر دلالت کرتے ہیں۔ کسی ایک جگہ ایسی قیاس آرائی کو دخل نہیں دیا گیا ہے جو اِس دلالت سے الگ ہو اور محض نکتہ آفرینی کے ذیل میں آتی ہو۔ یہاں بحث اِس سے نہیں کہ اصولاً اِس اندازِ تشریح کی حیثیت کیا ہے، صرف یہ کہنا ہے کہ شاعر نے اور اِس شاعر سے بہت قریبی نسبت رکھنے والے ایسے شخص نے جس کی سخن فہمی اور سخن سنجی کو مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے، الفاظ کی ظاہری دلالت سے الگ ہو کر کوئی بات نہیں کہی ہے۔ مولانا نظمؔ نے بھی، جو شارحینِ غالبؔ میں بیش تر سے زمانی طور پر مقدم ہیں، اِسی اندازِ تشریح کو اختیار کیا ہے اور اِس لحاظ سے یہ کہنا چاہیے کہ تفسیر و تشریح کے جس انداز کو خود شاعر نے اختیار کیا تھا اور پھر حالیؔ نے جس کی توسیع کی تھی، اِسی انداز کو اِس شرح میں اختیار کیا گیا ہے۔

شعر کا مفہوم لکھنے کی حد تک تو مولانا نظمؔ کا عمومی انداز یہی رہا ہے، لیکن شعر میں جو لفظ آئے ہیں، اِن کی نسبت سے جگہ جگہ قواعدِ زبان، قواعدِ شاعری اور اصولِ بلاغت کے بہت سے نکتے بیان میں آئے ہیں۔ اِن نکتوں کو کہیں اختصار کے ساتھ اور کہیں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایسے بیانات ہیں جن کو توجّہ کے ساتھ پڑھنا کلامِ غالبؔ کے ایک اچھے طالبِ علم کے لیے بہت ضروری ہے۔ اِن سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ جن علوم پر مشرقی شعریات کی بنیاد ہے، اِن سے واقفیت کے بغیر، کلاسکی شاعری کو صحیح طور پر سمجھنا مشکل ہے اور سچّی بات تو یہ ہے کہ ان سے ضروری واقفیت کے بغیر اِس شرح کو بھی سمجھنا مشکل ہے۔ میں ایسے چند مقامات کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ اِنھی چند حوالوں سے بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ علمِ معانی و بیان اور قواعدِ زبان کے کیسے کیسے نکتے معرضِ بیان میں آئے ہیں۔

انشائیہ بیان، خبریہ بیان سے افضل ہوتا ہے، یہ بلاغت کا مسلّمہ قاعدہ ہے۔ غالبؔ کا شعر ہے:

مرگیا پھوڑ کے سر، غالبِ وحشی، ہے ہے!
بیٹھنا اُس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

مولانا نظم نے اِس شعر کی شرح یوں کی ہے: ''اوپر یہ بیان گزر چکا ہے کہ خبر سے زیادہ تر انشا میں لطف ہے... اِسی سبب سے جو شاعر مشاق ہے، وہ خبر کو بھی انشا بنالیتا ہے۔ اِس شعر میں مصنّف نے خبر کے پہلو کو ترک کر کے، شعر کو نہایت بلیغ کر دیا ہے، یعنی دوسرا مصرع اگر یوں ہوتا: بیٹھا کرتا تھا جو آ کرتری دیوار کے پاس، یا اِس طرح ہوتا: ابھی بیٹھا تھا جو آ کرتری دیوار کے پاس، تو یہ دونوں صورتیں خبر کی تھیں۔ اور ''بیٹھنا اس کا وہ آ کرتری دیوار کے پاس'' جملۂ انشائیہ ہے۔ اور ''وہ'' کا اشارہ اس مصرعے میں ایک اور خوبی ہے... اِس شعر میں ''وہ'' کا لفظ اِن معنوں کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ معشوق، جس کی طرف خطاب ہے، اِس واقعے سے ناواقف نہیں ہے، جبھی تو یہ اسے یاد دلاتا ہے اور ''آ کر'' کا لفظ اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اِس وحشی کا یہ دستور تھا کہ جن جن وقتوں میں اسے معشوق کی صورت دیکھنے کی یا آواز سن لینے کی اُمید ہوتی تھی، اِن اوقات میں روز وہ آ کر بیٹھا کرتا تھا۔ اگر ''آ کر'' اس مصرعے میں نہ ہوتا، تو یہ مطلب نکلتا کہ فقط اِس کے بیٹھے رہنے کو یاد دلاتا ہے اور شعر کا حسن کم ہو جاتا، اِس لیے ''آ کر بیٹھنا'' ایک ادا اور ایک حرکت ہے، اور ''بیٹھے رہنا'' سکون و طمانیت ہے اور دونوں کا فرق ظاہر ہے''۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا! سادہ سا شعر ہے، جس کے معنی بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں، کہ وہ نمایاں ہیں۔ شارح نے مفہوم بیان کرنا غیر ضروری خیال کیا، اِس کے بجائے اِن نکتوں کو بیان کیا جن کی طرف بہت سے لوگوں کی توجّہ منعطف نہیں ہو پاتی اور جن کی مدد سے اِن خوبیوں کو ذہن نشیں کیا جا سکتا ہے جو بیان سے تعلّق رکھتی ہیں۔

مرزا صاحب کا ایک بہت آسان اور بہ ظاہر سادہ سا شعر ہے:

مجھ کو پوچھا، تو کچھ غضب نہ ہوا   میں غریب اور تو غریب نواز!

اس شعر میں معنی کے لحاظ سے تو کچھ اشکال نہیں۔ مولانا نظم نے بھی اِس کا مفہوم بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ البتّہ پہلے مصرعے میں بیان کے لحاظ سے جو ایک نکتہ پوشیدہ ہے، اِس کی طرف ضرور متوجّہ کیا ہے۔ ایجاز، مساوات، اطناب، یہ علمِ بلاغت کی اصطلاحیں ہیں۔ اِن کی روشنی میں لکھتے ہیں: ''اِس شعر میں ''کچھ غضب نہ ہوا'' کثیر المعنی ہے۔ اگر اِس جملے کے بدلے یوں کہتے کہ ''مہربانی کی'' تو لفظ و معنی میں مساوات ہوتی، ایجاز ہوتا۔ اور اگر اِس کے بدلے یوں کہتے کہ ''مرا خیال کیا'' تو مصرعے میں اطناب ہوتا، لطفِ ایجاز نہ ہوتا... اور اس مصرعے میں ''مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا'' ایجاز ہے۔ اِس

سبب سے کہ یہ جملہ ''کچھ غضب نہ ہوا'' معنی زائد پر دلالت کرتا ہے۔ اِس جملے کے تو فقط یہی معنی ہیں کہ کوئی بے جابات نہ ہوئی۔ لیکن معنی زائد اِس سے یہ بھی سمجھ میں آتے ہیں کہ معشوق اِس سے بات کرنا امرِ بے جا سمجھے ہوئے تھا؛ یا اپنے خلافِ شان سمجھتا اور جانتا تھا۔ اور اِس کے علاوہ یہ معنی بھی پیدا ہوتے ہیں کہ اِس کے دل میں معشوق کی بے اعتنائی و تغافل کے شکوے بھرے ہوئے ہیں مگر اِس کے ذرا بات کر لینے سے اب امید التفات پیدا ہوگئی ہے اور اِن شکووں کو اِس خیال سے ظاہر نہیں کرتا کہ کہیں خفا نہ ہو جائے۔ اِس آخری معنی پر لفظِ ''غضب'' نے دلالت کی۔ اس لفظ سے بوے شکایت آتی ہے اور اِس کے دل کے پُرشکوہ ہونے کا حال کھلتا ہے''۔

اِسی غزل کا ایک شعر ہے:

اے ترا غمزہ، ایک قلم انگیز   اے ترا ظلم، سر بسر انداز

اِس میں معنوی طور پر انشائیہ کا جو پہلو پیدا ہو گیا ہے، اِس کی طرف یوں توجّہ دلائی ہے: ''دونوں مصرعوں میں سے منادیٰ محذوف ہے اور فعل بھی، یعنی اے نازنین ترا غمزہ یک قلم انگیز ہے اے ظالم ترا ظلم سر بسر انداز معشوقانہ ہے۔ اِن دونوں جملوں کی صورت خبر کی ہے، مگر شاعر کو قصد انشا ہے، اور منادی کا محذوف ہونا دلیل ہے اِس بات پر کہ خبر نہیں ہے، اِس وجہ سے کہ محلِّ انشا میں منادی کو حذف کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ''اے'' حرفِ ندا ہے اور ندا، انشا ہے، اِس سبب سے اس کا استعمال انشا ہی میں ہوتا ہے اِس صورت سے کہ منادی محذوف ہو''۔

انشا اور خبر کے فرق کی طرف ایک اور شعر کے ذیل میں اِس طرح متوجّہ کیا ہے:

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں   سوزِ غم ہاے نہانی اور ہے

''کہاں'' کے بدلے ''نہیں'' کا لفظ بھی آسکتا تھا، مگر اِس صورت میں جملہ خبر یہ ہوتا اور استفہامِ انکاری نے انشائیہ کر دیا اور انشائیہ خبر سے بہتر ہے''۔

مرزا صاحب کا مشہور شعر ہے:

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا   تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

اِس شعر میں ''دیکھنا''، جس مفہوم میں آیا ہے اور دوسرے مصرعے میں لفظ ''جو'' کی جو حیثیت ہے اِس کے متعلّق لکھتے ہیں: ''عبارت تو یہ ہے کہ وہاں کہیں غالبؔ اگر مل جائے تو دیکھنا، اور مطلب یہ ہے کہ خیال

رکھنا شاید غالبؔ وہاں کہیں مل جائے۔ یہ مطلب اِس عبارت سے ''جو'' کے سبب سے نکلتا، ''جو'' کی لفظ نے جملے کو شرطیہ کر دیا۔ اور شرط مقصود نہیں، اِس لیے کہ شرط سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ اگر غالبؔ کہیں ملے تو دیکھنا، حالاں کہ جو ملے، اِس کا نہ دیکھنا کیا معنی۔ غرض کہ شرط یہاں کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اِس جملے کی صورت شرط کی ہے، مگر قصد شرط نہیں ہے اور ''جو'' یا ''اگر'' اِس محاورے میں زائد ہوا کرتا ہے، یعنی مقصود یہی ہوا کرتا ہے کہ دیکھنا، یعنی خیال رکھنا شاید فلاں شخص کہیں مل جائے۔ لیکن محاورہ یوں ہی جاری ہے کہ اِس معنی کو جملہ شرطیہ کی صورت میں ادا کرتے ہیں جیسا کہ مصنّف نے کیا ہے اور یہ مسئلہ نحوِ اردو کے نوادر میں سے ہے''۔

غالبؔ کے ایک نہایت مشہور اور اِسی قدر غیر پیچیدہ شعر میں جو نکات پنہاں ہیں، اِن کا بیان دیکھیے۔ سادہ سے شعر میں جو خوبیاں پنہاں ہیں، اِن کا تجزیہ وجوہِ بلاغت کی روشنی میں کس عمدگی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ایسی تشریحات دراصل قاری کے ذہن کی تربیت کرتی ہیں اور نظر میں وہ روشنی پیدا کرتی ہیں جس سے وہ ایسے دوسرے مقامات پر تفہیم محاسن شعر کا حق ادا کر سکتا ہے۔ شعر یہ ہے:

غالبؔ! ترا احوال سنا دیں گے ہم ان کو
وہ سن کے بلا لیں، یہ اجارا نہیں کرتے

لکھتے ہیں: ''شعر تو بہت صاف ہے، لیکن اِس کے وجوہِ بلاغت بہت دقیق ہیں۔ بیچ والوں کا یہ کہنا کہ ''سنا دیں گے ہم اِن کو'' اِس کے معنی محاورے کی رو سے یہ ہیں کہ کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی موقعے پر ان کے مزاج کو دیکھ کر باتوں باتوں میں یا ہنسی ہنسی میں ترا حال اِن کے گوش گزار کر دیں گے اتنا ذمہ ہم کرتے ہیں، یعنی صاف صاف کہنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ غرض کہ یہ سب معانی اِس لفظ سے مترشح ہیں، اِس وجہ سے کہ اِس کا موقع استعمال یہی ہے اور بالالتزام اِس سے معشوق کا غرور اور تمکنت اور رعب و نازک مزاجی اور خود بینی اور خود رائی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ فرض کرو اگر مصنّف نے یوں کہا ہوتا کہ ''کہہ دیں گے ہم اِن سے'' تو اکثر اِن معانی میں سے فوت ہو گئے ہوتے۔

اور یہ کہنا کہ ''اجارا نہیں کرتے'' اِس کے کہنے کا موقع جب ہی ہوتا ہے جب کوئی نہایت مُصر ہو... غرض کہ اِس فقرے سے عاشق کے اصرار بے تابانہ کی تصویر کھینچی ہے۔ ایک تو کلام کا کثیر المعانی ہی ہونا وجوہِ بلاغت میں سے بڑی وجہ ہے، پھر اِس پر ترقّی یہ کہ ادھر معشوق کی تمکنت و ناز، ادھر عاشق کی

بےتابی واصرار کی دونوں تصویریں بھی اسی شعر میں جھلکتی دکھا رہی ہیں''۔

مرزا صاحب کے جن اشعار میں اندازِ بیان کی پیچیدگی نہیں بل کہ طرزِ ادا بہت سادہ ہے، اِن سے پڑھنے والے کی نظر اکثر سرسری طور پر گزر جاتی ہے۔اور ایسے مقامات پر بھی نہیں رکتی جہاں وجوہِ بلاغت نے کوئی خاص بات پیدا کی ہے۔ طباطبائی کی ایسی تشریحات کی یہ بڑی خوبی ہے کہ اِن کو پڑھ کر قاری کی ایک طرح سے ذہنی ترتیب ہوتی ہے۔اور نظر میں یہ طاقت پیدا ہوتی ہے کہ وہ ایسے بلیغ نکات کو دریافت کر سکے اور شعر میں بیان و مفہوم کا جو حسن اِن کی بدولت پیدا ہوا ہو، اسے معلوم کر سکے۔

مولانا طباطبائی نے بہت سے اشعار کی تشریح کا یہ انداز بھی اختیار کیا ہے کہ تفصیل سے صرفِ نظر کو رَوا رکھا ہے۔صرف دو تین جملوں میں اس خاص پہلو کی طرف متوجہ کر دیا ہے جس کی طرف نظر کرنے سے شعر کا مفہوم اور بیان کا حسن، دونوں بہ یک وقت سامنے آ جاتے ہیں۔ میں اِس کی بس ایک مثال پیش کروں گا۔غالبؔ کا معروف شعر ہے:

ملنا ترا اگر نہیں آساں، تو سہل ہے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

اِس کے ذیل میں یہ نہایت مختصر لیکن نہایت بلیغ عبارت لکھی ہے: ''اِسی شے کے لیے آسان ہونا اور دشوار ہونا کہتے ہیں جو ممکن الوقوع ہو۔لیکن جو آسان بھی نہ ہو اور دشوار بھی نہ ہو، وہ ممتنع اور ناممکن الوقوع ہے''۔مطلب شعر کا بس اتنا ہے کہ ترا ملنا ناممکن ہے۔مگر اِس کو جس انداز میں کہا گیا ہے، وہ بے مثال ہے اور مولانا نظم نے اِسی ایک خاص بات کی طرف اِس طرح اشارہ کر دیا ہے کہ حسنِ بیان کی پوری کیفیت سامنے آ جاتی ہے۔

زبان اور بیان کے نکات کے ساتھ ساتھ، قواعدِ زبان اور قواعدِ شاعری سے متعلق بھی جگہ جگہ حوالے ملتے ہیں اور ایسے مقامات بھی قاری کی معلومات میں بہت کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ مثلاً میری معلومات کی حد تک سب سے پہلے مولانا نظم ہی نے غالبؔ کی اِس معروف رباعی کے متعلق لکھا تھا کہ اِس کا دوسرا مصرع بحر سے خارج ہے:

دکھ جی کے پسند ہوگیا ہے غالبؔ دل رک رک کر بند ہوگیا ہے غالبؔ
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں جینا سوگند ہوگیا ہے غالبؔ

غالبؔ کے اِس مصرعے میں ''کافر'' نظم ہوا ہے: ''آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں'' اِس پر مفصّل

بحث کی گئی ہے، اسے درست بتایا گیا ہے، لیکن یہ بھی صراحت کردی گئی ہے کہ: ''یہ بھی خیال نہ کرنا چاہیے کہ ضرورت قافیہ کے لیے مکسور کو مفتوح کرلینا درست ہوگا، بل کہ یہی الفاظ مخصوص سمجھنا چاہیے اِس حکم کے لیے''۔

غالبؔ کے ایک مصرعے میں ''تیوری'' بر وزن فاعلن آیا ہے، اِس کے متعلّق لکھتے ہیں کہ ''لکھنؤ اور دہلی کی زبان میں جو بعض الفاظ میں فرق ہے، اِس میں سے ''تیوری'' کا لفظ بھی ہے۔ مصنّف نے زبان دہلی کے موافق اسے موزوں کیا ہے اور لکھنؤ میں یؔ کو نہیں ظاہر کرتے۔ یعنی دہلی میں ''تیوری'' بروزن فاعلن ہے اور لکھنؤ کی زبان میں فعلن کی وزن پر ہے''۔

غالبؔ کی مشہور غزل کا مطلع ہے:

دہر میں نقش وفا وجہِ تسلی نہ ہوا　　ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

اِس میں یہ شعر بھی ہے:

دل گذر گاہ خیال مے و ساغر ہی سہی　　گر نفس جادۂ سر منزلِ تقوی نہ ہوا

اور مقطع یہ ہے:

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ　　ناتوانی سے حریف دمِ عیسیٰ نہ ہوا

اِس کے ذیل میں اِس قاعدے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ: ''قافیہ تقوی میں فارسی والوں کا اتباع کیا ہے، کہ وہ لوگ عربی کے جس جس کلمے میں یؔ دیکھتے ہیں، اِس کو کبھی الفؔ اور کبھی یؔ کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ تمنّی و تمنّا، تجلّی و تجلّا، تسلّی و تسلّا، ہیولیٰ و ہیولا، دینی و دنیا؛ بہ کثرت اِن کے کلام میں ہے''۔

مولانا نظم دبستانِ لکھنؤ سے تعلّق رکھتے ہیں، اِس نسبت کی کرشمہ کاریاں بھی اِس شرح میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ اِس شرح کے پڑھنے کے لیے لازم ہے کہ اس پہلو پر بھی اِس کی نظر رہے۔ مثلاً ''میں عدم سے بھی پرے ہوں، ورنہ غافل، بارہا'' غالبؔ کے اِس مصرعے میں ''پرے'' پر مفصّل گفتگو کی ہے۔ اِسی طرح ''تلک'' کے ترک واختیار پر بھی بحث ملتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں، غالبؔ کا یہ شعر زیرِ بحث ہے:

عشق و مزدوری عشرت گہِ خسرو، کیا خوب　　ہم کو تسلیم نکونامی فرہاد نہیں

''ہم کو تسلیم نہیں، یعنی ہم کو مسلم نہیں۔ عربی کے مصدر اکثر اردو میں اِس طرح لوگ استعمال کرتے ہیں۔

جیسے کہتے ہیں مطلب حصول ہوا، یعنی حاصل ہوا۔ راز افشا ہوا یعنی فاش ہوا۔ لیکن جو لوگ عربی داں ہیں، وہ ایسی عبارت سے احتراز کرتے ہیں اور محاورہ بگاڑ لیتے ہیں''۔ آخری جملہ توجہ طلب ہے جس میں اِس پر زور دیا گیا ہے کہ اردو کا محاورہ اصل چیز ہے، اِس کے مقابلے میں عربی کی رعایت نہیں کی جانا چاہیے۔

مرزا صاحب کا نہایت معروف شعر ہے:

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو　　توڑا جو تو نے آئنہ، تمثال دار تھا

پہلے مصرعے کے متعلّق لکھا ہے: ''یک شہر آرزو'' میں ویسی ہی ترکیب ہے جیسی یک بیاباں ماندگی اور یک قدم وحشت میں ہے''۔ یعنی مرزا صاحب کے ایک خاص پیرایۂ گفتار کو ذہن نشین کیا گیا ہے (ورنہ بہت سے لوگ اسے ''شہر آرزو'' پڑھتے ہیں)۔ اِس سے پہلے ''نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا'' کے ذیل میں اِس طرح تشریح کی ہے: یک بیاباں ماندگی کہہ کر، ماندگی کی مقدار بیان کی ہے۔ گویا بیاباں کو پیمانہ اِس کا فرض کیا ہے''۔

[غالب نامہ، جولائی ۱۹۹۱ء، جلد: ۱۲، شمارہ: ۲، ص ۵۱ تا ۵۸]

○○○

توضیحی اشاریۂ غالب نامہ

(ابتدا سے جولائی ۱۹۹۳ء تک)

(پیش لفظ)

ایک صاحب قرۃ العین حیدر کے ناول آخرِ شب کے ہم سفر پر اظہارِ خیال کر رہے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اِس کے آخری حصّے میں کچھ بکھراؤ سا ہے۔ شروع میں واقعات جس طرح باہم پیوست ہیں اور جس طرح حقیقت اور افسانے کا درمیانی فاصلہ سمٹ سا گیا ہے، یہ بات آخری حصے میں نہیں۔ اُنھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ شاید اِس کے مختلف حصّے مختلف وقفوں میں لکھے گئے ہیں اور آخری حصّہ طویل وقفے کے بعد لکھا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ اِس سلسلے میں مجھے تو کچھ معلوم نہیں، لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ یہ ناول پہلے پہل رسالہ گفتگو (بمبئی) میں چھپا تھا۔ اب میں یقین کے ساتھ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ کتنی قسطوں میں شائع ہوا تھا، مگر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں نے دو قسطیں پڑھیں تھیں اور یہ دوسری قسط آخری قسط نہیں تھی۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ لکھا بھی گیا تھا انھی قسطوں کے حساب سے یا اِس کا مکمل مسودہ بھی ج دیا گیا تھا۔

اُنھوں نے پوچھا یہ کب کی بات ہے۔ اس سوال کا جواب میں نہیں دے سکا، یوں کہ مجھے سنہ یاد نہیں تھا۔ اُنھوں نے پوچھا کہ گفتگو کے سب شمارے یہاں ملیں گے؟ میں نے کہا کہ یہ مجھے معلوم نہیں؛ لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس رسالے کے پچھلے شمارے دہلی کی کسی نہ کسی لائبریری میں ضرور مل جائیں گے۔ سردار جعفری کا یہ رسالہ خاصا وقیع مجلّہ تھا اور اِس کے شمارے کہیں نہ کہیں ضرور محفوظ ہوں گے۔

کیسے کیسے علمی، ادبی اور تحقیقی رسالے شائع ہوتے تھے اور اب بھی ہندستان اور پاکستان میں یہ روایت ختم نہیں ہو سکی ہے، اِن رسالوں کے پچھلے شماروں میں بہت سے نہایت درجہ اہم مضامین محفوظ ہیں۔ یہ سب رسالے آسانی سے ایک جگہ ملتے نہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ تحقیقی کام کرنے والوں کو یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ اِس موضوع پر اِس سے پہلے کیا لکھا جا چکا ہے۔ یہ لاعلمی درحقیقت بڑی محرومی ہے اور اس سے علمی کاموں کا بڑا نقصان ہوتا ہے۔ اگر یہ معلوم ہو سکے کہ فلاں رسالے کے فلاں شمارے میں یہ مضمون شائع ہو چکا ہے، تو اُس سے بہت مدد ملے گی اور اُس خاص شمارے سے استفادے کی صورت نکالی جا سکے گی۔

فاروق انصاری، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں۔ اِس یونی ورسٹی میں تعلیم کا جو نظام اور انداز ہے، یہ اُس کی خوبی ہے کہ اور مضامین کی تو خیر بات ہی اور ہے، اُردو میں بھی اچھے طلبہ کے ذہن نئے خیالات کی روشنی سے محروم نہیں رہتے اور وہ زندگی اور ادب کے نئے مطالبات کی اہمیت سے بے خبر نہیں رہتے۔ ہاں بے قدرِ توفیق اور بہ قدرِ ظرف کا اصول یہاں بھی کارفرما رہتا ہے۔ فاروق صاحب نے اب سے پہلے دہلی اُردو اکیڈمی کے رسالے ایوانِ اُردو کا اشاریہ بنایا تھا، جو کتابی صورت میں چھپ چکا ہے۔ وہ نقشِ اوّل تھا، مگر اُسی سے اُن کی صلاحیتِ اشاریہ سازی کا اندازہ ہوتا تھا۔ اب انھوں نے غالب انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کے علمی مجلّے غالب نامہ کا اشاریہ مرتب کیا ہے۔ اس رسالے میں غالبؔ اور عہدِ غالبؔ پر اہم مقالات شائع ہوئے ہیں۔ اِسی کے ساتھ اصولِ تحقیق، اصولِ تدوین اور اُردو اور فارسی زبان و ادب سے متعلق بھی قابلِ ذکر مضامین چھپتے رہے ہیں۔ اِن موضوعات پر کام کرنے والوں کے لیے یہ سارا سرمایہ بہت کام کا ہے۔ یہ رسالہ عام پسند نہیں، اِس لیے ہر جگہ نہیں پہنچ پاتا اور اِس کے مندرجات سے بہت سے کام کرنے والے بے خبر رہتے ہیں۔ اِس لحاظ سے غالب نامے کے اشاریے کی خاص اہمیت ہے۔

میں نے اس اشاریے کو دیکھا ہے اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مرتب نے اِس کام کو دل لگا کر اور نظر جما کر کیا ہے۔ انھوں نے وضاحتی اشاریہ بنایا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وضاحتی سطریں زیادہ نہیں؛ لیکن جو کچھ بھی لکھا گیا ہے، اُس سے مقالات کے مندرجات کا ایک ہلکا سا عکس سامنے آ جاتا ہے۔ دو ضمنی اشاریے بھی شامل کیے گئے ہیں، اور اِن سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔

میرا جی چاہتا ہے کہ فاروق صاحب اس سلسلے کو جاری رکھیں اور بعض ایسے پُرانے رسالوں کا اشاریہ تیار کریں جن کی جلدوں میں اہم ترین مقالات محفوظ ہیں اور جن سے تحقیقی کام کرنے والے عام طور پر واقف نہیں۔ اُنھوں نے جس لگن اور تعلقِ خاطر کے ساتھ ایوانِ اُردو کا اشاریہ بنایا تھا اور اب جس سلیقے کے ساتھ غالب نامے کا اشاریہ مرتب کیا ہے، اس کی بنا پر بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اشاریہ سازی کو ایک خاص موضوع کے طور پر اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ عرض کر دوں کہ اچھا اشاریہ بنانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

یہ کام جو بہ ظاہر معمولی درجے کا معلوم ہوتا ہے، خاص صلاحیت کا طلب گار ہوتا ہے اور بہت محنت چاہتا ہے اور ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جو ان دونوں کا حق ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ فاروق صاحب کا یہ دوسرا کام ہے۔ اگر اُن کے قلم کی سیاہی خشک نہ ہوئی اور دل لگا کر کام کرنے کا جذبہ مدّھم نہ ہوا تو وہ ایسا اشاریہ بھی تیار کر سکیں گے جسے معیار ساز کہا جا سکے۔

۵/ مارچ ۱۹۹۴ء

رشید حسن خاں

(پیش لفظ توضیحی اشاریہ غالب نامہ، فاروق انصاری، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۷ تا ۹)

ooo



RASHEED HASAN KHAN
KI
GHALIB SHANASI

EDITED BY : IBRAHIM AFSAR

رشید حسن خاں تحقیق و تدوین اور اردو املا پر دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ غالبیات سے بھی خاص شغف رکھتے تھے۔ املاے سے متعلق ان کے کارناموں کی پذیرائی ہوئی۔ غالب شناسی میں خود کو انھیں حوالوں سے متعارف کرایا البتہ ان کی تحقیقی و تدوینی صلاحیتوں کا شہرہ زیادہ رہا۔ غالب سے متعلق انشاے غالب اور املاے غالب کو اسی تناظر میں دیکھا گیا شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے جیتے جی غالب شناس کے طور ان کے کارناموں کا اس طرح اعتراف نہیں کیا گیا جس کے کہ وہ مستحق تھے۔

ابتدائی ادبی زندگی سے ہی رشید حسن خاں کو غالب کے مطالعہ سے دلچسپی رہی ہے۔ ان کی یہ خواہش رہی کہ غالب کے کارناموں کو کمال و جمال کے ساتھ سامنے لایا جائے۔ غالب سے متعلق ان کا پہلا اور یادگار کارنامہ دستنبو کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے بعد ان کی دیگر تحریریں۔ یادگار غالب کی از سر تدوین ان کے پیش نظر تھی جس کا ابتدائی خاکہ انھوں نے ایک مضمون میں پیش کیا تھا۔ خاں صاحب کی بکھری ہوئی ان مختلف تحریروں کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے جس سے ان تحریروں کی وقعت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر ابراہیم افسر نوجوان محقق ہیں۔ ان کی محنت اور لگن قابل رشک ہے۔ انھوں نے رشید حسن خاں کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا ہے۔ خاں صاحب سے متعلق ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ امید ہے کہ ان کے ادبی و تحقیقی کارناموں کا سلسلہ جاری رہے گا۔

عمیر منظر

لکھنؤ

ISBN 935406068-4

9789354060687